مضامین شرر

ادب و تحقیق مسائل

مصنفہ

مولینا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر مدظلہ

فہرست مضامین شرر

جلد چہارم

ادب و تحقیق مسائل

تمت بالخیر

مضامین شرر۔ جلد چہارم

ادب وتحقیق مسائل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فلسفۂ تصوف اور اسلام

اگرچہ دُنیا اپنی رفتار ترقی مین سابق کے بہ نسبت بہت آگے نکل آئی مگر اس وقت تک اس امر کا پتہ نہ لگا کہ انسان کی کمالی حالت کا منتہا کس مقام پر ہے۔ مختلف فلسفیون کے قائم کیے ہوے اصول پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد مختلف مذاہب کے اصول کا انداز دیکھیے تو طبیعت ایک مخمصہ مین پڑ جاتی ہے۔ شاید اسی لیے انبیان مذہب کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہوگا کہ اُن عقلی نازک مباحث سے کم تعلق رکھنا چاہیے جو انسان کے خیالات پر کوئی نہ کوئی جدید اثر ڈال دیا کرتے ہیں۔ اگرچہ ایک تقلیدی طرز پر اس عہد سے پیشتر کے علما بھی فلسفیانہ مباحث پر نظر ڈالا کرتے تھے مگر تعلیم کے لیے جو طریقہ مغربی یورپ مین سررشتۂ تعلیم نے ایجاد کیا ہے اُس کا یہ لازمی اور علمی اثر ہے کہ انسان اپنے عالم خیال مین بالکل آزاد ہو کے مذہب اور فلسفے پر غائر نظر ڈالتا ہے اور دونون کے درمیان مین ایک عمدہ فیصلہ کرنے والا بن جاتا ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ بہ نسبت عربی تعلیم کے انگریزی تعلیم نے

زیادہ دہریے پیدا کیے۔ عربی کورس میں فلسفہ و منطق کی کتابیں انگریزی سے ز
ہیں مگر پھر بھی اُس سے طبیعت پر اتنا اثر نہیں پڑتا۔ یہ ہم نہیں کہتے کہ عربی
سے کوئی دہریہ نہیں ہوا۔ نہیں ضرور ہوئے۔ مگر یہ اندھیر نہیں ہو گیا کہ ایک
سے گویا دُنیا میں مذہب کی واجبی اور ضروری حکومت اُٹھتی جاتی ہے۔

اگرچہ ہم مذہب کے احکام کو اعتقاداً ضرور مانتے ہیں مگر ہم نے فلسفے
طرف سے آنکھیں بند بھی نہیں کر لی ہیں۔ ہم خود بھی پسند کرتے ہیں کہ فلسفیا
اصول کا مذہب سے مقابلہ کیا جائے۔ لیکن مذہب کی طرف توجہ کرنے سے
ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود فلسفہ کے دو مختلف اور متضاد فریقوں کا جھگڑا
دیا جائے۔ اس لیے کہ جب تک اُن دونوں کے مباحث طے نہ کر دیے جائیں
میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ مذہب کے مقابل میں لا کے قائم کیا جا
متقدمین سے متاخرین تک اہلِ فلسفہ کے دو گروہ رہے۔ ایک وہ لوگ جو نظ
عالم کو معقولی استدلالات کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو نتائج عقلی
چھوڑ کے صرف روحانیات کی طرف جھکتے ہیں۔ پہلوں کو عربی فلسفے کی اصطلا
میں مشائین کا خطاب دیا گیا ہے اور پچھلے اشراقیین کہلاتے ہیں۔ یا یوں
جائے کہ فلسفۂ مادی اور تصوف۔ اور اسی نے اسلام میں آ کے دو اصول د
پیدا کر دیے؛ شریعت اور طریقت۔

بے شک اس امر کا تصفیہ ہو جانا ضروری ہے کہ آیا مشائین کی پیروی کیجا
یا اشراقیین کی؟ پہلے فرقے والے تو خیر اسکے قائل ہیں کہ اُنکے اصول سے
کی جائے۔ اس لیے کہ وہ استدلال کے عمدہ طریقوں سے کام لے کے کسی ا
شخص کو سمجھا دینے کی کوشش کرتے ہیں جو سمجھنا چاہتا ہو۔ مگر اشراقیین یا صوفیہ
ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب تک سالہا سال کوشش کر کے اُن کے اشراق نو
اور مکاشفات سے اطلاع نہ حاصل کیجیے اُس وقت تک ممکن نہیں کہ آپ سمجھ سکیں
وہ سمجھا سکیں۔ جن لوگوں نے اتنی ہی بات پر صوفیہ کے دعووں کو باطل قرار دیا
اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے غلطی کی۔ اس لیے کہ مادیین اور صوفیہ
دعوے ہی بتا رہے ہیں کہ پہلوں کا اصول قال ہے اور پچھلوں کا مدار صرف حال

تصوف کیا چیز ہے؟ جن لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہو کہ صوفیہ کی بڑی بڑی
بوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہی تصوف ہے تو اصل یہ ہے کہ وہ ایک عظیم الشان
طی میں مبتلا ہیں۔ تصوف صرف ان اثروں کا نام ہے جو واقف کار صوفیہ کی
ائی ہوئی ریاضتوں سے دل پر پڑ جاتے ہیں جنھیں وجدانیات کہنا چاہیے انسان
ن سے لطف یا بدمزگی حاصل کر لیتا ہے۔ مگر زبان سے نہیں ادا کر سکتا کہ اصل
ن کیا چیز ہیں۔ جیسے فوارہ و سُرور کہ ان کی کیفیت کسی سے پوچھیے تو بیان نہیں
سکتا مگر ان دل ہی دل میں لطف اُٹھاتا ہے۔ لہذا جب تک کوئی اُن
یتوں سے نہ واقف ہوا ہو جو تصوف کی عملی ریاضتوں سے دل میں پیدا ہوتی
یں ہرگز اس قابل نہیں ہو سکتا کہ اہلِ مادہ کے ظاہری استدلالات کو اُن کے
خلاف یکطرفہ ڈگری دیدے۔ ہم زمانے میں اکثر لوگوں کو اس غلطی میں مبتلا
تے ہیں۔

آج کل ایک ہمارا سا شخص اگر اوپر کی سطح سے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ
تصوف کا مدار مجرد خیالات پر ہے اور اس کے مقابل میں دوسرا فلسفہ خیالات
ں کا پابند نہیں ہے۔ لیکن یہ بحث بھی چل سکتی ہے تو ایک اور امر کا فیصلہ کر لینے کے
دیجیے۔ اس لیے کہ وہ فلسفہ جو تصوف کے مقابل میں ہے اُس میں بھی بہت بڑے
بڑے تغیرات ہو گئے۔ ایک قدیم اور اگلے زمانے کا فلسفہ تھا جس کی ترتیب د
اسلام میں زیادہ دخل ارسطو کو تھا۔ اور دوسرا جدید مغربی فلسفہ ہے جسکے اصول کو
ڈیکارٹ، بیکن وغیرہ متاخرین حکماے یورپ نے قائم کیا ہے۔ پہلا یونانی فلسفہ جس کا
زیادہ نہیں کل حصہ عربی میں موجود ہے بلکہ اسلامی علماء نے جس کو اُسکی یونانی حالت
کے مقابلے میں بہت کچھ ترقی دلا دی اُس کا مبنی بھی صرف خیالات ہی پر تھا۔
تصوف سے اگر فرق تھا تو اس قدر کہ مقلدین ارسطو عقل کے عام محاکمات پر مسائل
کی بنا قائم کرتے تھے۔ اور ہر طالب علم کو اُس کی عقل کے موافق تمام اصول حکمت
پر اطمینان دلا دیا کرتے تھے۔ بخلاف اس کے اہلِ تصوف ریاضات کے ذریعوں
اپنے خیالات پر خلوت میں بیٹھ بیٹھ کے غور کرتے تھے اور اُن سے جو کیفیتیں
ل پر طاری ہوا کرتی تھیں اُن پر اپنے فلسفے کی جو اُن کا مذہب تھا بنا قائم

کرتے تھے۔ لیکن اس پچھلے عہد میں صوفیہ تو اپنی اُسی حالت اور اُنھیں اصول پر
قائم ہیں مگر اہلِ مادہ جنھوں نے پہلے ارسطو کے فلسفے کو ترمیم و تنسیخ کر کے نئے
اصولوں پر قائم کر لیا ہے وہ گذشتہ اور موجودہ عربی مقلدینِ ارسطو کی طرح صرف
زبانی جمع خرچ کے پابند نہیں ہیں بلکہ اُنھوں نے دنیا کے فنونِ پیشہ وری اور تمام
علمی مسائل کو سمیٹ کے اپنا بنا لیا ہے۔ وہ عقلی طور پر بحث کرتے ہیں۔ مگر اُن کے
مباحث کا موضوع صرف خیال نہیں رہتا بلکہ دُنیا پر اس حیثیت سے نظر ڈالتے
ہیں کہ اُس کی ہر چیز سے کون سا علمی مسئلہ نکل سکتا ہے۔ اور کون بات پیدا ہو سکتی
ہے جو دنیا کے لیے بکار آمد ہو۔ یہ کلیں اور یہ تمام آلات اُس عہد قدیم ہی میں پیدا
ہو کے مروج ہو جاتے مگر نہ ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن اگلے فلسفیوں نے
اشراقیین کو تو خیر آج تک بحث نہیں مقلدینِ ارسطو نے بھی اپنے خیالات کو
اس جانب متوجہ ہی نہیں کیا۔ ان دنوں اکثر لوگ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ اپنے
گذشتہ لوگوں کی کوئی علمی کارستانی نکال کے زمانے کے سامنے پیش کر کے سُرخرو
بنیں مگر ہم بتائے دیتے ہیں کہ اُنکی یہ جستجو بالکل بیکار ثابت ہوگی۔ اور اگر کوشش
کر کے وہ کوئی ایسی بات نکال کے پیش بھی کر دیں گے تو یہ خوب جان لینا چاہیے
کہ اُسکی ایجاد بحیثیت فلسفہ ہرگز نہ ہوئی ہوگی۔ بلکہ بحیثیت پیشہ یا تجارت کے
کسی کاریگر کا ذہن لڑ گیا ہوگا اور اُس نے کوئی ایسی چیز تیار کر دی ہوگی۔ اُس
زمانے میں اس طرف کسی فلسفی کا خیال متوجہ ہی نہیں ہوا تھا۔ ایسے نتائج
ظاہر ہوتے تو کیونکر؟

خیر اب ہم پھر اس بحث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ تصوف کے مقابل یہ
دونوں قدیم و جدید عقلی فلسفے کیسے ہیں؟ یہ ظاہر ہو گیا کہ اگرچہ غرض متحد نہ تھی
مگر تصوف اور فلسفۂ قدیم دونوں کا مدار صرف خیالات پر تھا۔ لہٰذا ہم کیا کریں
ہمارا نفس ہمیں مجبور کیے دیتا ہے کہ ہم تصوف کو ترجیح دیں۔ اس لیے کہ ایک مسئلے
کے حل کر لینے پر عالمِ خیال میں انسان کو جو مسرت ہو جایا کرتی ہے اُس میں دونوں
شریک ہیں۔ اور تصوف کو اس قدر ترجیح ہے کہ خیالی ریاضتوں سے وہ از قسم
انکشافات بہت سے عمدہ کمالات حاصل کر سکتا ہے۔ بخلاف اُس قدیم فلسفۂ

ارسطو کے جو سوا اسکے کہ انسان اپنے دل ہی میں آپ اپنے اوپر ناز کرے کسی
کے کام آ سکتا نہ اپنے لیے کوئی دنیاوی نفع حاصل کر سکتا ہے۔ رہا دوسرا جدید
فلسفۂ یورپ جس نے بہت کچھ کمالات تھوڑے ہی دنوں میں دکھا دیے۔ دنیا نے
اپنی وسیع مقدار عمر میں اتنی شان و شوکت نہ حاصل کی تھی جتنی اس فلسفے کی
وجہ سے پچھلی دو ایک صدیوں میں حاصل کر لی۔ ہر انسان اُس فلسفے کے ذریعے سے
ایک ممتاز ترقی کر سکتا ہے اور بہت کچھ نفع حاصل کر سکتا ہے اور ثابت کر سکتا ہے
کہ ایک تھوڑی سی محنت سے انسان کس پایے پر پہونچ جاتا ہے اور اُس سے کیسے کیسے
اہم کام ظاہر ہو جایا کرتے ہیں۔ بخلاف تصوف کے کہ اُسکے معتقد جس طرح افلاطون
کے مدرسۂ الٰہیات میں بیٹھ کے مراقبہ کیا کرتے تھے اُسی طرح آج بھی اپنی خانقاہوں
اور کوہستان کی گھاٹیوں میں سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ صوفیہ کو شاید یہ خبر بھی نہ ہوگی
اور فلسفۂ مادی نے عدالت کی کرسیوں پر قبضہ کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ صوفیہ
کے کشف و کرامات اور تمام وہ روحانی خوارق عادات جو تصوف کے ذریعے سے
حاصل ہوا کرتے ہیں سب خلافِ نیچر اور غیر قابلِ اعتبار ہیں۔ بے شک تصوف کو
اس جدید مادی فلسفے کے سامنے دب جانا پڑا۔ اور ہم کو بھی تمام نظامِ عالم
کے دیکھتے موجودہ فلسفے ہی کے حق میں فیصلہ کرنے کی جرأت ہوتی ہے۔ اسکو
سب تسلیم کرتے ہیں کہ تصوف ایک ایسی چیز ہے جسکے اصول کو اگر عقل نہ بھی قبول
کرے تو اُس کے سراپا ذوق جزئی خیالات کو ضرور اور بہت جلد قبول کر لیتی ہے۔
اور یہی وجہ تھی کہ زمانۂ قدیم میں اگرچہ مشائین کا فلسفہ تصوف کی بیخ کنی میں
اپنی پوری قوت صرف کرتا رہا مگر ہرگز کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ اُس عہد کے
علما اگرچہ ہر فن اور ہر قسم کے علوم فلسفیہ میں کمال حاصل کر لیا کرتے تھے مگر اعتقادی
حیثیت سے تصوف اُنکے دعووں پر بالکل حاوی ہو جاتا تھا۔ اور شاید یہی وجہ
ہے کہ تمام وہ مذاہب جن کو حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کے سلسلہ دار پیغمبروں سے
کوئی علاقہ نہیں اور جن کی بنا بہ ظن غالب عقلی فلسفے پر تھی سب کے اصول تصوف ہی
کی زمین پر قائم کیے گئے۔ یہ سب باتیں اس امر کا ثبوت دے رہی ہیں کہ فلسفۂ ارسطو
کو تصوف اور اشراقی فلسفے کے مقابل میں بالکل کامیابی نہ ہو سکی۔ اس عظیم الشان

فلسفے کے خیالات صرف چند مدرسون کی دیوارون کے اندر محدود تھے۔ مسلمانون نے اپنے عہد مین اگرچہ اُس فلسفے کو جہان تک ترقی دلائی کہ خاص مقامات سے نکل کے عام بازارون تک پہونچ گیا۔ مگر پھر بھی اشراق کے دلچسپ اثر نے علما مین جو ذوق تصوف پیدا کیا وہ صرف بحث و مباحثہ کی حیثیت سے نہین رہا بلکہ مذہب کا ایک جزو بن کر اعتقادون مین گھس گیا۔ ہان تصوف کے اس جہانگیر اثر کو اگر مٹایا تو اس جدید فلسفے نے۔ جس نے دکھا دیا کہ ہمارے خیالات تصوف اور نیز قدیم فلسفۂ ارسطو کی طرح صرف دماغ مین چکر کھانے کے لیے نہین ہین بلکہ ان سے اگر غور کیا جائے تو بڑے بڑے نتائج پیدا ہو سکتے ہین۔ اس فلسفے کے حامیون نے یہ دعویٰ ہی نہین کیا بلکہ کر کے دکھا دیا۔ اُنھون نے ثابت کر دیا کہ ہمارے اصول اور ہماری کوششون نے دنیا کو کسی طالب علمانہ بحث مین اٹکائے نہین رکھا بلکہ دنیا کے لیے عمدہ عمدہ کلین قسم قسم کے سامان مہیا کر دیے۔ الغرض یہ ایسے دلفریب دعوے ہین کہ اب دنیا تصوف کی دلخوش کن باتون کو بھول گئی اور بھولتی جاتی ہے اور جدید فلسفہ فلسفۂ قدیم۔ تصوف بلکہ مذہب تک کو مٹا کے اپنا قبضہ کرتا جاتا ہے۔ اور درپردہ اسکے ساتھ ہی ساتھ مذہب کو بھی نقصان پہونچا جاتا ہے۔ تصوف کے حامیون کی بعض پارٹیان قائم ہین اور کوشش کر رہی ہین کہ افلاطونی اصول کو اس جدید فلسفیانہ تہذیب کے دور مین مضرتون سے بچائین۔ مگر موجودہ عصر کے نامور فضلا اور یورپ کے بڑے بڑے فلسفی انکی باتون کو اُسی طرح سنتے ہین جس طرح کوئی سن رسیدہ شخص بچون کی بھولی بھولی باتون کو سنتا ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر یہی طریقۂ تعلیم کچھ دنون اور چلا گیا تو تصوف کو دنیا مین بالکل شکست ہو جائیگی۔ ہمارے مشہور اہل طریقت اپنی خانقاہون مین اور ہندو جوگی کوہستانی نشیبون مین یون ہی بیٹھے رہ جائین گے اور زمانہ وہ پہلا ورق اُلٹ کے تصوف کو دنیا سے ناپید کر دے گا۔

اب ہمین دیکھنا چاہیے کہ مذہب کیا چیز ہے؟ اگر ہم علمی اصطلاحون سے کام لین تو کہہ سکتے ہین کہ مذہب ایک مزاج کا نام ہے جو فلسفۂ اشراقی و مشائی کے باہمی امتزاج سے پیدا ہو گیا ہے۔ یہ تعریف زیادہ عام نہین ہو سکتی۔ اس لیے

کہ بعض مذہب اپنی اصلی حالت مین صرف تصوف پر قائم کیے گئے ہین۔ مثلاً دینِ عیسوی جسکو سوا اعتقادات کے اور کسی عملی مسئلے سے کسی قسم کا تعلق نہین ہے۔ اسلام نے دنیاوی انتظامون اور احکام معاشرت کو دیگر مذاہب کی بہ نسبت بہت زیادہ لیا۔ لیکن اس پر سب مذہب متفق ہین کہ اصلی چیز اعتقادات ہین جنکو صرف تصوف ہی سے تعلق ہے اور جو اصل مین تصوف ہی ہین۔ لہذا جن بناؤن کے باعث فلسفۂ جدیدہ سے تصوف کو نقصان پہونچ رہا ہے اُنھین بناؤن کے مطابق مذاہب کو بھی ضرر پہونچ رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے اہل مذاہب کو ضرورت ہے کہ لازمی طور پر تصوف کے روحانی مسائل کو سنبھالین ورنہ یہ جدید مادی فلسفہ مذاہب کو جڑ سے اُکھاڑ کے پھینکدے گا۔

شاید یہ جملہ ہم تیز کہہ گئے۔ اس لیے کہ اہل مذاہب کو نہایت ناگوار گذرا ہوگا۔ اُنکے اعتقاد کے مطابق مذہب کی حفاظت کرنے والا خود خدا ہے۔ اور جب خدا نے حفاظت کا وعدہ کر لیا تو ممکن نہین کہ کوئی مخالفانہ کوشش کارگر ہو سکے۔ ہان یہ بے شک صحیح ہے اور ممکن نہین کہ کوئی مذہب کی بیخ کنی کر سکے مگر ہم اتنا ضرور کہین گے کہ اسباب زمانہ دیکھ کے آپ کو اُس کی حفاظت ضرور کرنا چاہیے۔ عیسائی ایک حد تک کوشش کر رہے ہین۔ اگرچہ مذہب اُن کے اصلی وطن سے جلاوطن ہوتا جاتا ہے۔ لیکن جتنی یورپ مین کمی ہوتی ہے اُتنا ہی نقصان وہ یون پورا کر لیتے ہین کہ ایشیا کے دیگر اہل مذاہب کو کسی نہ کسی طرح اپنا ہم خیال بنا لیتے ہین۔ مگر ان دیگر مذاہب کو صاف نظر آ رہا ہے کہ روز بروز نقصان پہونچتا جاتا ہے۔

یہ بڑی غلط کارروائی ہے کہ ایشیا کے مذاہب باہم لڑ لڑ کے اپنی ساری قوت آپس ہی مین تمام کیے دیتے ہین۔ جس کی وجہ سے اُن مین اور ضعف ہوتا جاتا ہے اور تعلیم جو جدید فلسفیانہ خیالات بچپن سے دماغون مین پیدا کرتی ہے وہ سب کو اُڑا کے بخوبی تمام غالب آتے جاتے ہین۔ ایسے وقت مین تمام دنیا کو آپس مین مل کے ایک ایسی کوشش قائم کرنا چاہیے جو اتحاد کے ساتھ اس فلسفے کا زور توڑنے پر کمر باندھے۔ اور یہی کوشش اگر کامیاب ہو سکی تو مذاہب کے بچنے کی امید ہو سکتی ہے۔ ورنہ آیندہ ایک ایسا زمانہ ضرور آ جائے گا جب مذہب کی حفاظت انسانی قوت

کے دائرے سے خارج ہو جائے گی۔

ہم کو بالکل اُمید نہین کہ مذہب اپنی موجودہ حالت سے فلسفے کے حملون کو روک سکین۔ اور جب تک جملہ مذاہب کی متحدہ قوت ایک عام مشن مذکورہ غرض کے لیے اور مندرجۂ بالا اصول پر نہ قائم کرے گی اُسوقت تک ممکن نہین کہ دنیا اُس آفت سے محفوظ رہ سکے جو فلسفے کی صورت مین نمایان ہوئی ہے۔ عیسائی بھی اس خیال سے غافل نہ رہین۔ ان کی کوششین ایشیا مین جو ظاہری ترقی کی صورت دکھا رہی ہین یہ صرف چند روز کے لیے ہے۔ ایشیا بھی اب تھوڑے دنون مین ایشیا نہ رہے گا۔ وہ یورپ ہوتا جاتا ہے۔ اور جو ایشیا یورپ کی صورت اختیار کرے گا وہ عیسائیون کی کوششین بیکار ہوتی جائین گی۔ لہذا ہم تمام مذہبون کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اور درخواست کرتے ہین کہ اب وہ تمام باہمی نزاعون کو چھوڑین اور اُن نوجوانون کی طرف متوجہ ہون جو دہریت کا وعظ کہتے پھرتے ہین۔

اگست ۱۸۹۳ء

سکّہ اسلام مین

یہ امر ابھی واضح طور پر نہین بتایا گیا کہ اسلام مین سکّے کا رواج کیونکر اور کس وقت سے شروع ہوا۔ حالانکہ اسکے جاننے کی بہت کچھ ضرورت ہے۔ عوام مین اسکے متعلق طرح طرح کے خیالات پھیلے ہوے ہیں۔ اور اُن غلط فہمیون کے مٹانے کی بالکل کوشش نہین کی گئی جو شرعی دینار و درہم کے نام سے عوام کے ذہن مین مرتکز ہین۔ ابھی تک اس بات پر یقین کرنے والے کثرت سے موجود ہیں جو چاریاری روپے کو خلفاے راشدین کے عہد کا سکہ تصور کرتے ہین۔ یورپ مین فی الحال یہ مذاق عام ہوگیا ہے کہ قدیم زمانون کے سکّے ہم پہونچا پہونچا کے جمع کیے جاتے ہین۔ ان کوششون کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ خلفاے بنی اُمیہ و عباسیہ و عبیدین مصر کے بعض سکّے ہاتھ آگئے۔ لیکن اس امر پر بغیر تاریخی ثبوت کے یقین نہین کیا جا سکتا کہ اسلام مین سب سے پہلے کس عہد مین ٹکسال قائم ہوئی اور کس ضرورت نے مسلمانون کو اسپر آمادہ کیا۔

اس مین کوئی شک نہین کہ مسلمان فاتحون نے جس وقت ممالک عالم کو زیر و زبر کرنا شروع کیا اُسوقت فتوحات کے خیال اور دُھن مین وہ اس قدر ڈوبے ہوے تھے کہ بہت سی ضروری باتون کی طرف اُن کا خیال بھی نہین گیا۔ اور جب دنیا کا مرقع اُلٹ پلٹ کے اُنھون نے اپنی طرف دیکھا تو سمجھے کہ ہم کس قدر آگے بڑھ آئے ہین اور ہمین کیا کیا کرنا تھا جس کی طرف ہماری توجہ مبذول ہی نہین ہوئی۔ اگرچہ اس بے پروائی کا زیادہ تر باعث اُن کا جوش جہاد تھا۔ مگر عرب کی سادگی اور اُن کی بدویانہ صحرائی زندگی جسکو تمدن سے بہت کم لگاؤ تھا زیادہ تر اسکی مُعین ہوئی۔ انھین اسباب نے جہان اُن سے اور بہت سے امور نظر انداز کرا دیے وہان اُنکو سکّے کی طرف بھی متوجہ نہ ہونے دیا۔

جاہلیت مین عرب کے ایک کونے کو روم سے اور ایک کونے کو ایران سے تعلق تھا۔ ان تعلقات کی وجہ سے عرب کے شہرون مین عموماً ایرانی اور رومی سکّون کا رواج تھا۔ کچھ سکّے ملوک حمیر نے بھی عرب مین ایام جاہلیت مین جاری کیے تھے جو اُنھین رومی و عجمی سکّون مین ملے ہوے کبھی کبھی نظر آ جایا کرتے تھے۔

آنحضرت صلعم کے بعد چارون خلافت ہاے راشدہ گذر گئین۔ جناب امام حسن علیہ السلام نے خلافت سے دست بردار ہو کے امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ معاویہ کا دَور بھی ابتدائی شان و شکوہ دکھا کے آخر ہو گیا۔ یزید کی سلطنت دو ہی دن بہار پیدا کر کے ختم ہوئی۔ مروان خلیفہ ہوا اور مر بھی گیا۔ یہ سب ہو گیا سکّے وہی رومی ایرانی اور حمیری مروج تھے۔

پھر اُن سکّون مین بھی یہ خرابی تھی کہ اس قدر مختلف اوزان اور قیمت کے تھے کہ تجارت و کاروبار اور خصوص بیت المال کا انتظام روز بروز اُلجھتا جاتا تھا۔ مسلمانون کو مفروضۂ زکوٰۃ و صدقات کے ادا کرنے مین دقت لاحق ہوئی تو جناب عمر فاروق کو مجبوراً یہ انتظام کرنا پڑا کہ شرعی اغراض کے واسطے اُن تمام سکّون مین سے ایک خاص سکہ مقرر کر دیا جو قیمت مین سب سے متوسط اور چلن مین سب سے زیادہ مروج تھا۔ لیکن اسپر بھی ٹھیک انتظام نہ ہو سکا اس لیے

؎ دیکھو فتوح البلدان بلاذری۔

؎ دیکھو مقدمۂ ابن خلدون۔

اکثر لوگوں نے کھوٹے سکے بنا بنا کے ملک میں پھیلا دیے جن کی وجہ سے خزانۂ خلافت
کو معمولی نقصان اُٹھانا پڑتا تھا اور مروجہ سکے اُس قیمت سے بدرجہا زیادہ گھٹتے جاتے
تھے جس پر کہ چل رہے تھے۔ ان دقتوں کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے آخر یہ نتیجہ ہوا
کہ عرب میں سکے کی کچھ قیمت نہیں باقی رہی تھی جو کچھ قیمت تھی سونے چاندی کی۔ بلکہ
قریب قریب سونا چاندی ہی وہاں کا سکہ بن گئے تھے۔ اور سونے چاندی ہی کے پرکھنے
پر مروجہ سکوں کی قیمت قائم کی جاتی تھی۔

بعض مورخین لکھتے ہیں کہ انھیں مشکلوں سے عاجز ہو کر عبداللہ بن زبیر کے
چند روزہ عہد خلافت میں انکے بھائی مصعب بن زبیر کے حکم سے حارث بن عبداللہ
بن ابی ربیعہ مخزومی نے ۷۰ھ میں سکے بنانا شروع کر دیے۔ یہ سکے بالکل ایرانی
سکوں کی وضع پر بنائے گئے تھے فرق اتنا تھا کہ اُن پر الفاظ "برکۃ" اور "اللہ"
بڑھا دیے گئے تھے۔ مگر عام مورخین اور کل محققین کو عبداللہ بن زبیر کے عہد میں
سکہ بننے سے انکار ہے۔ حیرت ہے کہ ناسخ التواریخ میں لکھ دیا ہے کہ سنہ ۱۸ھ خلافت
جناب فاروق اعظم میں اسلامی سکے کے درہم و دینار مروج ہوئے جن میں سے بعض
پر "لا الہ الا اللہ" بعض پر "الحمد للہ" بعض پر "قل ہو اللہ احد" اور بعض پر اوپر "اللہ"
اور اُسکے نیچے جناب عمرؓ کا نام منقوش تھا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس بیان کے
صحیح ہونے کا گمان بھی کریں تو کیونکر؟ افسوس ہے کہ ناسخ التواریخ جس قدر مبسوط
لکھی گئی ہے اُسی قدر جمع روایات میں بے احتیاطی سے کام لیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ
کے عہد میں سکہ بننا بالکل بے اصل ہے۔ اگر کسی قدر اسکی اصلیت ہو سکتی ہے تو
اس قدر کہ اُنکے عہد سعادت عہد میں ایک کسرویہ سکہ مروج تھا جس کا نام آخر
میں بغلیہ ہو گیا۔ بغلیہ اس لیے کہ اس پر ایک جانب خچر کا سر بنا تھا اور دوسری
طرف کسرے کی تصویر مع اُسکے تخت کے تھی۔ اور تخت کے نیچے لکھا تھا "نوش خور"
(یعنی خوشی کے ساتھ نوش کر) اس بیان کی نسبت اول تو یہی نہیں کہا جا سکتا
کہ کہاں تک قابل اعتبار ہے اور اگر مان بھی لیا جائے تو اسکی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے

عہ دیکھو فتوح البلدان۔

عہ دیکھو حیوۃ الحیوان مصنفہ دمیری شافعی۔

کہ جناب فاروق کے حکم سے بنا۔ پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس پر خچر کی صورت
کیوں بنائی گئی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بغلیہ نام کا ایک سکہ خلافت راشدہ کے
زمانے سے بنی امیہ کے دور تک دنیائے اسلام میں مروج تھا۔ جس بات پر مورخین
کو اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں ترویج سکہ کے فخر کا مستحق عبدالملک بن مروان ہے
جو بنی امیہ میں سب سے زیادہ نامور خلیفہ اور دولت مروانی کا دوسرا بانی ہے۔

ترویج سکہ کا تفصیلی حال ہارون رشید نے اپنے دربار میں ایک موقع پر
کسائی نحوی سے بیان کیا تھا جو بمقابلہ دیگر بیانوں کے زیادہ واضح ہے۔ وجہ یہ
ہوئی کہ ایک مرتبہ مخصوصین دربار پر تقسیم کرنے کے لیے رشید کے سامنے توڑے لا کے
رکھے گئے۔ ایک تھیلی پھٹی تھی اُس میں سے ایک دینار نکل کے باہر گر پڑا۔ اُسکے
نقش خوب اُبھرے ہوئے تھے اور حروف نہایت واضح طور پر پڑھے جا سکتے تھے۔
رشید نے اُس دینار کو جھک کے اُٹھا لیا اور اُلٹ پلٹ کے اُسکے نقوش کو حیرت
سے دیکھنے لگا۔ و دیکھتے دیکھتے کسائی کی طرف جو حاضر دربار تھے متوجہ ہو کے کہا
"جانتے ہو یہ کس عہد میں بنے تھے؟" کسائی نے عرض کیا "جی ہاں عبدالملک
بن مروان کے عہد میں"۔ رشید نے پوچھا "اور یہ بھی جانتے ہو کہ انکے بننے کا سبب
کیا تھا؟" کسائی نے کہا "نہیں مجھے اس کی خبر نہیں"۔ تب رشید نے یہ واقعہ
بیان کیا کہ درہم و دینار عبدالملک کے عہد تک نہیں بنائے گئے تھے۔ عرب میں
ایرانی درہموں اور رومی دیناروں کا رواج تھا۔ عبدالملک نے جو ایک نیک
خصال قائم کر دی اسکی وجہ یہ ہوئی کہ فرامین وغیرہ لکھنے میں جو کاغذ کام آتے
تھے وہ مصر میں بنائے جاتے تھے (یہ گویا ایک قسم کے فارم تھے جنھیں بنا کے لاتے
تھے) بنانے والے حسب رواج قدیم اُن کی پیشانی پر بطور نشان تجارت کے رومی
زبان میں کچھ الفاظ لکھ دیا کرتے تھے۔ یہی الفاظ مصر کے بنے ہوئے حریر کے تھانوں اور
ظروف وغیرہ پر بھی لکھے ہوتے تھے۔ اسلام میں بعد فتح مصر کبھی ان الفاظ کی طرف
توجہ نہیں کی گئی اور نہ یہ پوچھا گیا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ عبدالملک ایک متجسس
طبیعت کا آدمی تھا۔ فرمان کے ان فارموں میں سے اتفاقاً ایک اسکی نظر سے گزرا

عہ دیکھو حیوۃ الحیوان۔

تو اس نے اپنے مترجم سے پوچھا یہ کیا لکھا ہے؟ مترجم نے کہا "باپ بیٹا روح القدس" اتنا سنتے ہی عبدالملک سناٹے میں آگیا۔ اور پھر بولا "یہ کلمہ کفر اب تک مروج چلا آیا۔ اور حیرت ہے کہ کسی کا خیال اسکی طرف نہ گیا"۔ اسکے بعد اُس نے فوراً اپنے بھائی عبدالعزیز بن مروان کو جو والی مصر تھا لکھا "مصر کے تمام کاریگروں کو حکم دیدیا جائے کہ آیندہ سے تمام قارموں کی پیشانیوں۔ تھانوں اور ظروف پر ان الفاظ کی جگہ کلمۂ توحید "اشہد ان لا الہ الا ہو" لکھا کریں۔ اور منادی کردی جائے کہ جو کوئی اسکے خلاف کرے گا سخت سزا پائے گا"۔ اس حکم پر فوراً عمل درآمد شروع ہوگیا۔ اس عہد کے بنے ہوے بعض قارم قیصر روم (جسٹینین دوم) کی نظر سے گذرے تو اُسے نہایت ناگوار ہوا۔ قیصر نے بہت سے قیمتی ہدایا کے ساتھ عبدالملک کے دربار میں ایک سفارت بھیجی اور خط میں یہ مضمون لکھا "ان الفاظ کا رواج تمام گذشتہ خلفا کے عہد سے چلا آتا ہے یا تو وہ سب غلطی پر تھے یا آپ غلطی پر ہیں۔ مجھے بتایئے کہ ان دونوں میں سے کون بات ہے؟ اس کے بعد درخواست کی تھی کہ ان ہدایا کو قبول فرمایئے اور ان کے معاوضے میں اُس رسم قدیم کو جاری رہنے دیجیے"۔ عبدالملک کو اس خط پر بڑا غصہ آیا۔ مگر اُس نے ضبط کیا۔ سفارت مع اُن ہدایا کے واپس کردی اور خط کا کچھ جواب نہیں دیا۔ قیصر کی طرف سے وہ ہدایا دُونے کر دیے گئے اور پھر سفارت آئی کہ شاید یہ ہدایا آپ کی نظر میں کم اُترے۔ لہذا اب مضاعف کرکے روانہ کیے جاتے ہیں۔ مگر سفارت پھر اُسی طرح بے نیل مرام واپس گئی۔ تیسری مرتبہ قیصر نے ہدایا کو اور بڑھایا اور خط میں مذکورہ مضامین کے بعد لکھا بلکہ یوں کہنا چاہیے دھمکی دی کہ "اگر اس رسم کے پھر جاری ہونے کا حکم نہ دیا جائے گا تو میں اپنے ہاں سکّے میں تمھارے پیغمبر (صلعم) کے نام کے ساتھ ایسے الفاظ نقش کرادونگا جو تم کو نہایت ناگوار ہوں گے۔ اُس وقت تمھارے بنائے کچھ نہ بنے گی اور وہ سکّے تمھارے وہاں گھر گھر میں اور ساری دنیاے اسلام میں پھیل جائیں گے۔ یہ تم کو معلوم ہے کہ عرب اور سارے مسلمان ہمارے سکّے سے کام لینے پر مجبور ہیں"۔ یہ دھمکی عبدالملک بن مروان پر اثر کر گئی۔ وہ انتہا سے زیادہ پریشان ہوا۔ اور گھبرا کے کہہ اُٹھا "اب کیا کیا جائے؟" اہل دربار نے مشورہ دیا کہ اس

اس امر میں آپ خالد بن یزید بن معاویہ سے رائے لیں وہ کوئی نہ کوئی تدبیر نکالیں ہی گے۔ خالد سے پوچھا تو اُنھوں نے کہا "کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ اپنے سکّے خود بنا کے مروج کردیجیے۔ اور ممانعت کردیجیے کہ رومی سکوں کا چلن قلمرو خلافت کے اندر نہ باقی رہے"۔ غرض اسی رائے کے مطابق اسلامی سکوں کے لیے جناب فاروقؓ کے معین کیے ہوے اوزان قائم کیے گئے۔ ٹکسال جاری ہوئی اور یوں اسلام کو غیر ممالک کے سکوں سے آزادی حاصل ہوئی۔

اس واقعے کی تصدیق کسی حد تک انگریزی مورخوں کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ سنہ ۷۳ھ (سنہ ۶۹۲ و سنہ ۶۹۳ء) میں جسٹینین دوم قیصر روم اور عبدالملک کے بھائی محمد بن مروان سے لڑائی ہوئی۔ محمد نے ابتداءً تو برابر رومیوں کو شکستیں دیں۔ لیکن آخر صلح ہوگئی۔ اس صلح کے بعد سنہ ۷۵ھ یا سنہ ۷۶ھ میں خلیفہ عبدالملک کی طرف سے قیصر مذکور کے پاس ایک خط گیا جس میں ایسے الفاظ تھے جن سے قیصر کو اپنی توہین کا گمان ہوا۔ اُس نے وہ صلح توڑ دی اور اسکے ساتھ عبدالملک کو دھمکی دی کہ میں ایسے سکّے مروج کروں گا جن پر اسلام کی توہین کے کلمات کندہ ہوں گے۔ اسلام میں اسوقت تک سکّے نہیں جاری کیے گئے تھے۔ (ایرانی اور رومی) سکوں سے کام چلایا جاتا تھا۔ غرض اُسوقت عبدالملک سکہ بنوانے کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اُس کے حکم سے تیمائے ایک یہودی سُمیر نامے نے ٹکسال قائم کی۔

عہ تمام معتبر اور مستند مورخوں کی رائے ہے کہ عبدالملک نے خالد بن یزید کی ہدایت کے مطابق سکہ بنوایا۔ خالد بنی امیہ میں بہت بڑا عالم و فاضل اور گویا اسلام کا پہلا فیلسوف ہے۔ یہ یزید بن معاویہ کا بیٹا تھا۔ مگر سب کے خلاف دمیری شافعی نے بیہقی سے جو روایت کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالد نہیں بلکہ امام محمد باقر رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے بموجب عبدالملک نے سکے بنوائے۔ یہ روایت تمام مورخین کے بیان کے خلاف ہے۔ اور اسی لیے ہم نے جمہور کے بیان کا تتبع کیا ہے جو قرین قیاس ہے۔

عہ دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانکا۔

انگریزی مورخون کا یہ عام قاعدہ ہے کہ مسلمانون کے عہد کی تمام ترقیون کو کسی نہ کسی طریقے سے حتی الامکان اپنی طرف اور نہین تو کسی غیر قوم کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہین۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ اس کوشش میں کبھی اپنی امکانی قوت مین ٹھک کے زبردستی اور غلط بیانی سے بھی کام لینے لگتے ہین۔ سکے کی ایجاد جو سُمیر کے نام کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے یہ بھی ایک اسی قسم کا واقعہ ہے۔

بعض قدیم تاریخون سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنون ایک قسم کے درہم یا دینار سمیریہ کے نام سے مشہور تھے۔ اور سمیریہ اسی لیے کہلاتے تھے کہ اُنکے بنانیوالے کا نام سمیر تھا۔ مجرد اتنے بیان تک یہ واقعہ مبہم معلوم ہوتا ہے مگر علامۂ ابن اثیر نے اپنی تاریخ مین صاف کرکے کھول دیا۔ جسکے بعد شبہہ کی بالکل گنجایش نہین باقی رہتی۔ وہ سنہ ۷۶ ہجری کے واقعات میں جہان عبد الملک بن مروان کے حکم سے اسلامی سکہ بنائے جانے کا واقعہ بیان کرتے ہین وہان لکھتے ہین کہ حجاج نے اپنے سکے مروج کرنے کے بعد قطعی ممانعت کردی کہ رعایا مین سے کوئی شخص سکہ بنانے کی جرأت نہ کرے۔ اس حکم کے خلاف سمیر نامے ایک یہودی سکہ زنی کے جرم کا مرتکب ہوا۔ جب اُسے گرفتار کرکے حجاج کے سامنے لائے تو اُس نے کہا میرے بنائے ہوے سکے شاہی سکے سے زیادہ خالص اور کھرے ہین۔ اور جب مین نے دراصل سکہ بنا کے نقصان کی جگہ رعایا کو فائدہ پہونچایا تو پھر آپ مجھے کیون قتل کرنا چاہتے ہین؟ حجاج نے اُس کی اس حجت کو نہ مانا۔ اس مین شک نہین کہ سمیر ایک ذہین آدمی تھا۔ اُس نے مقیدی ہی کی حالت مین تولنے کے بٹے ایجاد کیے۔ اس لیے کہ اُس زمانے مین دینار و درہم کی طرح بٹے بھی غیر منتظم حالت مین تھے۔ ممالک مین کوئی عام وزن نہین قائم ہوا تھا۔ سمیر نے بٹے بنا کے حجاج کی خدمت مین پیش کیے اور رہائی کے لیے ملتجی ہوا۔ مگر حجاج نے اسپر بھی نہ مانا۔ تاہم اس مین کوئی شک نہین کہ سمیر کے بنائے ہوے بٹے مروج ہوگئے اور رعایا کو تاجرون اور بازارون کے غبن سے بہت کچھ نجات مل گئی۔ سمیر کی نسبت اس سے زیادہ پتہ نہین لگتا کہ حجاج کی قید مین اُس کا کیا حشر ہوا۔ غالبًا قتل کیا گیا ہوگا۔ کاش اگر یہ کہا جاتا کہ سمیر نے مسلمانون کو بٹے دیے تو ہمین بے شک تسلیم کرنا پڑتا کہ دنیاوی

انتظام مین ایک حدتک خلافت اُسکی زیر بار احسان تھی۔ مگر یہ تو بالکل لغو ہے کہ سمیر نے سکہ بنا دیا۔ جو سکے سمیریہ کے نام سے مشہور تھے غالبًا وہ وہی تھے جن کو سمیر نے مجرمانہ طور پر بنا کے پھیلا دیا تھا۔

بعض مورخین اسلام نے پہلے پہل سکہ بننے کا حال یون لکھا ہے کہ عبد الملک کی طرف سے جو خطوط قیصر کے پاس جاتے تھے اُنکی پیشانی پر لکھا ہوتا تھا۔ "قل ہو اللہ احد" اسکے بعد محمد صلعم کا نام مبارک اور اُس کے نیچے تاریخ لکھی جاتی تھی۔ قیصر کو یہ ناگوار ہوا۔ اُس نے جواب مین لکھا "اس وضع کو چھوڑ دو ورنہ ہم دینارون پر تمھارے پیغمبر کی نسبت ایسے کلمات نقش کراوٗن گا جو تمھین ناگوار ہون گے"۔ یہ امر عبد الملک کو بہت ہی دشوار معلوم ہوا۔ اُس نے لوگون سے مشورہ کیا۔ خالد بن یزید نے راے دی کہ "آپ خود اپنا سکہ جاری کرین"۔ عبد الملک نے حجاج کو ٹکسال قائم کرنے کا حکم دیا۔ حجاج نے اس حکم کے مطابق درہم و دینار بنانا شروع کیے اور اُن پر یہ عبارت نقش کرائی "اللہ احد اللہ الصمد" یہ سکہ عام اہل اسلام کے خلاف ہوا اس لیے کہ یہ قرآن کی عبارت تھی جس کو بے طہارت و وضو مس کرنا حرام ہے۔ تاہم اس ناراضی کی طرف توجہ نہین کی گئی۔ یہ سکہ سنہ ۷۶ھ مین بنا اور سنہ ۷۷ھ مین تمام ممالک مین پھیلا دیا گیا۔

چند روز بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ سکہ خالص نہین ہے۔ چنانچہ یزید بن عبد الملک کے عہد مین جب ابن ابی ہبیرہ والی عراق مقرر ہوا تو اُس نے اس سکے کے خالص کرنے کی کوشش کی۔ پھر ہشام کے زمانے مین خالد قسری نے اور خالص کرنا چاہا۔ ان دونون کے بعد یوسف بن عمر نے سب سے بڑھ کر اس مین اہتمام کیا اور ٹکسال کا اچھی طرح امتحان کرکے اپنے عہد کا سکہ بالکل خالص بنا دیا۔ اسی وجہ سے ہبیری۔ خالدی۔ اور یوسفی سکے عہد بنی اُمیہ کے سب سے خالص اور کھرے سکے تصور کیے جاتے تھے۔ یہی خیال تھا جس نے بنی عباس کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور کو حکم عام دیدینے پر آمادہ کیا کہ خراج مین مذکورہ تین سکون کے سوا اور کوئی سکہ نہ لیا جائے۔

قبل اسلام سلاطین ارض کا عام قاعدہ تھا کہ سکّون پر مختلف قسم کی تصویرین بنایا کرتے تھے - کبھی تو بادشاہ کی تصویر کندہ ہوتی تھی - کبھی کسی قلعے کا نقشہ بنایا جاتا تھا - کبھی کوئی جانور بنا ہوتا تھا کبھی کوئی اور چیز بنی ہوتی تھی - مسلمانون نے جب سکہ بنایا تو تصویرین بنانا چھوڑ دین اور اُنکے عوض پُرزور کلمات کندہ کرائے - زیادہ تر اس کی وجہ تو یہ تھی کہ شریعت اسلامیہ مین تصویرون کی ممانعت ہے - مگر قطع نظر اسکے ایک اور بھی خیال تھا جس نے انکو تصویرون کی جگہ الفاظ کندہ کرانے پر آمادہ کیا - عرب فصاحت و بلاغت کو اپنا قدیمی تمغہ خیال کرتے تھے - انکو دعوے تھا کہ شوکتِ الفاظ مین کوئی ہمارا مقابلہ نہین کر سکتا - اور اسی وجہ سے الفاظ و کلمات ہی کو اُنھون نے اپنا معرکہ قرار دیا - یہ سکہ مدور وضع کا تھا - ایک رخ پر تو اللہ جل شانہٗ کا نام منقوش ہوتا تھا اُسکے نیچے رسول مقبول صلعم پر درود کندہ ہوتا تھا - اور دوسرے رخ پر تاریخ اور بادشاہِ وقت کا نام لکھا جاتا تھا - آیات قرآنی لکھنے کا سلسلہ حجاج کے بعد سے موقوف ہو گیا - اسلامی سکہ بنی اُمیہ عباسیہ اور عُبیدیین مصر کے زمانون مین اسی قطع کے مدور رہے - لیکن مغرب مین جب دولت موحدین قائم ہوئی تو مہدی نے لوگون کے لیے مربع قطع کے نئے سکّون کیے جن کا بہ اُسی خاندان مین رواج رہا -

یہان پر ہم سکے کے بیان کو ختم کرتے ہیں اور آخر مین اتنا اور لکھتے ہین کہ وہی سکہ جو عبد الملک کے عہد مین مروج ہوا وہی شرعی سکہ کہلاتا تھا اس لیے کہ جناب فاروقؓ کے قائم کیے ہوے اوزان پر بنایا گیا تھا -

عربی سے فارسی و اُردو کے تعلقات

ستمبر سنہ ۹۳ء

بعض لوگون کو اندنون ہم اس خیال مین محو پاتے ہین کہ فارسی یا اُردو زبان مین سے عربی کے الفاظ بالکل نکال ڈالے جائین - یہ خیال کچھ ان مشرقی زبانون ہی کے ساتھ مخصوص نہین ہے بلکہ ہم انگریزی مین بھی دیکھتے ہیں کہ ایسی کوشش ایک عرصہ سے جاری ہے - انگریزی زبان میں بے انتہا لاطینی (رومی) الفاظ ملے ہوے ہیں -

جو انگریزی قوم پر سے رومیون کی غلامی کا داغ کسی طرح مٹنے نہین دیتے - اور کوئی تعجب نہین کہ لاطینی الفاظ کے نکالنے پر جو چیز آمادہ کر رہی ہے اُس مین زیادہ حصہ اسی خیال کا ملا ہو -

فارسی اور اُردو مین جو عربی الفاظ ملے ہوے ہین وہ بھی اس امر کا ثبوت دیتے ہین اور ہمیشہ دین گے کہ ایران و ہندوستان کو کسی زمانے مین اسلام کی غلامی نصیب ہوئی تھی - جو لوگ ان الفاظ کو نکالنا چاہتے ہین غالباً اُن کا بھی یہی خیال ہو گا کہ اپنی زبان کو عربی یا دوسرے الفاظ مین یون کہا جائے کہ اسلام کی قید سے آزاد کرانا چاہتے ہین - مگر شاید ایسی کوششین ہمارے خیال مین بڑی مشکل سے کامیاب ہو سکین - فردوسی نے ایک شاہنامہ لکھا جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ عربی الفاظ سے بچنے کی پوری کوشش کی تھی - لیکن اب شاہنامے کے دیکھنے والے بتا سکتے ہین کہ فردوسی کو اس ارادے مین کہان تک کامیابی ہوئی - بڑی تحقیق کے بعد جو کچھ فیصلہ کیا جا سکا وہ اسی قدر ہے کہ شاہنامے مین عربی الفاظ بہت کم ہین - یہ کوئی نہین کہہ سکتا کہ عربی الفاظ اُس مین بالکل نہین - ادھر آخر زمانے مین ناصر الدین شاہ ایران کے چچا نے نثر مین ایک تاریخ بنام نامۂ خسروان لکھی - اس میں بھی عربی الفاظ بالکل متروک کر دیے ہین - اور بے شک وہ اسوجہ سے بہت کچھ قابل تعریف ہین کہ اپنی وضع کو آخر تک نباہ لیجا سکے - لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ اُنکی عبارت مروجہ فارسی سے کہان تک موافق رہی ہے اور محاورات کی کسوٹی پر کس قدر پوری اُترتی ہے تو شاید اُنکو جواب دینا دشوار ہو گا - زبان کی اصلاح وہین تک جائز ہے جہان تک کہ محاورہ اور اہل زبان کی پیروی سے ہو - جب ایرانیون کی زبان پر ہزارہا ایسے عربی الفاظ چڑھے ہوے ہین جن کی جگہ پر کوئی ٹھیٹھ فارسی لفظ بولنے والون کو روزمرہ کے استعمال کے لیے نہین ملتا تو اُنکے نکالنے کی کوشش کرنا زبان کی اصلاح نہین بلکہ ایک قسم کا جنون ہے - دوسری زبان کے الفاظ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے استعمال کرنا کوئی مشکل کام نہین ہے اگر دشواری ہے تو یہ کہ اُنکے استعمال مین محاورے کا لحاظ رکھا جائے -

تاہم یہ کتابین تاریخ مین ہین کسی علم و فن کی دنیا مین قدم رکھتے وقت

انسان کو معلوم ہو سکتا ہے۔ فارسی زبان کس قدر بے مایہ ہے۔ بغیر اسکے کہ عربی الفاظ سے مدد لی جائے کوئی شخص ایک علمی مسئلہ بھی فارسی مین نہین بیان کر سکتا۔ جو صاحب اس قسم کی کوشش کرنا چاہتے ہین اُن کا کام ہے کہ زبان کو اپنے اصول سے درست کریں۔ آج تک کسی نے اتنا تو کیا نہین کہ فارسی کی صرف و نحو ہی درست کی ہوتی۔ آج تک جس کسی نے نحو مین کوئی کتاب لکھنے کا ارادہ کیا اس نے وہی عربی کے قواعد عربی ہی اصطلاحات کے ساتھ فارسی میں بیان کر دیے۔ حالانکہ سمجھنے والے خوب جانتے ہین کہ گو ہزارہا عربی الفاظ فارسی مین مستعمل ہین مگر زبان اپنے طرز سے ایسی علحدہ واقع ہوئی ہے کہ عربی کے قواعد فارسی پر ٹھیک منطبق نہین ہو سکتے بلکہ عربی کی جگہ اگر انگریزی نحو و صرف سے فارسی مین کام لیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ بہرحال فارسی کے ہمدرد آج تک اُسکے لسانی قواعد تو درست ہی نہین کر سکے عربی کی غلامی سے اُسے کیا خاک آزاد کرا سکین گے؟

ایک پارسی صاحب نے ایک انگریزی اخبار مین ابھی اس خیال پر زور دینا چاہا تھا جو ماشاء اللہ نہ فارسی ہی جانتے ہین اور نہ عربی ہی۔ اُنھون نے محض اپنے حُسن عقیدت سے یہ دعوے کر دیا کہ فارسی اس قدر مکمل زبان ہے کہ بعض موقعون پر عربی کو اُسکے خزانے سے الفاظ عاریت لینا پڑے۔ چنانچہ انھون نے شاید کسی سے سُن کے لگام کے لفظ کو پیش کیا ہے جسکو عربون نے معرب کر کے لجام کر لیا۔ اور آج تک مروج ہے۔ یہ خیال بعض ایرانی صاحبون مین بھی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ دو ایک عجمیون کی زبان سے ہم نے خود بھی سنا ہے۔ وہ کہتے ہین کہ جاہلیت مین سیف بن ذی یزن کی فریاد پر جب ایرانیون نے ملک یمن پر قبضہ کر لیا تو اُس زمانے مین فارسی کے بہت سے الفاظ عربون کی زبان پر مروج ہو گئے۔ قطع نظر اسکے عرب کے حصۂ حیرہ وغیرہ پر مدتون سے ایران کی حکومت تھی۔ یہ بھی ایک کافی ذریعہ عربی مین فارسی الفاظ کے جانے کا تھا۔ لیکن یہ خیال ایک جاننے والے کے نزدیک بالکل لغو اور بے سروپا ہے اول تو جہان عرب کے حصہ حیرہ وغیرہ کی حکومت ایرانیون کے ہاتھ مین تھی وہان سرحد شام سے ملے ہوئے اضلاع عرب پر روم کی حکومت تھی۔ علی ہذا القیاس یمن پر جہان چند

روز کے لیے ایرانیون کی حکومت رہی وہان اُن سے پہلے بوساطت نجاشی عرصے تک روم کی بھی حکومت رہی۔ کوئی وجہ نہین کہ عربی نے ایرانیون سے اُنکی زبان کے الفاظ تو لیے ہون اور رومی زبان کے الفاظ یونہیں چھوڑ دیے ہوں۔

قطع نظر اسکے شاید اس خیال والون کو یہ نہیں معلوم کہ اضلاع عرب پر غیر ممالک کی حکومت تھی بھی تو کس طرح کی۔ سیف بن ذی یزن کے عہد مین جو ایرانیون نے ملک یمن کو فتح کیا اُس کی یہ حالت تھی کہ یمن پر بادشاہ حبشہ نے متصرف ہو کے جب وہان کے شرفا کی آبرو ریزی شروع کر دی تو سیف بن ذی یزن نے کسریٰ کے دربار مین جا کے فریاد کی اور بہت دنون تک پڑا رہا۔ آخر کسریٰ نے ایک فوج دے کے اپنے ایک افسر کے ساتھ اُسے یمن پر روانہ کیا۔ اس فوج نے حبشہ والون کا قلع قمع کیا اور سیف بن ذی یزن کو بادشاہ بنایا۔ اس مین شک نہین کہ ملک کو ایرانیون نے فتح کیا مگر حکومت سیف بن ذی یزن کی رہی جو عربی نژاد تھا۔ بس اتنا تھا کہ وہ ایران کے آگے سر جھکائے ہوئے تھا۔ ورنہ یہان کے انتظامات اور معاملات سے شہنشاہ ایران کو کوئی تعلق نہ تھا۔ باقی رہے اضلاع حیرہ وغیرہ یہان کی بھی یہی حالت تھی۔ ان مقامات پر نعمان بن منذر کا خاندان حکمران تھا۔ سیف بن ذی یزن کی طرح یہان کے فرمانرواؤن نے بھی یہی کیا کہ تاج ایران کے آگے سر جھکائے رہے۔ غرض ایرانی رعایا سے عربی رعایا کے تعلقات کبھی اتنے نہین بڑھنے پائے کہ الفاظ و خیالات کا باہم تبادلہ ہوتا یا عجمی الفاظ عربی مین پہونچتے۔

دوسرے سب سے زیادہ جس بات نے عربی زبان کو خارجی اثرون سے بچایا وہ یہ تھی کہ عرب مین سب سے زیادہ مستند اور قابل تتبع قریش کی زبان تھی جن کو خدا نے ہمیشہ غیر قومون کی اطاعت سے بچایا۔ قریش نے کبھی کسی کے آگے سر اطاعت نہیں جھکایا۔ اور نہ اُن کو سوا خاص تاجرانہ سفرون کے غیر زبان بولنے والون سے ملنے کی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔ لہذا اُنکی زبان ہمیشہ ان خارجی اثرون سے محفوظ رہی۔ اور عربی زبان مین کوئی لفظ شامل ہی نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ قریش کے لوگ اُسکو تسلیم نہ کر لین۔ غرض ان وجوہ

ے کبھی قیاس ہی مین نہین آسکتا کہ فارسی کے الفاظ عربی مین شامل ہوے ہون -
ہان بعد اسلام البتہ عربی مین فارسی کے بعض الفاظ مستعمل ہو گئے جس کی
وجہ یہ ہوئی کہ خلافت عباسیہ نے اپنا مستقر بغداد کو قرار دیا جو در اصل ایک ایرانی
شہر تھا - صرف اتنا ہی نہین ہوا بلکہ عجمی خاندان وزارت کے درجے کو پہونچ گئے -
جس کی وجہ سے عربون کو ایرانیون سے ملنے جُلنے کی بہت ضرورت ہوئی اُس پر طرہ
یہ ہوا کہ خلفا اور اُن کی وجہ سے تمام امراے عرب عیش و عشرت کے سامانون کی
طرف متوجہ ہو گئے - جن کے لیے مملکت ایران اگلی دنیا مین مشہور تھی - یہ وہ سامان
تھے جو کبھی اہل عرب کے خواب و خیال مین نہ گزرے تھے - اور ان مین بہت سی
ایسی چیزین تھیں جن کے لیے عربی زبان کو فارسی ہی سے الفاظ لینا پڑے - جیسے
عربی زبان مین "شمعدانات" کا لفظ بھی دیکھا ہے جو اسی عہد مین عربون کی زبان
پر جاری ہوا - بلکہ حکومت کی وجہ سے اس سے پیشتر بھی تعلقات قائم ہو گئے
تھے کہ بنی اُمیہ ہی کے دور مین عربون کی زبان پر فارسی کے الفاظ چڑھ گئے - بنی
اُمیہ کے ابتدائی زمانے کا شاعر ابن مفرغ جو زیاد کے بیٹے عباد کے ہمراہ سیستان
کے جہاد پر آیا تھا - شہداے سندھ کے مرثیے مین کہتا ہے - ؎

کم بالجُرُومِ وارضِ الہند من قَدَمٍ
ومِن سَرَانِیک قتلی لاہم قُبِرُوا

(ممالک گرم مین اور ارض ہند مین بہت سے نقش قدم ہین اور بہت سے سرہنگان
قوم ہین جو شہید ہوے اور دفن نہین کیے گئے)

اس شعر مین اول تو "جروم" جرم کی جمع ہے جو لفظ گرم کا معرب ہے -
دوسرے مصرعے مین سرانک ہے جو فارسی لفظ سرہنگ کو بگاڑ کے بنایا گیا ہے -
بہر حال فارسی الفاظ اگر عربی مین آئے تو فتوحات اسلام کے بعد آئے -
مگر ان الفاظ کے عربی مین مروج ہو جانے سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ عربی
ان الفاظ کی محتاج تھی - عربی زبان کے خزانے مین اس کثرت سے الفاظ موجود
ہین کہ یہی زبان تھی کہ تمام علوم فلسفیہ و طبیہ یونانی و رومی زبانون سے لیے بغیر
اس کے کہ اسے اصطلاح کے لیے بھی ان زبانون کا زیر بار احسان ہونا پڑا ہو -

جناب شہربانو

ہم نے ایک مضمون "خاندان نبوت" کے متعلق لکھا تھا - بادی النظر مین ہمارا
خطاب انگریزی مورخون کی طرف تھا - مگر افسوس ہے کہ مسلمان بھی ہم سے خفا ہو گئے
سنتے ہیں ہماری تکفیر کے لیے فتوے لیے گئے - مگر کسی نے اتنی عنایت نہ کی کہ اُن
فتون کو ہمارے پاس بھی بھیجدیا ہوتا کہ دیکھتے آخر ہماری خطا کیا ہے ؟ اور
کون کون صاحب ہین جو ہماری تکفیر فرماتے ہین ؟

لاؤ تو قتل نامہ مرا مین بھی دیکھ لون
کس کس کی مُہر ہے سر محضر لگی ہوئی

تاہم ہمکو بجائے خود اطمینان ہے - اور ہم بہت خوش ہین کہ اس مضمون مین
جو کچھ لکھا اُس مین سے ایک لفظ بھی بے اصل نہین - بعض احباب کی زبانی
معلوم ہوا کہ ہم نے جو جناب شہربانو کے زبید کے نکاح مین آنے کا حال لکھا تھا
اُسی پر لوگون کو غصہ آگیا - اگر یہی ہے تو افسوس کی بات ہے - یہ امر تو ایسا ہے
کہ مستند مورخین مین سے کسی کو انکار نہین - ہم دو کتابون کی عبارتون کا ترجمہ
کیے دیتے ہین - اور کتابین بھی کون ؟ جن سے زیادہ مستند تاریخین تاریخ کی
دنیا مین نہین مل سکتین -

محمد بن جریر طبری کی تاریخ مطبوعہ لیڈن کے صفحہ ۲۴۷۰ میں ہے "علی بن
حسین بن علی بن ابی طالب - آپ کی والدہ غزالہ تھین جو اُم ولد تھین - بعد
امام حسینؑ کے زبید اُنکے غلام نے اُنکو اپنے عقد نکاح مین لیا - تب عبداللہ
بن زبید پیدا ہوے جو علی بن حسین کے بھائی (اخیافی) ہین"

معارف ابن قتیبہ مطبوعہ لیڈن کے صفحہ ۱۱۰ مین مندرج ہے "اور علی بن
حسین اصغر امام حسین کی نسل آپ ہی سے چلی - بعض کہتے ہین آپ کی والدہ
سندیہ تھین - جن کا نام بعض سلافہ اور بعض غزالہ بتاتے ہین - بعد امام حسینؑ کے
اُنکو امام حسینؑ کے غلام زبید نے اپنے عقد مین لیا - اور عبداللہ بن زبید پیدا ہوے
جو علی بن حسین کے اخیافی بھائی ہین"

آغانی جو باعتبار اسناد اسی پایے کی کتاب ہے اُس میں بھی یہی واقعہ مذکور ہے۔ قدیمی تاریخیں جن پر کہ استناد و اعتبار کا دارومدار ہے وہ یہی ہیں۔ اور یہی اصلی سرچشمہ ہیں جن سے سلسلے کے متاخرین نے مصنف بننے کا فخر حاصل کیا۔ ابتداءً ہم نے اس واقعے کو ابن خلکان سے نقل کیا تھا۔ جو نہایت متداول کتاب ہے۔ اور غالباً ہر جگہ دستیاب ہو سکے گی۔ جن صاحب کو اطمینان حاصل کرنا ہو اُس کے ورق اُلٹیں اور امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے حالات میں دیکھ لیں۔ ابن خلکان نے شاید غلطی سے جناب شہربانو کے دوسرے شوہر کا نام زید لکھ دیا ہے۔ اگرچہ یہ بتایا ہے کہ وہ جناب امام حسین کے غلام تھے۔ مگر اب ہم کو بعد تحقیق معلوم ہو گیا کہ اُن بزرگ کا نام زید نہیں زُبید تھا۔

سب سے بڑھ کر لطف کی یہ بات ہے کہ جو خدشہ اس معاملے میں معترضون کو گذرا ہے یہی خدشہ انکی طرح خاص اُسی زمانے میں عبدالملک بن مروان کے دل میں بھی گذرا تھا۔ لہذا ہم بھی اُنکو وہی جواب دینا مناسب خیال کرتے ہیں جو عبدالملک مذکور کے مقابلے میں جناب امام زین العابدین کی زبان فیض ترجمان سے ظاہر ہوا تھا۔ مذکورۂ بالا کتاب معارف ابن قتیبہ میں ہے "علی بن حسین (رضی اللہ عنہ) نے اپنی والدہ کا عقد اپنے غلام سے کر دیا۔ اور اپنی ایک لونڈی کو آزاد کر کے خود اپنے عقد نکاح میں لے لیا۔ یہ سن کے عبدالملک بن مروان نے اُنکو ایک خط لکھا۔ جس میں اس معاملے پر شرم دلائی تھی۔ علی بن حسین نے جواب میں تحریر فرمایا۔ قد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃٌ حسنۃٌ۔ رسول اللہ صلعم نے صفیہ بنت حیی کو آزاد کر کے اپنے نکاح سے مشرف فرمایا تھا۔ اور زید بن حارثہ کو آزاد فرمایا اور اپنی چچا زاد بہن زینب بنت جحش کو اُن کے نکاح میں دے دیا" اب اس سے بڑھ کے کیا شافی جواب ہو سکتا ہے جو یہ متاخر الذکر واقعہ بھی ابن خلکان میں موجود ہے۔

اس موقع پر ہمیں ایک اور امر کا جواب دینا ہے۔ ایک صاحب نے دلگداز کے اُس مضمون پر بھی جو فتح قسطنطنیہ کے متعلق ہے ایک اعتراض کیا ہے۔ اور اس اعتراض کو اودھ پنچ کے صفحون پر شایع کیا ہے۔ دلگداز کے مضمون میں ہے کہ

قسطنطنیہ پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں جو حملہ ہوا تھا اُس میں جناب امام حسین علیہ السلام بھی شریک مجاہدین تھے۔ اُس مضمون کے نیچے فٹ نوٹ میں تصریح کر دی گئی ہے کہ گبن کا تتبع کیا گیا ہے۔ ہمارے دوست پہلے گبن ملاحظہ کر لیتے تب اعتراض کرتے۔ شہادت جناب امام حسین علیہ السلام کے بیان میں وہ دیکھیں معلوم ہو جائیگا۔ باقی رہا کہ کسی اسلامی تاریخ سے ثابت کیا جائے اسکے ہم مکلف نہیں۔ اس لیے کہ مضمون میں گبن کے تتبع کی تصریح کر دی گئی ہے۔

اس موقع پر ہمیں معزز ہمعصر اتحاد کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ ایسے نازک وقتوں پر وہ ہماری مدد پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُنکو ایسی فضول بحثوں میں نہ پڑنا چاہیے۔ جواب کسی لائق آدمی کے مقابلے میں ہو تو ایک بات بھی ہے۔ اور یوں ہر نادان کی چھیڑ چھاڑ پر اُنھیں اپنے قلم کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسلام اور تھیئٹر

(۱)

فی الحال یہ بحث پیش ہے کہ اسلام کو تھیئٹر سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اور برگزیدگان دین کا بہروپ بھر کے ایکٹروں کا ناٹک کے اسٹیج پر آنا اسلامی پبلک کی نظر میں کیسا ہے۔ یہ منحوس بحث تو جہاں تک نہ چھیڑی جاتی وہیں تک اچھا تھا۔ اس لیے کہ کوئی مسلمان اس بحث پر کچھ لکھنے کے لیے قلم ہاتھ میں لینے کے بعد اپنے ہوش میں نہیں رہ سکتا۔ ہم اسوقت لکھ رہے ہیں اور ہماری آنکھوں میں خون اُترا آ رہا ہے۔ جو جو ہمارا قلم آگے بڑھتا جاتا ہے وہ وہ ہمارے دماغ سے نیک و بد کے تمیز کرنے کی حس زائل ہوتی جاتی ہے۔ بعض پنجابی ہمعصروں نے اس معاملے میں نہایت قیمتی اور پُرجوش مضامین لکھے ہیں۔ اور ان جاہلوں کو اسلامی دینی حمیت کا نہایت اچھا سبق دیا ہے جو حیرت سے پوچھتے تھے کہ مسلمانو

کو اس پر کیون طیش آگیا۔

تھیٹر کیا چیز ہے؟ اس سے پہلے تو ہم اسی قدر جانتے تھے کہ روساء کی شادیون اور اکثر عام خوشی کی تقریبون مین ذلیل بھانڈ کسی خوبصورت لڑکے کو لا کے نچاتے ہین۔ اور اُس کے ناچ کے درمیان مین کبھی کبھی خود سامنے آ کے کوئی مسخرے پن کا واقعہ بیان کرکے یا کسی کا بہروپ بھر کے ادبی طبیعت والے رؤسا اور بچون کو ہنسی کے مارے لٹا لٹا دیتے ہین۔ ہمارے قدیم اسٹیجون کے اصلی ایکٹر یہی لوگ تھے۔ یہ عام ہندوستانی سوسائٹیون مین نہایت ذلیل سمجھے جاتے تھے۔ اور کوئی مہذب شخص اُن لوگون کو اپنے پاس بٹھانا بھی جائز نہ سمجھتا تھا۔ لیکن باوجود اس ذلت کے انکا جوش مذہبی مشہور تھا۔ چند روز پیشتر کے مسلمان بھانڈون کا یہ واقعہ ہندوستان کے ہر ہر بچے کو یاد ہے کہ ایک مرتبہ کسی غیر مذہب رئیس کے ہان کوئی خوشی کی تقریب تھی۔ بھانڈون کا قاعدہ ہے کہ جسکے ہان جاتے ہین پہلے اُسی کی نقل کرتے ہین۔ شاید اسی امر سے ناراض ہو کر یا خدا جانے کس وجہ سے صاحب خانہ رئیس نے اُن لوگون سے فرمایش کی کہ اپنے پیغمبر اور اُنکے دوستون کی نقل نہین کرتے؟ اسلامی حمیت ان نقالون کے دل مین بھی کسی نہ کسی قدر ضرور ہونا چاہیے تھی۔ اُنکو یہ متعصبانہ فرمایش سُن کے ملال بھی ہوا ہوگا۔ لیکن اس ملال کو اُنھون نے نہایت خوبصورتی سے مخفی رکھکے تیور نہ پہچاننے والے متعصبون سے عرض کیا کہ "بہتر۔ آپ کچھ تلوارین اور نیزے منگوا دیجیے"۔ خود فراموش رئیس اس پر بھی نہ سمجھا۔ اور اُس نے اسلحہ منگوا دیے۔ اس سامان کے ملتے ہی بھانڈون نے اپنا دلی جوش پورا کرنے کے لیے نہایت ہی خونخوار پارٹ شروع کر دیا۔ ایک شخص (معاذاللہ) محمد رسول اللہ صلعم بنا۔ باقی سب اُنکے جان نثار اور وفادار صحابی بنے۔ مصنوعی پیغمبر آخرالزمان نے تبلیغ رسالت کرکے اپنے پیرؤون کو حکم جہاد سنایا۔ اتنا سنتے ہی سب تلوارین کھینچ کھینچ کے اُٹھ کھڑے ہوے۔ جسکے بعد اُن بنے ہوے پیغمبر صاحب نے حملے کا آخری حکم دے دیا۔ اور وہ اسلامی (مصنوعی) لشکر جو اُسوقت تک ایک شام قاشٹ (جنگ مصنوعی) کا تماشا دکھا رہا تھا سچے

مجاہدین کا گروہ بن گیا۔ سبھون نے چارون طرف سیر دیکھنے والے اہل مجلس پر حملہ کیا اور دم بھر مین مع اہل خانہ رئیس کے سب کو کاٹ کے ڈال دیا گذشتہ برس ایک اسٹیج پر پیغمبر آخرالزمان کا بہروپ دیکھنے کی فرمایش کی گئی تھی اُس کا یہ نتیجہ ہوا۔ اور اسی لیے ہم کہتے ہین کہ ہمارے متعصب انگلش دوستون کو اگر پیغمبر آخرالزمان کا ناٹک دیکھنا ہے تو خود ہم سے بُلا کے کہین اور دیکھین کہ ہم کیسا اچھا اور کسقدر سچا پارٹ کرتے ہین۔ ایسا پارٹ جسکو دیکھ کے اُنھین کچھ مزہ بھی آ جائے۔ اور وہ اُنیسوین صدی کا ناٹک صرف لندن والون کی تفریح گاہ ہی نہ رہے بلکہ خود محمد صاحب کی لائف کی طرح ایک تاریخی یادگار کی بھی حیثیت حاصل کر سکے

اب ہم یہ بتاتے ہین کہ ڈراما کی ابتدا کس وقت اور کیونکر ہوئی۔ انگریزی مورخین کے نزدیک اسکے بانی اور موجد یونانی بت پرست ہین۔ اگرچہ ہندوؤن کو بھی اپنی جگہ پر اسکی ایجاد کا دعویٰ ہے۔ مگر چونکہ یونانیون کے ڈراما کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے۔ لہذا ہم پہلے یونانیون سے بحث کرتے ہین۔ پھر ہندوؤن کا ذکر کرین گے۔

مسلم ہے کہ سب کے پہلے جمہوری سلطنت یونان مین قائم ہوئی تھی جمہوری ریپبلکن اصول کا اصلی مقتضا یہ ہے کہ عام اہل ملک خوش رکھے جائین۔ یہ غرض بغیر ڈراما کے اور کسی طرح حاصل نہین ہو سکتی تھی۔ بس انھین ضرورتون کی وجہ سے ڈراما یونان مین پیدا ہوا۔ اور برابر ترقی کرتا گیا۔ اگرچہ ڈراما کو زیادہ عروج خاص اتھنس والون کے ہاتھون حاصل ہوا مگر اسکے اصلی موجد ڈوریا والے ہین۔ جنھون نے پہلے پہل اس کی بنا ڈالی۔ اور ابتداءً اس کی دونون قسمین ٹریجڈی (حسرت) اور کامڈی (خوشی) ڈوریا والون کی ریاستون پیلاپونی سس (جو مقام فی الحال موریا کے نام سے مشہور ہے) مین مروج تھین اور اسی وجہ سے آتیکا کی ٹریجڈی مین گانے والون کی چوکیان جو ڈراما کی اصلی بنا تھین۔ ڈوریا والون ہی کی لغت مین لکھی جاتی تھین۔ یہین سے پتہ لگتا ہے کہ اہل اتھنس نے ڈراما کو ڈوریا والون ہی سے لیا تھا۔

ابتدائی عہد مین دونون مذکورہ اقسام ڈراما کی ایجادین ہوئی کہ

اُنہیں کے ذریعے سے ڈایونی سس (شراب کے دیوتا) کی پرستش کی جاتی تھی اور دونوں میں ایسا فرق نہ تھا۔ جیسا آج ہے۔ بلکہ اس عہدہ فرق ایسا تھا کہ گانوں اور دیہاتوں مین ڈایونی سس کی پوجا کامڈی نے ذریعے سے کیجاتی تھی۔ اور شہرون مین ٹریجڈی کے ذریعے سے۔ مگر اُس ٹریجڈی مین کوئی غم و حسرت کی بات نہ ہوتی تھی۔ ٹریجڈی مین ایک قسم کے ایکٹر بنا کرتے تھے جو سٹارس کہلاتے تھے۔ اور وہ بکریون کی قطع اور وضع مین اسٹیج پہ آکے ڈایونی سس کے بھجن گاتے تھے اور ناچتے تھے۔ اسکے خلاف کامڈی مین جو ایکٹر اسٹیج پر آتے تھے وہ مسخرہ پن کرتے تھے اور ہنستے ہنساتے تھے اور تماشا دیکھنے والون پر پھبتیاں کہتے اور آوازے کستے تھے۔ اسکے بعد دونون قسم کے ڈراما کو تدریجاً ترقی ہونے گئی۔

ٹریجڈی کو اُسوقت سے ترقی ہوئی جب سے اُس مین غزلین کائی جانے لگیں ان غزلون مین اکثر مضامین حسرت ہوتے تھے یعنی ڈایونی سس دیوتا کے مصائب کا دکھڑا رویا جاتا تھا۔ اور اسی وقت سے حسرت و اندوہ کے خیالات ٹریجڈی کا جزو رری ہو گئے۔ غزلین اس طرح گائی جاتی تھین کہ پچاس آدمی اس کے ڈایونی سس کی قربان گاہ کے گرد کھڑے ہوتے تھے اور آوازین ملاکر گاتے تھے۔ اس عہد کے بعد کارنتھ مین ایک شخص پیدا ہوا اریان اُس نے اُن غزلون مین اور ترقی پیدا کی

ہوتے ہوتے وہ زمانہ آیا کہ پائی سس ٹرٹیس بادشاہ کے زمانے میں تھس پس نے اسی ڈراما کو ترقی دلانے مین ناموری حاصل کی۔ معمولی ایکٹر جو پیشتر سے معین چلے آتے تھے۔ اُنکے علاوہ تھس پس نے ایک نیا ایکٹر ایجاد کیا اور یہ طریقہ ہو گیا کہ تین ٹریجڈیان ایک ہی غرض سے کیجاتی تھین اور اُنکے بعد ایک نقل ہوتی تھی۔ اور ڈراما انھین اصول پر چلا آتا تھا۔ یہان تک کہ قبل مسیح ۵۲۵ء مین اسکیلس پیدا ہوا۔ اس شخص نے ڈراما مین بہت زیادہ ترمیم کی اور اُس نے گویا ڈراما کی ایجادہ کا وصفت و دریا والون سے چھین کے اتھنس والون کو دیدیا۔ اسکیلس اتھنس کی ٹریجڈی کا موجد مانا گیا ہے۔ اس نے

اول تو تھس پس کی طرح ایک نیا ایکٹر اضافہ کیا۔ علاوہ برین ڈراما کی حیثیت کذائی جو آج ہمین نظر آتی ہے یہ اسکیلس ہی کی ایجاد ہے۔ اس لیے کہ رنگ آمیز پردے اور ایکٹرون کا بیش قیمت اور فوق ابھڑک لباس اُسی کی ایجاد ہے۔ جسکی وجہ سے ڈراما مین رونق کے علاوہ اثر کو بہت کچھ ترقی ہو گئی۔ پھر حضرت مسیح سے ۴۹۵ برس پہلے سفاکلیز پیدا ہوا۔ اس نے بھی اپنی یادگار مین ایک ایکٹر اور بڑھایا اور گویا یونانی ڈراما کی تکمیل کردی۔ قبل مسیح ۴۸۰ء مین یوری پائڈیز پیدا ہوا تھا۔ اُسنے مذہب اور پوجا کے اغراض سے عام کرکے ڈراما میں اخلاقی معاملات شامل کیے تھے۔ جس سے بیان کیا جاتا ہے کہ ڈراما خراب ہو گیا تھا۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ جذبات اور اثر کو بہت کچھ ترقی ہو گئی۔

یہ تو ٹریجڈی کا حال تھا۔ اب کامڈی کا حال سنئے۔ قدیم کامڈی کو ابتداءً کریٹنیس نے ترقی دلائی جس نے شاہ پریکلیس کے زمانے میں شہرت پائی تھی اسکے بعد ارسٹوفی نیز نے جو کامڈیان مرتب کیں تھیں وہ پالیٹیکل تھیں۔ اور ان کے ذریعے سے ممتاز اور سربرآوردہ لوگون کی نقلین کی جاتی تھیں جن میں ظرافت کا بہت زیادہ حصہ ہوتا تھا۔ یونان کے عہدِ وسطیٰ مین جو کامڈی مروج تھی۔ اس میں گانے والوں کی چوکیان منادر کردی گئیں تھین اور شخصی نقلین بھی اڑادی گئی تھیں۔ یونانی کامڈی اسی وضع پر رہی اور یونان کے عروج کا زمانہ آخر ہو گیا۔ یہاں تک کہ فل من (جو ۳۶۰ برس قبل مسیح پیدا ہوا تھا) اور من اینڈر (جو قبل مسیح ۳۴۲ء میں پیدا ہوا تھا) ترقی کے اسٹیج پر نظر آنے۔ ان میں پچھلا شخص مقدونیہ کے زمانہ عروج کا بہت بڑا نامور شخص تھا۔ ان دونوں نے مضر سلطنت سمجھ کے ڈراما میں پولٹیکل واقعات دکھانا ممنوع کر دیا۔

اس کے بعد رومیون کا دور شروع ہوا۔ چونکہ اُنھون نے اپنی ترقی کی بنا یونانی تہذیب کے کھنڈرون پر قائم کی تھی لہذا ڈراما ان مین بھی مروج ہوا۔ اور انکی بت پرستی اور دیوتاؤن کی پرستش میں برابر کام آتا رہا۔

رومی اور یونانی لوگون کے علاوہ ادھر ہندوؤں کو دعوے ہے کہ ہمنے اپنے زمانہ عروج مین ڈراما کو بھی بہت کچھ ترقی دلائی تھی اور بیشک یہ دعوے صحیح ہے

ہندوؤن کی مذہبی تقریبون مین اب بھی ہمین اُن ڈرامون کے بگڑے ہوے سین کبھی
کبھی نظر آجاتے ہین۔ دسہرے مین رام لیلا اور بعض موقعون پر کرشن لیلا دیکھ کے
ہم سمجھ جاتے ہین کہ ہندوؤن کو قدیم عہد مین ڈراما کا ضرور شوق تھا۔ بعض مورخین
نے تو ڈراما کا موجد ہندوون ہی کو قرار دیا ہے۔ جو بیان کرتے ہین کہ بہت قدیم زمانے
مین جبکہ ہندوستان اپنے تمام رسوم کے اعتبار سے وید کی پابندی کرتا تھا اور پورانون
کے اجتہاد اور ریفارم نہین ظاہر ہوے تھے اُس عہد مین سادی نقلین
جن مین زبان سے کچھ نہین کہا جاتا اور صرف اشارون سے مافی الضمیر ظاہر کیا جاتا
ہے ہندوستان مین مروج تھین۔ اور انھین نقلون سے ڈراما نکلا ہے۔ سنسکرت
مین بعض ناٹک موجود ہین لیکن انکی تصنیف یونان کے زمانۂ ترقی کے بعد ہوئی ہے۔
ہندوستان کی اس مقدس زبان مین ڈراما کے متعلق جتنے تصانیف ہین سب
ایک سو برس قبل مسیح سے لیکے آٹھوین صدی عیسوی تک لکھے گئے۔ اس سے پیشتر
ہندوستان مین کسی ڈراما کا پتہ نہین لگتا۔ گو اصول ڈراما یا اسباب ظہور ڈراما
بہت پہلے پائے گئے ہون۔ سنسکرت ناٹک (ڈراما) کا بہت بڑا باکمال موجد
کالی داس شاعر ہے۔ اور یہی پہلا شخص ہے جس نے سنسکرت مین پہلے پہل ڈراما
لکھے۔ اُس کا نہایت مشہور ڈراما سکنتلا ناٹک ہے۔ اس مین دربار وغیرہ کے
سین نہایت عمدہ دکھائے گئے ہین۔ کالی داس حضرت مسیح سے ۵۷ برس قبل اجین
کے مشہور علم دوست راجہ بکرماجیت کے ممتاز مشیرون مین تھا۔

سنسکرت کے ناٹکون مین مرچھ کٹک (کھلونا گاڑی) بھی قیمتی اور قابل قدر ہے
جو دس حصّون پر تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سنسکرت کا ایک اور ڈراما ہے۔
نل دمنتی (دنا ہین جواری اور وفادار بیوی) اس ناٹک کی بھی نہایت قدر کی گئی
اور زمانے نے اسکو بہت زیادہ شہرت دی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ فارسی کے
سحر بیان اور فاضل شاعر فیضی فیاضی نے اس کا ترجمہ نظم فارسی مین اس
خوبصورتی اور عمدگی سے اور ایسے شاندار الفاظ مین کیا کہ تمام فارسی مثنویان
اُسکے سامنے دب گئین۔

باوجود ان سب قصون کے اس امر کے خیال کرلینے کا نہایت آسان

موقع ہے کہ ہندوؤن نے بھی ناٹک کی بنا ابتداءً مذہبی پیرائے ہی سے کی ہوگی۔
اس لیے کہ رام لیلا اور کرشن لیلا جو ہندوون کے قدیم مذہبی کھیل بلکہ ذریع عبادت
ہین یقیناً انکی بنا کالیداس اور دیگر شعراء سے پہلے پڑی ہے۔ کالی داس اور جن
شاعرون نے جو کچھ لکھا ہے اگرچہ اُسکے پلاٹ مصنفون کی ذہانت کے شاہد ہین مگر
ماخذ سب کا وہی مذہبی ڈراما ہین جو ہندوون کی عبادت مین داخل تھے۔ اور جن
کے ذریعے سے قدیم نامورون کی زندہ مورتین بناکے ہند مین پرستش کی جاتی تھی
رومیون نے بھی ڈراما کو یونانیون سے سیکھ کے اپنی بت پرستی رسوم مین
شامل کرلیا تھا اور اٹالیہ مین بھی حضرت مسیح سے پہلے یہ ڈراما بتون کی عبادت
کا کام دیتے تھے۔ بہرحال اس مین کوئی شک نہین کہ ڈراما کی ایجاد جہان کہین
ہوئی ہو خواہ یورپ مین یا ایشیا مین لیکن اُس کی بانی بت پرست قومین اور اسکی
غرض بت پرستی تھی۔

ان قدیم عہد کی ترقی یافتہ قومون اور موجودہ یورپ کے درمیان مین صرف
ایک مسلمان تھے۔ جنھون نے پہلی قومون سے اصول ترقی کو حاصل کیا تھا۔ لیکن
مسلمانون کے خیالات ہر عصر اور ہر عہد مین دین کے تابع اور پابند رہے۔ نیز اُس
وقت جب وہ تلوارین ہاتھ مین لیے فتوحات کا سیلاب بہا رہے تھے۔ اور نیز
اسوقت جب وہ علوم کو اپنی مذہبی زبان مین لا رہے تھے اور ترقی وتہذیب
کے دریاؤن کی شناوری مین مشغول تھے۔ اُس حالت مین بھی جب وہ مفلس
اور محتاج تھے اور اُس حالت مین بھی جب وہ دولتمند تھے اور عیش وعشرت
کے جام اطمینان کے ساتھ نوش کر رہے تھے۔ اُنھون نے کسی وقت اور کسی
حالت مین دین کو نہ چھوڑا۔ لہٰذا یونانیون اور اپنے سے پہلی تمام ترقی یافتہ قومون
سے اُنھون نے جو کچھ حاصل کیا وہ وہی تھا جو دین اسلام کے خلاف نہ تھا۔
مصوری اگرچہ ایک عمدہ اور دلچسپ فن تھا انھون نے اُسکو بالکل چھوڑ دیا۔
موسیقی جو بت پرستون کے عبادات مین داخل تھی اور جو بت پرستون ہی کی تقلید مین
اب چرچ آرگن (گرجے کا باجا) اور مہوشون کی تانون کے پیرائے مین نمودار
ہوئی ہے اُس کی طرف بھی مسلمانون نے توجہ نہین کی۔ محض اس لیے کہ اُنکے ہادی

برحق نے اُنھین اس فن سے قطعًا روک دیا تھا۔

بخلاف عیسائیون کے جنھون نے شریعت عیسوی کی کبھی قدر نہین کی اور ہمیشہ انکے اعتقادات مین بت پرستون کی رسمین حضرت مسیح کی تعلیمات پر غالب آگئین۔ خود آنحضرت صلعم کے عہد مین عیسائیون نے اپنے کلیساؤن کو بتخانون کی نقل بنا دیا تھا۔ جس طرح منروا کی مورت ایتھنس کے بڑے مندر مین تھی۔ اور جس طرح دُرگا جی کی مورت ہندوؤن کے اکثر دیوہرون مین ہوتی ہے اُسی طرح حضرت مریم کی مورت اُنکے کلیساؤن مین تھی یورپ کے مسیحیون نے ترقی یافتہ غیر قومون کی کوئی لغویات نہ تھی جو نہ حاصل کرلی۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ یونانیون اور رومیون کی دیومالائی جس پر اُنکے کفر اور بت پرستی کی بنا تھی اُسکو بھی مسیحیون نے نہ چھوڑا۔ ایلیڈ اور آڈسی ہومر (جو اصل مین یونانیون کا ویدلیکی ہے) کے تصانیف بھی آج مسیحی دنیا کے قیمتی ہی نہین واجب التعظیم شئے ہین۔ لندن کے بازارون مین جوکی جو یونانیون کا دیوتا ہے آج قسمین کھائی جاتی ہین۔

بیشک مسیحیون اور مسلمانون مین یہ بڑا تین اور قابل غور فرق ہے کہ پہلون کا مسلک ماقال دکیا کہا) تھا اور آخرالذکر فریق کا مسلک صرف تقلیدی طور پر من قابل دکس کا قول ہے) رہا۔ خود پیغمبر عرب (بأبی انت واُمّی یارسول اللہ) نے باوجودیکہ مشرکین کے رسوم کے مقابلے مین ہمیشہ اہل کتاب کی رسمون کو ترجیح دی لیکن اہل کتاب کی بھی لغو اور شہرت پسندی کی باتین ہمیشہ چھوڑ دین۔ جوبلی جو یہودیون کی لغو رسم تھی اور جس سے اُن کا بہت بڑا اوچھاپن ظاہر ہوتا تھا اُسکا نام بھی مسلمانون مین مروج نہ تھا مگر یورپ کے مسیحیون مین یہان تک مروج ہوئی کہ خود روم کے بعض پوپون کی جوبلی یورپ کی تاریخ مین موجود ہے۔

جس طرح یہ سب باتین یورپ کے مسیحیون نے لین اُسی طرح ڈراما کو بھی انگلستان کے مسیحیون نے علمی نہین خاص مذہبی حیثیت مین یونانیون اور رومیون سے حاصل کرلیا۔ حالانکہ مسلمانون نے اُسکی طرف توجہ بھی نہین کی تھی۔

یورپ کی تاریخ بتا رہی ہے کہ مسٹری یعنی راز کی باتون اور خونریزی کے واقعات کے تماشے ایڈورڈ (بادشاہ انگلستان) کے عہد سے مدتون تک انگلستان

کے گرجون اور نیز سڑکون پر برابر نظر آیا کرتے تھے۔ اور اُنکے ذریعے سے عمومًا انجیل کے قصے دکھائے جاتے تھے اور تسلیم کرلیا گیا تھا کہ مذہبی تاریخ بتانے کا یہ نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔ جس سے صریحًا ثابت ہوگیا کہ ڈراما کو ابتداءً انگلستان کی علمی سوسائٹی نے نہین بلکہ مذہبی مقدس گروہ نے لیا تھا۔ انگلستان کے ان پہلے دورون مین پھر اتنا تغیر ہوا کہ اخلاقی معاملات پر اثر ڈالنے کے لیے الیگری کا رواج ہوا۔ الیگری یہ چیز ہے کہ خاص قوتین جو محسوس چیزین نہین ہین وہ استعارۃً مشخص کرلی جائین اور کوئی ایکٹر اُن کا بہروپ بھرے۔ مثلًا ایک شخص وفا کے نام سے نامزد کیا جائے۔ اور ایک دغا کے نام سے۔ اور دونون کی رفتار علحدہ علحدہ دکھائی جائے۔ ان الیگری ڈرامون مین پھبتی اور مذاق کی باتین زیادہ ہوتی تھین۔ سب سے پہلے اس قسم کا ڈراما آٹھوین ہنری کے عہد مین نکولس یوڈل نے تصنیف کیا جو آخر مین وسٹ منسٹر اسکول کا ماسٹر تھا۔ یہ ڈراما کامڈی تھا اور "رالف رائسٹر ڈائسٹر" کے نام سے نامزد تھا۔ ممدوح ماسٹر صاحب نے یہ ڈراما لکھ کے اپنے شاگردون کو دیا کہ وہ بہروپ بھر بھر کے اُس کا تماشا دکھائین۔ جسکے ذریعے سے لنڈن کے بہادرون اور عام باشندون کا طرز تمدن نظر آسکتا تھا۔ ملکہ الزبتھ کے زمانے مین ڈراما کا ذوق لوگون کے دل مین بڑھ گیا۔ اور اُسی زمانے مین تھیٹر کی عمارتین قائم ہوئین۔ اور اصول ڈراما کی تعلیم کا ایک اسکول بھی تیار ہوگیا۔ اس عہد کے تعلیم پائے ہوے لوگون مین سے بعض لوگون نے اصول ڈراما مین بہت کچھ وقعت اور شہرت حاصل کی مگر آخر شیکسپیر کے آگے جو اسی عہد کا ایک انگریزون کے نزدیک تمام اگلے اور پچھلے عہدون مین ڈراما کا سب سے بڑا مصنف تھا۔ سب کی شہرت مٹ گئی۔ لندن کے محلے بنک سائڈ مین جو ملکہ الزبتھ کے عہد کا بہت بڑا تھیٹر مشہور یہ گلوب تھیٹر تھا۔ اور ۱۵۹۴ء مین قائم ہوا تھا اسکے مالکون مین ایک شیکسپیر بھی تھا۔ شیکسپیر نے انگلستان مین ڈراما کو بہت ترقی دلائی تھی۔ اور اُسکے عہد سے انگلستان کے اخلاق عمومًا تھیٹرون کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ لیکن اس سے انگلستان کے اخلاق کو سخت ضرر پہونچا۔ انگلستان کی اخلاقی خرابیان ہماری ہی نظر مین نہین بلکہ خود انگلستان نے بعض اوقات

اس کا اعتراف کر لیا۔ چنانچہ کرامول کے عہد میں کامڈی کے ڈراموں کی سخت ممانعت
کر دی گئی۔ اس لیے نہیں کہ ان میں ظرافت اور مذاق زیادہ تھا بلکہ محض اس
وجہ سے کہ انکی وجہ سے اخلاق پر بہت برا اثر پڑ گیا تھا اور سوسائٹی کی حالت نہایت
ذلیل اور شرمناک ہو گئی تھی۔

اگرچہ آج اہل انگلستان کو اپنی سوسائٹی کے نہایت اعلی ترقی پر ہونے کا دعوی
ہے لیکن دیکھنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ وہاں کی تہذیب کیسی ہے۔ ڈراما کی
دونوں قسمیں وہاں آج مروج ہیں۔ فی الحال کی کامڈی میں عموماً وہ عشق و شوق
کی داستانیں ہوتی ہیں جن کا نتیجہ حسرت و غم اور مایوسی ہے۔ کامڈی کا یہ اثر صاف
ظاہر ہے کہ واقعات عشق و محبت میں جیسی آزادی اور بزرگوں کی مخالفت انگلستان
کے نوجوان مردوں اور عورتوں میں ہے ویسی آزادی دنیا کے پردے پر اور کسی
ملک میں نہیں۔ جو لوگ انگلستان ہو آئے ہیں اور نیز وہاں کے حالات سے ظاہر
ہو رہا ہے کہ دوشیزہ لڑکیاں جس قدر وہاں خراب ہو جاتی ہیں اس قدر اور کہیں
نہیں خراب ہوتیں۔ زنا جتنا وہاں مروج ہے دنیا کہیں ڈھونڈھے نہ ملے گا۔
وحشی اور ناتربیت یافتہ بلکہ جنگلی لوگوں میں عصمت و عفت ہے اور نہیں ہے تو
اس تربیت یافتہ اور مدعی تہذیب قوم میں۔ یہ تو کامڈی کا اثر تھا۔ اب ٹریجڈی
کا حال سنیے۔ خودکشی جو ہر مذہب اور ہر فلسفی کی نظر میں انتہا سے زیادہ نالائق
بزدلی اور بدنام کرنیوالی چیز ہے وہ انگلستان میں دنیا کی اکثر قوموں سے زیادہ
مروج ہے۔ خودکشی کے جیسے نئے اور عجیب و غریب حادثے انگلستان میں ظاہر
ہوے ہیں ویسے اور کہیں نہیں ظاہر ہوے۔ بلکہ اسی میں وہاں ہر خود اپنی
جان دینے والا ایک نئی جدت دکھا کے دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ یہ ظالم بدفعلی
صرف ٹریجڈی سے نمایاں ہوئی ہے۔ ٹریجڈی نوجوانوں کے دل میں اس ناموری
کی موت کا شوق پیدا کر دیتی ہے جو کسی ناکام اور مایوس عاشق کو نصیب ہوئی تھی
اور تھیٹر کے اسٹیج پر نظر آئی۔ یہ فائدے ہیں جو انگلستان نے اور اسکے ساتھ یورپ
کی دوسری تربیت یافتہ قوموں نے تھیٹر سے حاصل کیے۔ اور یہ وہ ناموریاں ہیں
جو مغرب زمین کو ڈراما کی بدولت نصیب ہوئیں۔ کیا اسکے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے

کہ ڈراما کوئی عمدہ چیز ہے؟ سچی اور نہایت ہی حق پر ہے شریعت اسلامیہ (علی صاحبہا
الصلوٰۃ و التحیۃ) جو بتاتی ہے کہ تمام اس قسم کی لغو چیزیں اور کل بیہودہ کھیل ناجائز اور
خدا کو۔ اس خلاق عالم کو نہایت ناپسند ہیں۔

افسوس! اور صد ہزار افسوس!! کہ وہی پیغمبر برحق۔ وہی ہادی مطلق۔ جسنے
ان لغو افعال کو حرام اور ناجائز بتایا۔ ایک بھچورا نقال۔ ایک ذلیل ناچنے والا
اس کی صورت بن کے اسٹیج پر آئے! اسکی زبان کٹ جائے اگر وہ ایسا دعوے
کرے! وہ مقام دھنس جائے جہاں اسکے منحوس قدم آئیں!

علاوہ بریں اس ڈراما میں صرف اتنی ہی خرابی نہیں کہ اس میں ایک ذلیل
شخص پیغمبر عرب کی صورت بن کے اسٹیج پر آئے گا۔ نہیں بلکہ اسکے ساتھ ہمارے
پیغمبر محمد صلعم کی توہین بھی کیجائے گی۔ وہ واقعات دکھائے جائیں گے جنکی نہ کوئی
اصلیت ہے اور نہ جنکو ذرا بھی محمد رسول اللہ صلعم کی شان سے کوئی مناسبت ہے
ابھی تک صاف صاف نہیں معلوم ہوا کہ اس ڈراما کا اصلی پارٹ کیا ہو
مگر ہاں جس قدر اشارۃً معلوم ہو سکا اسکا ماحصل یہ ہے کہ ایک ایکٹر محمد صلعم بن کے
آئے گا اور ایک ایکٹرس آں حضرت کی پیاری بی بی جناب عائشہ صدیقہ کا پارٹ
کرے گی۔ مصنوعی آں حضرت دعوی کریں گے کہ میں افضل الناس۔ افضل البشر
بلکہ افضل الخلق ہوں۔ عائشہ صدیقہ دعوی کریں گی کہ نہیں یہ جوہر خاص جناب
مسیح کا ہے۔ اور فضیلت کا تاج انھیں کے سر پر ہے۔ آنحضرت میں اور جناب
صدیقہ میں بہت دیر تک بحث ہوگی اور وہ بحث بہت طول کھینچے گی۔ آنحضرت
ہر پہلو سے اپنی فضیلت و فوقیت ثابت کرینگے۔ اور صدیقہ ہر پہلو سے اس کی تردید
کریں گی۔ آخر وہ فرضی آں حضرت صاحب ہر امر میں عاجز آ کر خودکشی کر لیں گے
اور اس ٹریجڈی کی حیثیت سے یہ ڈراما تمام ہو گا۔

یہ مضمون ابھی ناتمام ہے۔ باقی حصہ دسمبر کے پرچے میں شائع ہوگا۔ اس
وجہ سے یہ مضمون دو نمبروں پر تقسیم کر دیا گیا۔ پہلا نمبر ہم یہیں پر تمام کرتے ہیں۔ دوسرا
نمبر ناظرین آیندہ دیکھیں گے۔

(۲)

بعض مسیحیون نے یہ اعتراض کیا ہے کہ "اہل اسلام بزرگان دین کا ڈراما بحیثیتِ مذہب دکھایا کرتے ہین"۔ زیادہ ضرورت ہے کہ اس امر پر ہم ذرا تفصیل سے بحث کرین - مسلمانون مین دو بہت بڑے فریق ہین - ایک سُنی (یعنی پابندانِ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) دوسرے شیعہ (یعنی محبان اہلبیت رسالت علیہم السلام) اسلام کی ایک پولیٹکل نزاع نے یہ دونون گروہ پیدا کیے - ان دونون مین وہ جھگڑا ایک جزئی امر پر مبنی تھا - روزافزون تعصبات کی وجہ سے بڑھتا گیا - اور بڑھتے بڑھتے اس درجے کو پہونچا - کہ ہزارہا علما تہِ تیغ ہوے - ہزارہا مدارس و معابد مین آگ لگی اور صدہا شہر تباہ و برباد ہوے - خلاصہ یہ کہ اسلام کی موجودہ تباہیون کا اصلی سبب یہی اختلاف تھا - گو کہ اسلام مین اور بھی فرقے ہین مگر زیادہ صاحب اثر یہی دو فرقے ہین - ایک تیسرا فرقہ اس عہد مین جدید نظر آتا ہے جو وہابی کے نام سے پکارا جاتا ہے - اصل مین یہ فرقہ جدید نہین ہے - ہر عہد مین ایسے لوگ موجود تھے جنھون نے اسلام مین سے پیدا ہو جانے والے رسوم کو سرگرمی سے مٹانا چاہا - اور کوشش کی کہ اسلام اپنی قدیم اصلی حالت پر پہنچ جائے - گذشتہ اسلامی سلطنتون نے ایسے لوگون کو کبھی اُبھرنے نہ دیا - اور اسی وجہ سے اُن عہود سابقہ مین اس فرقے کے عقائد مخفی خیالات کی حیثیت سے کسی خاص شخص کے سینے مین مخفی رہے - جو زیادہ ہم خیال رہنے کی وجہ سے اپنے عقائد کو دل ہی مین چھپاتے رہے - اور اگر کسی نے ظاہر بھی کیا تو مخالف پولیٹکل قوتون کے خوف سے کوئی اور شخص اُس کا ہم خیال نہ ہو سکا - انگریزی دور نے آزادی دی اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ خیالات یک بیک اُبھر پڑے - اور اب روزافزون غلبہ حاصل کرتے جاتے ہین - یہان تک کہ اسلام مین ایک جدید قوی فرقہ پیدا ہو گیا -

ان تینون فرقون مین اہل حدیث لوگ جنھون نے متعصب دشمنون کی طرف سے وہابی کا خطاب پایا ہے وہ تو اُن تمام باتون کے مخالف ہی نہین دشمن ہین جو اسلام کے زمانۂ ابتدائی مین نہ پائی گئی ہون - اُن سے یہ اُمید رکھنا کہ وہ کوئی ایسی کارروائی جائز رکھین جو ڈراما کی قسم سے ہو بڑی غلطی ہے - باقی رہے عام اہل سنت اور امامیہ اثنا عشریہ جو عرف عام مین شیعہ کے لفظ سے مشہور ہین - جہان تک ہماری واقفیت

ہے دونون مین سے کوئی فریق بھی کسی ایسی کارروائی کو جسکے ذریعے سے بزرگان دین کے واقعات کی نقل دکھانا مقصود ہو جائز نہین سمجھتا - ایسے امور کی اجازت سے دونون معتبر و مستند کتابین خالی ہین - اگر کسی کو شک ہو تو دونون مذہبون کے علما سے بذریعۂ استفتا دریافت کر لے -

باقی رہی تعزیہ داری - جو واقعی ایک قسم کا ڈراما ہے اور جسکے موجد سُنی ہین اور حامی شیعہ خیال کیے جاتے ہین - اول تو یہ دیکھنا چاہیے کہ تعزیہ داری کی ایجاد کیون اور کیونکر ہوئی - سارا زمانہ جانتا ہے کہ پیغمبر آخرالزمان - اُس نبی برحق اُس شفیع المذنبین کے چھوٹے نواسے کو یزید بن معاویہ کی طرفداری مین اہل کوفہ نے غدر و فریب کے ہجرت کے ساٹھ برس بعد ارض کربلا مین شہید کیا تھا - اس شہادت سے اسلام کو ایک ایسا سخت صدمہ پہونچا جو اُسے ہمیشہ یاد رہے گا - اور جسکو یاد کر کے مسلمان اگر مسلمان ہین تو ہمیشہ روئین گے - یہ غم چاہے کتنا بڑا ہو مگر سچ یہ ہے کہ اُس عہد مین جزو دین اور جزوِ ایمان نہین خیال کیا گیا تھا - مسلمانون کو اگر صدمہ ہوا تو اسی قدر جتنا کسی قوم کو ایک عہد کے سب سے بڑے نامور اور مقتدا کے مارے جانے کا غم ہو - لیکن جو جو زمانہ گذرتا گیا یہ غم زیادہ باعث درد و الم خیال کیا جانے لگا - ایک طرف سُنی یعنی متبعین سنت کے خیالات مین یہ غم ہمیشہ ایسا ہی سمجھا گیا جیسا کہ ابتدا مین خیال کیا گیا تھا - لیکن دوسری طرف یعنی متبعان اہل بیت نے اسکو جزو ایمان تسلیم کر لیا اور آخر الامر اُنکے خیال مین یہ غم عملاً عقائد اسلامیہ پر غالب آ گیا -

اہل سنت مین بھی اکثر اوقات ایسے لوگ پیدا ہوے جو تمام عقائد مین تو پورے سُنی تھے لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام کا غم اُنکو معمول سے زیادہ تھا - چنانچہ اسی قسم کے سُنیون مین تیمور لنگ تھا جو ہندوستان کے مغلیہ خاندان کا بانی ہے - اسکو حضرت سید الشہداء علیہ السلام سے نہایت محبت تھی - اُسی محبت نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ ہر وقت غم کے تازہ رکھنے کے لیے اُس نے روضۂ حضرت امام حسین کی ایک نقل بنوا کے رکھ لی جو اسلام مین ایک بالکل نئی مثال تھی - سُنیون نے اسکو ایک معمولی امر خیال کیا لیکن شیعون نے جو محبت اہل بیت کے سب سے بڑے مدعی ہین اس رسم کو بڑی دلچسپی کے ساتھ اُٹھا لیا - تیمور مر گیا اور اُسکی یہ ایجاد شیعون مین رواج

پا گئی۔ جو زیادہ جدتوں کے ساتھ آج تک اسلام کے اس فرقے میں تعزیہ داری کے نام سے مروج ہے۔ اور جس کی وجہ سے آج یورپ کے متعصبوں کو اسلام کا ڈراما بنانے کے لیے ایک سند ہاتھ لگی۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ شیعوں کی مذہبی کتابیں اس رسم کی بابت بالکل ساکت ہیں۔ اور اسی وجہ سے اُنکے علما بھی اگرچہ خود تعزیہ داری اکثر کرتے ہیں مگر اسکے جواز و عدم جواز میں ساکت نظر آتے ہیں۔ مگر چاہے کچھ ہو اس سے عیسائیوں کو کسی قسم کے استدلال کا موقع نہیں مل سکتا۔

اول تو یہ دیکھنا چاہیے کہ شیعہ تعزیہ داری میں کیا کارروائی کرتے ہیں۔ وہ ایک مقبرے کا نقشہ بنا کے سامنے رکھتے ہیں۔ چونکہ رسول اکرم کے نواسے کی طرف وہ منسوب ہے لہذا اُسکی تعظیم اور اُس کا ادب کرتے ہیں۔ اُسکو دیکھ کے ایک اسلامی سب سے بڑی مصیبت کو یاد کر کے روتے ہیں اور ثواب جنت کے مستحق ہوتے ہیں۔ وہ کسی کی توہین نہیں کرتے۔ کسی کے ساتھ تمسخر نہیں کرتے۔ اور نہ اُس قسم کی کوئی بات ظاہر کرتے ہیں جسکو ڈراما سے تعلق ہو۔

دوسری بہت بڑی بات یہ ہے کہ وہ کسی شخص کی صورت اور تصویر نہیں بناتے وہ تو ایک عمارت ایک مقبرے یا ایک تربت کی نقل بناتے ہیں۔ وہ ہرگز پسند نہیں کرتے کہ اس زمانے کا ایک فاسق و فاجر اُنکے سامنے آ کے کھڑا ہو اور معاذ اللہ یہ زبان سے نکالے کہ "میں امام حسین ہوں" اگر کوئی ایسا کہے تو اُسکو روکنے اُس کا منہ بند کرنے کے لیے شیعہ اُسی سرگرمی، اُسی طیش، اُسی غصے سے موجود ہو جائیں گے جس سرگرمی سے اسوقت شیعہ اور سُنّی دونوں اُس شخص کو جو محمد صلعم کا بہروپ بھر کے تھیٹر میں آئے ٹانگ کھینچ کے ذلت سے اسٹیج کے نیچے گرا دینا چاہتے ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ کربلا اور ایران میں کربلا کا ڈراما دکھایا جاتا ہے۔ شاید ایسا ہو۔ لیکن ہمارے نزدیک اُن لوگوں پر یہ بہت بڑی تہمت ہے۔ اگر کسی جاہلیت کے پُرجوش دور میں دکھایا گیا ہو تو اور بات ہے مگر بحیثیت مذہب اگر آج کوئی شخص مقدس مجتہدین کے سامنے کھڑا ہو کے یہ دعوے کرے کہ میں نے امام حسین علیہ السلام

کا بہروپ بھرا ہے تو شاید اُسکی تکفیر میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا جائے گا۔ اور شیعوں کی دنیا میں اُسکو کسی جگہ ٹھہرنے کا موقع نہ ملے گا۔

یہ بھی دعوی کیا گیا ہے کہ بعض شیعہ اُن خلفا کی تصویریں بنا کے توہین کرتے ہیں جو اُنکے خیال میں غاصب تھے۔ لیکن ایسا امر سوا عوام شیعہ کے خواص اور مہذب پارٹی کی جانب سے کبھی وقوع میں نہیں آیا۔ جو لوگ ایسے امور کے مرتکب ہوئے اور جنھوں نے ایسے رسوم کو جائز رکھا وہ شیعوں کی سوسائٹی میں کبھی قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھے گئے۔ علاوہ بریں سب سے زیادہ غور طلب یہ امر ہے کہ جب کبھی جن لوگوں نے ایسی کارروائیاں کیں اُن کا نتیجہ کیا ہوا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ بلوے ہوئے۔ فوجداریاں ہوئیں۔ خون کے سیلاب بہے۔ سنیوں اور شیعوں کی طرف سے خونریز مذاق کے لوگ اُٹھے اور اُنھوں نے کوئی امر بدانتظامی اور بے امنی کا نہ تھا جو اُٹھا رکھا ہو۔ ہزارہا عورتوں کی بے عزتی ہوئی۔ صدہا خاندان برباد ہو گئیں۔ بہت سے بچے یتیم۔ اور بہت سے باپ لاولد ہوئے۔ مدارس میں آگ لگائی گئی مسجدیں مسمار کی گئیں۔ کتابیں دریا میں غرق ہوئیں۔ قبریں کھود کھود کے لاشیں نکال لی گئیں اور اُنکی بے عزتی و توہین میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا گیا۔ [illegible] کی تاریخ کی طرح مسلمانوں کی تاریخ میں قتل و خونریزی اگر پیدا ہوئی تو انھیں اسباب کی وجہ سے۔ اور انھیں خیالات کی بنا پر۔

تو کیا یہ پسند ہے اور گوارا ہے یا انگریزی دور میں اُن قدیمی تعصبات کا پُرجوش اور پُرخروش میں دیکھنا مقصود ہے جو کوشش کیجاتی ہے کہ تھیٹر کے اسٹیج پر پیغمبر عرب کی توہین کیجائے اور اسلام کے تمام فرقے آپس میں اتفاق کر کے وہی فساد اور وہی آفت پیدا کر دیں جو پہلے آپس میں پیدا کیا کرتے تھے؟ اور کیا گورنمنٹ جو بلوون کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی ہے بلکہ اُنکے نام سے ڈرتی ہے ایسی کارروائیوں کو جائز رکھے گی؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم زمانے میں تعصبات بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اور اُن دنوں ایک مذہب کے تبع دوسرے مذہب کی توہین کے لیے نئے اصول اور طریقے ایجاد کیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے جو کچھ کیا اُسکو اُس عہد کی پُرشور و شر پبلک نے

دلچسپی کے ساتھ قبول کر لیا - علیٰ ہذا القیاس دوسرے مذہب والون نے اُس کا بدلہ
لینے کے لیے بھی ویسی ہی کارروائیان کین اور اپنے ہاتھ پاؤن اور اپنے جوش و
خروش سے کام لے کے اپنا کلیجا ٹھنڈا کر لیا - اصلی وجہ یہ تھی کہ زمانہ سابق کی
گورنمنٹون نے دو اصول معین کیے تھے - ایک جو سب سے مقدم تھا وہ یہ کہ غیر بادشاہون
کے حملے روکنے کی قوت ترقی کے ساتھ قائم کی جائے - دوسرے یہ کہ سلطنت اپنی
مالگذاری رعایا سے وصول کر لے - اسکی طرف بہت کم توجہ کی جاتی تہی کہ رعایا کے
حقوق کی حفاظت اورجان گورنمنٹ کرے - اور اس سبب سے اکثر ایسا ہوتا رہتا تھا کہ
کہ دو مذہبون مین لڑائی ہوئی اور گورنمنٹ نے اُسکے فرو کرنے کی کوشش نہ کی -
دونون طرف کے لوگون نے خوب جی کھول کے اپنے دلون کا بخار نکال لیا - لہذا اُس
زمانے مین اگر گورنمنٹ ایسی کارروائیون کو روکتی نہ تھی تو اُن لوگون کو جو اپنی
مذہبی توہین کا انتقام لینا چاہتے تھے اپنے اسلحہ اور اپنی قوت سے کام لینے کا
بھی پورا موقع دیتی تھی - ہمارے وہ دوست جو اس وقت اس قسم کی باتون کے
لئے گذشتہ توہین مذہبی کرنے والی کارروائیون کو بطور حجت پیش کرتے ہین وہ بخوبی
سمجھ لین گے کہ اگر گورنمنٹ اُنکو اجازت دیگی اور نبی برحق پیغمبر عرب صلعم کا بہروپ
بھرنے کا موقع دیگی تو لازمی طور پر گورنمنٹ کا یہ بھی فرض ہو جائے گا کہ مسلمانون کو
بھی انتقام لینے اور اُس منحوس تھیٹر مین آگ لگا دینے کا حق دے - اور اگر حق نہ دے
تو شاید مسلمانون کے دل کا جوش اور اپنی توہین مذہبی کا انتقام لینے کا جنون دل
مین ایسی اُس پیدا کرے گا کہ دل بے اختیار ہو جائے گا - اور شاید گورنمنٹ کو اپنا
انتظام متعلقہ امن و امان قائم رکھنے مین کسی قدر دقتین لاحق ہونگی -

بالفرض شیعہ بلکہ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہین کہ تمام مسلمان اپنے مذہبی معاملات کو
ڈراما کی حیثیت سے بنا کے دکھایا کرتے ہین لیکن پورے مراتب تعظیم و تکریم کے ساتھ -
یہ نہین ہوتا کہ ہم کسی کے مذہبی مقتداؤن کی اپنے ڈراما مین توہین کرتے ہون - ہمارے
دوست ہندو رام چندر جی اور سری کرشن جی کے ڈرامے دینی آداب کے ساتھ دکھاتے
ہین لیکن انکے دیسی اسٹیجون پر نہ کوئی موسیٰ آتا ہے نہ کوئی عیسیٰ آتا ہے اور نہ کسی
محمد کی صورت نظر آتی ہے اور نہ اُس کی توہین کیجاتی ہے - علیٰ ہذا القیاس ہمارے

شیعون کے ڈراما مین مظلوم سید الشہدا علیہ السلام کی مصائب دکھائے جاتے ہین - نہ وہ
مریم بتول کو بے عزتی کی وضع مین نکالتے ہین اور نہ کسی اور عیسائی پیشوا کی وضع مین
کسی کو لا کے ذلیل کرتے ہین ہمارا ڈراما اپنا دکھڑا رونے کے لیے ہوتا ہے ہم اورون
کی توہین کرنے سے کوئی غرض اور کوئی مطلب نہیں رکھتے -

جب ہمارے یہ خیالات ہین تو ہم کیونکر دیکھ سکتے ہین نہین - کیونکر سُن سکتے
ہین کہ کوئی اور بیہودہ شخص ہمارے مذہبی مقتداؤن کی توہین کرے - جہان تک
ہمارا دسترس ہوگا ہم اُسکو روکین گے - اُسکی ناجائز اور بیہودہ اور لغو خواہشون
کو پوری ذلت کے ساتھ خاک مین ملانے پر آمادہ ہونگے اور ہرگز موقع نہ دین گے
کہ دنیا بھر مین کوئی شخص ایسے تعصبات کا ظاہر کرنے والا نظر آئے -

انگلستان کے پولیٹکل تعلقات زیادہ تر مسلمانون ہی کے ساتھ ہین - ہندوستان
مین مسلمانون کی بہت زیادہ آبادی ہے - افغانستان اُسکی حمایت مین اپنے تئین
سینہ سپر ثابت کر رہا ہے - ایران مین روس کے مقابل مین اپنی پالیسیون کے کامیاب
کرنے کی ابھی اُسے بہت ضرورت ہے - ترکون سے اسکے تعلقات قدیم سے چلے
آتے ہین اور اب تک انگلستان ترکون کا ہمدرد ہے - اسکے علاوہ بھی پالیسیون کا
ایک بہت بڑا میدان افریقہ ہے - جس مین انگلش گورنمنٹ کو ابھی بہت کچھ کرنا
ہے - اُسے مصر کو اپنے موافق کرنا ہے - زنجبار کو اپنا مطیع بنانا ہے - اور سب سے
بڑی بات جسکی تکمیل مسلمانون ہی کی یاری اور اعانت سے ہو سکتی ہے وہ بردہ
فروشی ہے - انسداد بردہ فروشی کے لیے انگلستان بڑی بڑی کوششین کر رہا ہے
وہ چاہتا ہے کہ یہ ظالم رسم دنیا سے اُٹھ جائے - اور سب سے بدتر تجارت انسانی
کو دنیا مین زوال ہو - اس تجارت کے حامی اسوقت مسلمان ہی ہین - اور اسی
وجہ سے افریقہ مین اکثر انگلستان کے خلاف جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے - عرابی
پاشا کا جوش، مہدی کی فوج کشیان ان سب کی اصلی بنا انسداد بردہ فروشی تھی -
انگلستان اپنی دھمکیون سے اور اپنی فوجی قوت دکھا کے تمام بازار ہائے بردہ فروشی
واقع افریقہ کو بند نہین کرا سکتا - ہان اگر وہ بند کرا سکتا ہے تو اسی طرح کہ انگلستان
کی انسانیت اُن لوگون کے ذہن مین مرتکز ہو جائے جو بردہ فروشی کے حامی ہین

اور انکو یقین آجائے کہ انگلستان مین کوئی تعصب اور کسی قسم کی بدنیتی نہین ہے۔ وہ
سب لوگ جواب بڑی مصیبتون سے راضی کیے گئے ہین کہ انگلستان کی صلاح و تد
پر عمل کرین۔ جب یہ سنین گے کہ انگلستان کے دار السلطنت کے تھیٹر مین ڈراما کے
ذریعے سے محمد صلعم کی توہین کی جاتی ہے تو کیا کہین گے؟ اور خود انگلستان بھی سمجھ
سکتا ہے کہ برٹش پالسی کو کتنا بڑا ضرر پہونچ جائے گا۔

بیشک ملکۂ معظمہ نے نہایت عمدہ کارروائی کی جو اُس ڈراما کو موقوف کرا دیا
اور اگر خدانخواستہ ایسا امر وقوع مین آجاتا تو انگلستان کو بارہ کروڑ مسلمانون کی
دل آزاری سے جن مین بیشتر جنگجو خود مختار والیان ملک سلطان، شاہ، رئیس، ا
عوام بھی شامل ہین ایسی صورت مین کہ جب وہ اس ڈراما پر نہایت شد و مد سے
اعتراض کر چکے ہین بہت بڑا پولیٹکل نقصان پہونچتا۔

عنقاء

عربی۔ فارسی۔ اور اُردو لٹریچر مین عنقاء کی بے انتہا شہرت ہے۔ وہ یک ایسا
طائر ہے جو کبھی دنیا مین نہین دیکھا گیا صرف شعرا کے خیال مین رہتا ہے۔ متقدمین
نے اسکے بہت کچھ حالات بھی لکھے ہین۔ مگر وہ سب عموماً اُن روایتون سے ا
کیے گئے ہین جو انسانی تمدن کے بچپن اور میتھالوجی یعنی دیومالا کے زمانے کی
فی الحال عنقاء سے عموماً ہر ایسی چیز مراد لی جاتی ہے جو صرف وہم وگمان مین
مگر کبھی ظہور مین نہ آئی ہو۔

ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ کا ابتدائی اور افتتاحی زمانہ اُس کی دیومالا
سمجھا جاتا ہے۔ جس مین عموماً ایسی باتین ہوتی ہین جو بعید از عقل اور انسان
بچپن کے خیالات و اوہام کا نمونہ ہوتی ہین۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہر قوم
کی دیومالا مین اس قسم کا کوئی نہ کوئی جانور بیان کیا گیا ہے۔ ابتداءً اُسے دیوتا
کی ایسی وقعت دی گئی۔ بعد والون نے اُسکے وجود سے انکار تو نہین کیا
اُس کے طرح طرح کے حالات بیان کیے۔ اور کہا اُن مقامات مین رہتا ہے
جہان انسان کا گذر نہین ہوتا۔ لیکن اب جبکہ محققین اور خاصۂ علم حیوانات

ماہرین نے ساری دُنیا چھان ڈالی تو سب کو تسلیم کر لینا پڑا کہ وہ محض ایک
خیالی چڑیا ہے جسے خدا نے نہین بلکہ قدما کے وہم وگمان نے پیدا کیا تھا۔

غور طلب یہ ہے کہ عنقاء کا خیال اصل مین عربون کا ایجاد کیا ہوا ہے یا اُنھون نے کسی قوم سے اخذ کیا؟ اگر خود لفظ کو دیکھا جائے تو "عنقاء" کا لفظ
خالص عربی ہے۔ اور کسی عجمی زبان سے نہین لیا گیا ہے۔ عربی مین "عنق" گردن
کو کہتے ہین۔ اور حیٰوۃ الحیوان مین دمیری شافعی نے عنقاء کی وجہ تسمیہ دو باتین بتائی
ہین۔ ایک یہ کہ عربون کے خیال کے مطابق اس عظیم الشان اور خیالی طائر کے
گلے مین ایک سفید طوق سا بنا ہوتا ہے۔ اور دوسری یہ کہ اسکی گردن بہت
لمبی ہوتی ہے۔ غرض انھین دونون مین سے کسی خیال کی بنیاد پر اس کا نام
"عنقاء" قرار دیا گیا۔

لیکن یہ صرف نام کی بنا پر ہے۔ ورنہ یہ خیال اور اس قسم کا کوئی نہ کوئی
طائر ہر قوم کی دیومالا مین موجود ہے۔ قدیم مصریون نے اس قسم کے ایک خیالی طائر
کی تصویرین اپنی عمارتون پر بنائین اور اُس کی بڑی بڑی عظیم الشان مورتین تراشی
تھین۔ جس کا سر کہین آدمی کا سا کہین مینڈھے کا سا اور کہین عقاب کا بنایا
تھا دھڑ شیر کا اور اُس مین عقاب کے ایسے دست و بازو لگائے تھے۔

اسی طرح نسروس نام ایک طائر کی صورت اہل بابل کی دیومالا مین تھی جسے
وہ اپنا ایک زبردست دیوتا خیال کرتے تھے۔ اُنکے مذاق مین نسروس کا دھڑ آدمی
کا تھا۔ اور چونچ اور پر عقاب کے ایسے تھے۔ یونانیون اور رومیون کے عقائد
مین بھی اسی قسم کا مجمع الاضداد طائر موجود تھا جسے وہ گرِفون کہتے تھے۔ اس کا
دھڑ شیر کا اور چونچ اور بازو عقاب کے تھے۔ ہندوؤن کے اعتقاد مین بھی اسی قسم کا
ایک زبردست طائر موجود ہے جسے وہ گرڑ کہتے ہین۔ اُن کی دیومالا مین اگرچہ
اس طائر کے متعلق چوپاؤن یا انسان کا دھڑ تو نہین تجویز کیا گیا۔ مگر صرف عظمت
و قوت کے لحاظ سے اُسے بہت کچھ ترقی دی گئی۔ بتایا گیا کہ سری کرشن جی مع تمام
خاندان کے اُس پر سوار ہو کے سیر کرتے تھے۔ اور مہابھارت کے نامور سورما اُسی
پر سوار ہو کے میدان رزم مین آئے تھے۔ اسکے ساتھ اُس کا یہ بھی روحانی

کمال بتایا گیا کہ اُڑتے وقت اُس کے پروں سے مقدس وید کے اشلوک سُنے
ہیں۔ ایرانیوں میں بھی سیمرغ موجود تھا جسنے رستم کے باپ زال کی پرورش کی
اور وقتاً فوقتاً رستم کی مدد کو آیا کرتا تھا۔

اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ عربوں میں اس وہمی طائر کا خیال کس
قوم سے آیا۔ ظہور اسلام سے پیشتر اُن کا تمدن تین قوموں کے خیالات کا مجـ
تھا۔ اول عرب عاربہ جو آل قحطان کہلاتے تھے اور جن کا اصلی وطن ملک یمـ
تھا۔ اور در اصل یہی لوگ اصلی عرب تھے۔ دوسرے یہود جو حضرت اسماعیلؑ کے
زمانے ہی سے یہاں آنا شروع ہو گئے۔ جن سے اور قحطانیوں کے امتزاج سے
ایک نئی نسل پیدا ہوئی جو عرب مستعربہ کے نام سے مشہور تھی۔ اور اس گروہ
قائم ہو جانے کے بعد بھی موسوی آداب و تمدن کا بہت کچھ اثر عربوں پر پڑا ہوا
اور تیسرے ایرانی جو قدیم الایام سے اہل عرب کے ساتھ تعلقات رکھتے آئے تھے
جن سے پیشتر اُنھیں کے ملک میں سے صابئین جو حقیقۃً قدیم بابلی مذہب کے
پیرو تھے سارے عرب میں پھیل چلے تھے۔ ایرانیوں اور صابئین میں کسی ایسے
طائر کا خیال موجود ہونا خود اُن کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے۔ یہود کے مسلمات
میں بھی کوئی نہ کوئی ایسا طائر ضرور موجود ہوگا۔ اس لیے کہ گو اُن کی کتابوں میں
ڈھونڈھنے کی ہمیں نوبت نہیں آئی مگر عربی کہانیاں جو اسرائیلی روایتوں سے ماخوذ ہیں
اس کی شہادت دے رہی ہیں۔ باقی رہے اصلی عرب اور قحطانی اُن کے زمانے کی
کوئی کتاب یا تحریر موجود نہیں ہے۔ مگر زیادہ تر قیاس اسی طرف جاتا ہے کہ عربوں میں
عنقاء کا خیال اُنھیں لوگوں سے شروع ہوا۔ اس لیے کہ عنقاء کے جتنے خالص
عربی قصے کتب عربیہ میں نقل کیے گئے ہیں سب ملک یمن اور صنعاء ہی سے علاقہ
رکھتے ہیں۔

اتنی تاریخی تنقید کے بعد اب ہمیں بتانا چاہیے کہ اہل عرب کے نزدیک عنقاء
کیا چیز ہے؟ اُس کی صورت کیسی ہے؟ اور وہ کب اور کہاں پایا گیا؟ پریح الابر
سے صاحب حیوٰۃ الحیوان نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی
جو یقیناً بنی اسرائیل کی روایتوں اور کہانیوں سے ماخوذ ہے کہ "اللہ جل شانہ نے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک چڑیا پیدا کی جس کا نام عنقاء تھا۔ اسکے
جسم میں چاروں طرف چار بازو تھے۔ چہرہ آدمی کا سا تھا۔ اور خدا نے اُسے
ہر چیز میں سے کچھ نہ کچھ ضرور عطا فرمایا تھا۔ اور اُسکے لیے اُسی کا سا ایک نر بھی
پیدا کیا۔ پھر جناب موسیٰ پر وحی نازل کی کہ میں نے دو عجیب و غریب چڑیاں پیدا کی
ہیں اور اُن کا رزق اُن وحشی جانوروں کو قرار دیا ہے جو بیت المقدس کے گرد
رہتے ہیں۔ اسکے بعد اُن کی نسل بڑھنا شروع ہوئی۔ مگر جب حضرت موسیٰ کا
انتقال ہوگیا تو یہ طیور ارض فلسطین چھوڑ کے نجد میں چلے آئے۔ جہاں وحشی درندوں
کو کھاتے اور بچوں کو اُٹھائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت رب العزت نے بنی
عبس میں سے خالد بن سنان عبسی کو پیغمبر بنا کے مبعوث کیا۔ لوگوں نے اُن کی
خدمت میں حاضر ہو کے فریاد کی تو اُنھوں نے درگاہ خداوندی میں دعا کی۔ جس کا
یہ اثر ہوا کہ اس جانور کی نسل ہی فنا ہو گئی۔"

یہ تو وہ روایت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عنقاء کا خیال اہل عرب میں بنی
اسرائیل سے آیا۔ مگر دوسری روایتیں جن سے اس طائر کا وجود عرب عاربہ اور
قحطان میں ثابت ہوتا ہے۔ عربوں میں زیادہ مشہور ہیں۔ اور اُن روایتوں
کے ذریعے سے قوم رس کے زمانے میں اس طائر کا ظاہر ہونا بتایا جاتا ہے۔ پہلی
لکھا ہے کہ قوم رس کا مرکز شہر عدن تھا۔ اور جو قوم وہاں آباد تھی وہ قوم ثمود
کی باقیماندہ یادگاروں میں تھی۔ انھیں لوگوں کے زمانے میں عدن والوں کے
لیے پانی کے وہ قابل حیرت عظیم الشان حوض اور کنوئیں بنائے گئے جو آج تک
موجود ہیں اور جن میں بارش کا پانی پہاڑوں سے اُتر کے جمع ہوتا اور برس بھر
اہل شہر اور دیگر مخلوق کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اسی سرزمین میں اور اسی مذکورہ
قوم کے زمانے میں علامہ عکبری طائر عنقاء کا ظہور بتاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اُنکے
علاقے میں ایک پہاڑ تھا جو فتخ کہلاتا تھا اور اُس کی چوٹی زمین سے ایک میل اونچی
تھی (غالباً اس سے وہ مقام مراد ہے جہاں آج کل شہر مخا آباد ہے) اس پہاڑ پر
انواع و اقسام کے طیور رہا کرتے تھے جن میں عنقاء بھی تھا۔ یہ بہت بڑا قوی ہیکل
طائر تھا جس کا چہرہ آدمی کا ایسا تھا۔ اور دنیا میں جتنے جاندار ہیں اُن سب کی

اُس میں کوئی نہ کوئی چیز ضرور موجود تھی۔ باوجود اس عظمت کے یہ نہایت خوبصورت چڑیا تھی۔ اور اس پہاڑی پر ہر سال میں ایک مرتبہ آیا کرتی تھی۔ اور اسکے تمام طیور کا شکار کرلیا کرتی تھی۔ ایک سال یہ اتفاق پیش آیا کہ پہاڑ کی چڑیاں اُسکے لیے کافی نہ ہوئیں اور بھوک نے ستایا تو انسانوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ پہلے ایک لڑکے کو جھپٹ لے گئی۔ پھر ایک لڑکی کو اُٹھالے گئی۔ ان دنوں حضرت حنظلہ بن صفوان علیہ السلام موجود تھے جو قوم رس پر مبعوث ہوئے تھے۔ لوگوں نے اُن کی خدمت میں جاکے شکایت کی۔ حنظلہ نے بارگاہِ خداوندی میں دعا کی۔ جس کی مقبولیت یوں ظاہر ہوئی کہ عنقاء پر بجلی گری اور وہ جل بھن کے خاک ہوگئی۔

اسی مضمون کو تھوڑے اختلاف کے ساتھ علامہ قزوینی نے عجائب المخلوقات میں بھی بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "عنقاء سب سے بڑا طائر ہے۔ ہاتھی کو اس طرح اپنے پنجے میں اُٹھالے جاتا ہے جس طرح کہ چیل چوہے کو اُٹھالے جاتی ہے۔ اگلے دنوں یہ چڑیا آدمیوں میں رہتی تھی جنھیں اُس سے اذیت پہونچنے لگی۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ ایک دولھن کو جبکہ وہ زیور سے آراستہ و پیراستہ بیٹھی ہوئی تھی اُٹھا لے گئی۔ یہ حالت دیکھ کے حضرت حنظلہ نبی نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی۔ اور خدا نے اُسے وہاں سے اُڑا کے بحر اعظم کے کسی جزیرے میں پہونچا دیا جو خط استوا کے اُس پار ہے آدمیوں کا وہاں تک گذر نہیں ہوتا۔ اور بڑے بڑے وحشی جانور اور درندے وہاں کثرت سے ہیں جن کو شکار کرکے وہ اپنی زندگی بسر کرتی ہے۔ عنقاء جس وقت اُڑتا ہے اُسکے پروں سے گرج اور پانی کے دھڑ دھڑا کے گرنے کی سی آواز نکلتی ہے۔ اُسکی عمر دو ہزار برس کی ہوتی ہے۔ اور پانچ سو برس کا بچہ بالغ ہوتا اور انڈے دیتا ہے۔ اور انڈا دینے کے وقت اُسے نہایت سخت تکلیف ہوتی ہے۔ عرب لوگ عنقاء کو عنقاء مغرب کہتے ہیں۔ جسکی وجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انکے خیال میں اس کا اصلی وطن سرزمین مغرب ہے۔

یونانیوں میں ہم بیان کرتے ہیں کہ اس قسم کا ایک طائر مشہور ہے جو گرفون کہلاتا ہے۔ غالباً اُسی کا حال ارسطو نے اپنی ایک کتاب میں بیان کیا ہے جس سے عربی مصنفین کو اپنے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اور اُن واقعات کو اُنھوں نے عنقاء

کے تذکرے میں نقل کرلیا۔ ارسطو طالیس نے سب سے بڑھ کے یہ کمال کیا ہے کہ ... لنبا ہے" اس طائر کا شکار بھی کیا جاتا ہے۔ اور اُسکے پنجوں سے پانی پینے کے ... نہایت نفیس اور بڑے بڑے کانٹے بنائے جاتے ہیں۔" پھر خود ہی اُس کے شکار کی تدبیر بتاتا ہے کہ "لوگ دو بیل لاکے کھڑے کرتے ہیں اور اُن کے درمیان میں ایک ... بھاری تھیلا رکھتے ہیں جو دونوں جانب اُن میں باندھ دیا جاتا ہے اور اُسکے ... بہت بڑے بڑے وزنی پتھر بھر دیے جاتے ہیں۔ جن کا وزن بہت زیادہ ہوتا ہے اور اُس تھیلے کے سامنے ایک کوٹھری بنائی جاتی ہے جس میں کوئی آدمی چھپ کے بیٹھ رہتا ہے۔ اور وہ اپنے پاس آگ تیار رکھتا ہے۔ عنقاء اوپر سے گرتا ہے کہ اُن بیلوں کو جھپٹا مارکے اُڑا لے جائے۔ مگر وہ بیل اُن پتھروں کی وجہ سے نہیں اُٹھ سکتے۔ اور اُسکے پنجے اُن کے جسم میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی آدمی کوٹھری سے آگ لیے ہوئے نکلتا ہے اور اُسکے پروں میں آگ لگا دیتا ہے۔" ارسطو اس جانور کا حلیہ یہ بتاتا ہے کہ "اُس کا پیٹ بیل کے مثل ہوتا ہے اور ہڈیاں درندوں کی ایسی ہوتی ہیں۔"

ارسطو نے تو اس کے شکار ہی کی تدبیر بتائی تھی۔ مسلمان مصنفین میں سے بعض بزرگوں نے اُسے دیکھا بھی تھا۔ چنانچہ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں احمد بن عبد اللہ بن احمد فرغانی نے (جو ارض مصر میں آکے اقامت گزین ہو گئے تھے) اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ "خلفاء بنی فاطمہ مصر کے خاندان والوں میں سے عزیز بن نزار بن معز نے یہاں طرح طرح کے زندہ جانوروں کا ایک عجائب خانہ قائم کیا تھا۔ جس میں ایسے ایسے عجیب جانور لاکے جمع کیے گئے تھے جیسے کہ شاید اُس سے پیشتر کبھی نہ جمع کیے گئے ہوں گے۔ انھیں میں عنقاء بھی تھا۔ جو بلندی مصر کے علاقوں سے لایا گیا تھا۔"

عربوں میں اسی حیثیت و شان کا ایک جانور رُخ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ جس کا الف لیلہ میں ذکر آیا ہے۔ اور شاید وہ الف لیلہ ہی کی ایسی کہانیاں تھیں جن سے اخذ کرکے اُسکے حالات عجائب المخلوقات اور حیوٰۃ الحیوان میں درج کر دیے گئے ہیں۔ مگر اب عنقاء، سیمرغ، اور رُخ، ان تینوں ناموں کا مفہوم ایک

ہی خیال کیا جاتا ہے جو گورکھ کے پھول یا کسی ایسی چیز کے مترادف ہے جسکا وجود صرف خیالات مین ہو۔ اور ظاہری و مادی دنیا مین اُس کا کبھی پایا جانا نہ ثابت ہوتا ہو۔

تخلیق عالم اور نیچرل ہسٹری کے موجودہ محققین کی راے اب یہ قائم ہوتی جاتی ہے کہ انسان کی پیدایش سے پیشتر اور اُس کے ابتدائی دور مین کرۂ زمین ایسے ایسے عظیم الشان، عجیب وغریب اور خوفناک پرندون، چوپایون اور چھپکلی کے ایسے جانورون سے بھرا ہوا تھا جن کی نسلین باہمی لڑائیون اور خلقت کی کشمکش سے فنا ہو گئین۔ اُن مین سے بعض کی ہڈیون کے ڈھانچے بھی برفستانی مقامات مین پڑے مل گئے جو دُنیا کے بڑے عجائب خانون مین لا کے رکھے گئے ہین۔ ممکن ہے کہ اس قسم کی کوئی چڑیا اُس زمانے مین اور نوع انسانی کے بچپن مین موجود ہو۔ جس مین وہ پوری شان پائی جاتی ہو جو عنقا یا رُخ یا سیمرغ کی بتائی گئی ہے۔ فی الحال انسان نے زمین کے ہر ہر کونے کو چھان ڈالا اور ایسے کسی طائر کا پتہ نہین لگا۔ لہذا تجربہ اور مشاہدہ ہمین یہی کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ عنقا خارج مین نہین بلکہ صرف ہمارے ذہن اور ہمارے خیال مین ہے۔

گریک فائر یا نفطہ

جن دنون لڑائی کے میدانون مین توپون اور بندوقون کی آوازین نہین گونجی تھین۔ اور جانباز سپہگرون کو بارود کا استعمال نہین معلوم تھا۔ شمشیر و خنجر اور نیزون اور تیرون سے دشمن پر حملہ کیا جاتا تھا۔ اور گُرز و تبر کے ذریعے سے بہادر سورما اور سر بکف نبرد آزما جوش شجاعت ظاہر کیا کرتے تھے اُن دنون یکایک آتش باری کی ایک نئی اور نہایت ہی خوفناک ترکیب ظاہر ہوئی۔ اور لوگ گھبرا اُٹھے۔ اس آگ کا نام یورپ والون مین "گریک فائر" یا آتش یونان مشہور ہوا۔ اور عربون مین "نفطہ" یا روغن نفط"۔

اس بارۂ خاص مین یونان سے مراد پُرانا یونان نہین ہے جبکہ اُنکے ابتدائی تمدن اور اُنکے فلسفہ و حکمت کا عروج تھا۔ اور اُن مین لیکرغوس و سولن کے

مقنن۔ افلاطون اور ارسطو کے ایسے فلسفی اور فیلقوس و اسکندر کے ایسے بادشاہ پیدا ہو رہے تھے۔ نہین بلکہ یہ اُس یونان کا ذکر ہے جب قسطنطنیہ مین مشرقی سلطنت روم کے بعد یونانی مشرقی سلطنت قائم تھی جو کلیسا ے یونان کی حامی اور کلیساے روم کی دشمن تھی۔ جبکہ پوپ کو ان یونانی سلاطین سے عداوت تھی۔ اور یونانی پوپ کی عظمت و حرمت کو نہ مانتے تھے۔ غرض ان دنون اور ظہور اسلام کے بعد قسطنطنیہ مین پہلے پہل اس کا رواج مورخین یورپ کو نظر آیا۔ خود یونان والے اس آگ کو آتش یونان نہین کہتے تھے بلکہ وہ ایسے الفاظ سے یاد کرتے تھے جن کا ترجمہ ہے "آتش سیّال" اور "آتش بحری" مگر مورخین یورپ نے اسے "آتش یونان" کہنا شروع کیا۔ اس لیے کہ یورپ کو اس کا پتہ پہلے پہل قسطنطنیہ کی مشرقی سلطنت ہی مین لگا۔ پھر اسکے بعد صلیبی لڑائیون کے موقع پر جب یورپ کی تمام قومین لڑائی اور جہاد کے لیے شام۔ ارض فلسطین اور مصر مین آئین تو اُنھون نے ان ممالک کے قابض مسلمانون کو اس آگ کے برسانے مین نہایت ہی باکمال اور مشاق پایا۔

نفطہ کا استعمال خشکی کی لڑائیون اور نیز بحری معرکہ آرائیون مین یکسان طریقے پر کیا جاتا تھا۔ اور اسکے استعمال کے طریقے یہ تھے کہ قلعون اور شہرون کی فصیل پر سے تانبے اور سیسے کی پچکاریون مین بھر کے پھینکتے تھے یا لوہے اور پتھر کی دیگچیان بھر بھر کے دشمن کی طرف پھینکتے تھے۔ جہازون مین عموماً تانبے کی پچکاریون کا رواج تھا۔ جو چارون طرف لگا دی جاتی تھین۔ اور اُنکے دہانے دشمن پر ہیبت بٹھانے کے لیے اژدہون، اگرمچھون، شیرون اور دیگر مہیب جانورون کے ایسے بنے ہوے ہوتے تھے۔ چند روز بعد اس مین یہ ترقی کی گئی کہ یہ آگ بن جانے والا رقیق روغن لاکھ یا موم ملا کے موم سا بنا لیا جاتا۔ اور حملے کے وقت تیرون اور برچھون کے پھلون مین چپکا دیا جاتا۔ پھر جب تیر پھینکے جاتے اور نیزے گھما کے مارے جاتے تو حرکت کی گرمی اور ہوا کے اثر سے فوراً مشتعل ہو جاتے اور کسی کے بدن مین چھو بھی جاتے تو جلا کے خاک کر دیتے۔

ہوا مین پھینکنے سے اسے جو حرکت خط قوسی کی وضع پر ہوتی وہی اس کے

مشتعل کر دینے کے لیے کافی تھی - ہوا مین چڑھتے ہی بڑے زور سے پھٹنے کی ایک
آواز بلند ہوتی - سخت غلیظ دھوان نمودار ہوتا - اور ساتھ ہی شعلہ پیدا ہو جاتا
ژوان ویل مورخ جو فرانس کے بادشاہ لوئی نہم کے ساتھ صلیبی جہاد کے لیے ارض
مقدس مین آیا تھا اُسکے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صلیبیون پر سب سے بڑی آفت
یہی نفط تھا - جس سے وہ بالکل آشنا نہ تھے - وہ لکھتا ہے "یہ آگ رات کو برسا
جاتی تو سارا کیمپ روشن ہو جاتا - لوگ گھبرا گھبرا کے اوندھے منہ گر پڑتے - آستینو
سے منہ چھپا لیتے - یعنی اس ہولناک منظر کے دیکھنے کی جرأت نہ ہو سکتی - اور دعا ک
کہ خدایا بچا - ہوا مین اس وضع و شان سے اُڑتی دکھائی دیتی کہ معلوم ہوتا جیسے
کوئی پردار اور لمبی دُم کا آتشین اژدہا اُڑتا چلا آتا ہے - رعد کی کڑک اور بجلی
چمک دونون چیزین اُس مین موجود ہوتین - اور اندھیری رات مین ایک ہیبت
روشنی عالم پر چھا جاتی -

فرانسیسی مورخ جونت فرانسو امشو اپنی تاریخ صلیبی مین لکھتے ہین "صلی
کو اس مہیب آگ کی صورت پہلے پہل نظر آئی تو نائٹ لوگ بدحواسی کے ساتھ دو
کہ اپنے چوبی برجون کو بچا لین - بعض نے اپنے مددگارون کو پکارنا شروع کیا - او
لوگ زمین پر گر پڑے یا گھٹنون پر جھک کے درگاہ الٰہی مین التجائین کرنے لگے - خ
لوئی نہم بھی اپنے امرا اور نائٹون سے کم مرعوب و ہیبت زدہ نہ تھا - اور جیسے
اُس نے گریک فائر کے پھٹنے کی گرج سنی آنکھون سے آنسو جاری ہو گئے - اور وہ
اُٹھا" خداوندا! اے عیسیٰ مسیح! مجھے اور میرے ساتھیون کو بچا!"

مسٹر گبن کے بیان کے مطابق اُسی زمانے کا ایک نائٹ جو مسلمانون کی بہا
کا نہین قائل تھا اور اُنکے اسلحہ کی نہایت توہین و تحقیر کیا کرتا تھا مگر آتش یونا
کی نسبت نہایت سادگی کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ "جن منجنیقون سے نفطہ ک
پچکاریان ماری جاتی تھین اُنکی صورت دیکھ کے یا اُن کی آواز سن کے میرا او
تمام ساتھیون کا دل دہل جایا کرتا تھا"

مگر یونانیون کی شرقی سلطنت قسطنطنیہ مین اس کا رواج اس سے بہت
تھا - اس لیے کہ گبن اور دیگر مورخین بیان کرتے ہین کہ قسطنطنیہ پر عربون نے

ابتدائی دو حملے جناب معاویہ اور ولید بن عبد الملک کے عہد مین کیے تھے اُن مین
اسی آتش یونان کی وجہ سے مسلمانون کو شکست ہوئی - اور مشرقی قیاصرہ کے
زمانے مین اُنھین حوصلہ شکن ناکامیان ہوئی تھین - لہذا یورپ کے مورخین مسرت ظاہر
کرتے ہین کہ مسیحیون کی اُنھین دو فتحون کی بدولت یورپ عربون کی اطاعت سے
محفوظ رہ گیا - صرف اسی قدر نہین بلکہ عربون کو مغلوب کرنا یا انکی رفتار ترقی کو
روک دینا اُس زمانے مین اتنی بڑی حیرت انگیز اور خلاف اُمید کامیابی تھی کہ
سارے فرنگستان اور کل مغربی ممالک یورپ مین قسطنطنیہ کی شرقی سلطنت کی
دھاک بیٹھ گئی - اور سب اُس سے ڈرنے اور کانپنے لگے - جس رعب کا اصلی اور
قوی باعث یہی آتش یونان تھی -

چونکہ قسطنطنیہ کی عظمت کا سارا دارومدار اسی پر قرار پا گیا تھا لہذا اس کے
نسخے اور اسکے استعمال کی ترکیب کو وہ لوگ ایک نہایت ہی مخفی راز سلطنت
کی طرح چھپاتے تھے - قرب وجوار کی دوست اور معاہد سلطنتون کو ضرورت کے وقت
بڑی بڑی منجنیقین، فوجین، اور بہت سے جہاز عاریۃً دیدیے جاتے تھے
مگر یہ ممکن نہ تھا کہ گریک فائر کی پچکاریان یا اس کا سامان کسی قریب سے قریب
دوست کو بھی عاریت دیا جاتے - اس رازداری پر مذہب نے اپنا رنگ
جمایا - اور مقتدایان دین سے روایتین تصنیف کر لین - چنانچہ خود سلطنت شرقی
ظاہر کرتی تھی کہ "گریک فائر کا راز ایک فرشتے کے ذریعے سے خاص قسطنطین
اعظم کو بتایا گیا تھا - اور بتانے سے پہلے اُس سے شرط کرا لی گئی تھی کہ اس برکت
الٰہی اور رحمت خداوندی سے کوئی اور شخص عام اس سے کہ دوست ہو یا
دشمن ہرگز نہ مطلع کیا جائے" نتیجہ یہ تھا کہ بادشاہ اور رعایا سب کے سب
مذہبی احکام کے ذریعے سے مجبور کیے گئے تھے کہ اس بارۂ خاص مین اپنی زبان
کو ہمیشہ کے لیے بند رکھین - اور اگر کوئی اس حکم سے انحراف کرتا تو اُسکے لیے
دینی اور دنیاوی دونون طرح کی سخت سزائین تجویز کی گئی تھین - بلکہ اس سے
بھی بڑھ کے یہ اندیشہ دلایا جاتا تھا کہ اگر کوئی شخص اس جرم کے ارتکاب کا ارادہ
بھی کرے گا تو ملک و قوم پر خدا کا غضب نازل ہو جائے گا - الغرض رازداری

کی ان تاکیدون کا یہ اثر تھا کہ کچھ اوپر چار سو برس تک یہ راز قسطنطنیہ والون
مین محفوظ اور قسطنطنیہ کی چار دیواری کے اندر محدود رہا۔

اس کا نسخہ اگرچہ مکمل طور پر نہین بتایا گیا ہے مگر انسائیکلوپیڈیا اور [illegible]
گبن کی تحریرون کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُس کا جزوِ کامل تو یہی رو غن
نفط ہے جسے ہم مٹی کا تیل کہتے ہین اور جو اب ہمارے گھرون مین اور ہمارے
لیمپون مین کثرت سے جلا کرتا ہے۔ اس مین کچھ حصہ گندھک کا ملایا جاتا تھا
صنوبر کا گوند بھی پڑتا تھا۔ اور غالباً کچھ اور اجزا بھی ہون۔

یورپ والون کا عام خیال ہے کہ اس کا نسخہ سب کے پہلے گیارہوین صدی
عیسوی کے آخر مین شہر پیسا والون نے جو اُن دنون سب سے بڑے جہاز ران خیال
کیے جاتے تھے یونان والون سے چُرا کے حاصل کر لیا۔ اور اسی کے قریب زمانہ
مین مسلمانون نے بھی خواہ چُرا کے معلوم کیا یا خود ہی ایجاد کر لیا۔ اور صلیبی لڑائیون
مین اسے اس کمال کے ساتھ کام مین لانے لگے کہ جس حربے سے معاویہ اور [illegible]
کے زمانون مین اُنھون نے قسطنطنیہ کی دیوارون کے نیچے شکست کھائی تھی اُ[illegible]
حربے سے حملہ آور صلیبیون کو پسپا کیا

گر غور کرنے اور تحقیق و تنقید سے کام لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے مین
محقق مورخان مغرب سے سخت غلطی ہو گئی ہے۔ اول تو انسائیکلوپیڈیا کے بیان
سے ظاہر ہوتا ہے کہ "گریک فائر کا استعمال زیادہ قدیم زمانون مین بھی پایا جاتا ہے
برٹش میوزم مین اسیریا والون کی جو یادگارین موجود ہین اُن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ
بھی اس کا استعمال جانتے تھے"۔ کتاب "لیٹن کنگڈم آف جروسلیم" کے مصنف مسٹر
کانڈر بھی لکھتے ہین کہ "آتش باری کی یہ ترکیب وسط ایشیا کے مغلون اور یونانیون
کو مدت ہاے دراز سے معلوم تھی"۔

لیکن اس مین شک نہین کہ قدیم الایام والون کی اس سخت آتش باری
کے مفصل و مشرح حالات بالکل ہمین نہین معلوم ہو سکتے اور نہ ہمین یہ تیقن ہو سکتا
کہ وہ اسی نفطے کے ذریعے سے آتش باری کرتے تھے یا کسی اور طریقے سے۔ قرون [illegible]
اور تحقیق و تنقید کے زمانے مین یورپ والے اسے قسطنطنیہ ہی کے محاصرون [illegible]

[illegible] تے ہین۔

غور طلب یہ امر ہے کہ یونانیون کو اس کا نسخہ کیونکر معلوم ہوا۔ آیا اُنھون نے
اسے ایجاد کیا یا کسی اور شخص سے حاصل کیا؟ اس سوال کا جواب مسٹر گبن سے یہ
[illegible] ہے کہ کالی نیکوس نام ایک شامی نژاد شخص جو شہر بعلبک کا رہنے والا اور
مسیحی المذہب تھا خلیفۂ اسلام کی ملازمت چھوڑ کے قسطنطنیہ چلا گیا۔ اور شہنشاہِ
یونان کی ملازمت اختیار کر لی۔ اُس شخص سے پہلے پہل یونانیون کو یہ نسخہ ہاتھ لگا۔
جس نے یا تو خود ایجاد کیا تھا یا کسی اور سے سیکھا۔ یہ خیال غالباً غلط ہے۔ کالی
نیکوس کو عرب لوگ توقا بن قسطا کے نام سے یاد کرتے ہین جو سلیمان بن عبدالملک
کے عہد مین قلمرو اسلام سے ناراض ہو کے چلا گیا تھا۔

میو شو نے اپنی تاریخ کے ضمیمہ جات مین سوانحعمری سلطان صلاح الدین مصنفہ
[illegible] "کے ایک قلمی نسخے سے نفطے کے حال مین کچھ کیفیت نقل کی ہے۔ اُس
مین بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ پُرانے یونانیون مین ایک ایسی ہی چیز موجود تھی مگر اسکو
اس آخر وقت کی آتش یونان سے کوئی علاقہ نہین۔ جو قسطنطنیہ مین عربون کے
محاصرے کے وقت ظاہر ہوئی۔ مسیحی لوگ صرف اس بنیاد پر اسے آتش یونان
کہنے لگے کہ تاثیر اور کیفیت مین دونون ملتی جلتی تھین۔ اس مین کالی نیکوس کا صرف
اتنا حال بتایا گیا ہے کہ قسطنطین پوگوناطوس کے عہد مین اُس نے اسکے استعمال کی
[illegible]ین اور منجنیقین تیار کرائین۔ اور تانبے کی پچکاریان بنائین۔ جن کے ذریعے سے
دشمنون پر پھینکی جا سکتی تھی۔ اسکے بعد وہ اُسی مین لکھتا ہے کہ "ابن المجاس
نام ایک شخص نے (جو بالکل مسلمانون کا سا نام ہے) اسے بالکل نئی صورت سے
ایجاد کیا۔ افسوس کہ ہم کو عربی اور انگریزی دونون زبانون کی کتابون سے
پتہ نہین لگ سکا کہ یہ ابن المجاس کون شخص ہے۔ مگر میو رینو دستے جس طرح ابن
المجاس کا نام بتایا ہے اُسی طرح یہ بھی نئی بات کہی ہے کہ "اس کے نام کے متعلق
مختلف قومون کو سخت دھوکا ہوا۔ یعنی یونان والے تو اسے مسلمانون کی آگ کہتے
تھے۔ لاطینی مسیحی اسے یونانیون کی آگ کہتے تھے۔ اور اہل شرق نفطہ کہتے تھے"۔
ابن المجاس کا پتہ لگانے سے تو ہم عاجز ہین۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ کالی نیکوس

کون شخص تھا اور کس عہد میں تھا۔ ہیٹن کی بیاگرفیکل ڈکشنری میں اسکا صرف اتنا حال لکھا ہے کہ "وہ فن عمارت کا ایک قدیم ماہر تھا۔ جس نے آتش یونان کو ایجاد کیا۔ اور اس کا نسخہ راز کے طریقے پر قسطنطین ثالث ملقب بہ پوگوناطوس کو بتا دیا۔ جس نے اس کے استعمال سے عربوں کے جہازوں کے بیڑے کو ۶۷۳ء میں جلا دیا۔ وہ قلمرو مصر کے شہر ہلیو پولی میں پیدا ہوا تھا" ہلیو پولی ارض شام کے شہر بعلبک کو کہتے ہیں۔ اس لیے یہ غلط ہے کہ وہ مصر کا رہنے والا تھا۔ بلکہ دیگر مصنفین اور خود شہر بعلبک دونوں تصدیق کر رہے ہیں کہ کالی نیکوس ایک شام کا مسیحی المذہب شخص تھا۔ مسٹر گبن لکھتے ہیں اور یہی انسائیکلوپیڈیا میں بھی ہے کہ وہ خلیفہ اسلام کی ملازمت چھوڑ کے قسطنطنیہ چلا گیا تھا اور قسطنطین ثالث کی ملازمت اختیار کی تھی جو ۶۶۸ء میں مشرقی سلطنت کے تخت پر بیٹھا تھا۔ یہ زمانہ خلافت اسلامی کی تاریخ میں جناب معاویہ کا تھا۔ لہذا یہ سمجھنا چاہیے کہ کالی نیکوس حضرت معاویہ کی نوکری چھوڑ کے گیا ہوگا۔ اور گریک فائر کی ایجاد بھی اسی دور میں ہوئی۔ مسلمان مورخین اپنی تحریروں میں کہیں اس بات کا پتہ نہیں دیتے کہ انھیں قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے یا اس کے قریب کے سمندر میں جو شکستیں ہوئیں ان میں دشمنوں کی طرف سے آتشباری کی گئی تھی۔ اور وہی آتشباری باعث شکست ہوئی۔ تاہم مغربی مورخین میں یہ واقعہ انتہا سے زیادہ مشہور ہے۔ اور ہم اسے تسلیم کیے لیتے ہیں۔

لیکن یہ کیونکر تسلیم کیا جائے کہ کالی نیکوس ہی نفطے کا موجد تھا؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ بعلبک میں اس نے نفطے کو مسلمانوں سے سیکھا ہو؟ اور قسطنطنیہ پہونچ کے جب دیکھا ہو کہ تمام لوگ اس سے ناواقف ہیں تو موجد کی حیثیت سے اس نے لوگوں کو اسکی تعلیم کی ہو؟

یورپ والے سمجھ رہے ہیں کہ اسکے بعد بہت صدیوں تک نفطہ کا استعمال قسطنطنیہ والوں میں ایک راز سربستہ رہا۔ کسی کو اسکی خبر نہ تھی۔ اور مسلمانوں میں بھی اس کا استعمال پہلے پہل صلیبی لڑائیوں کے وقت دیکھا گیا۔ لیکن ہمارے پاس اسکی کافی شہادتیں موجود ہیں کہ کالی نیکوس کے زمانے کے قریب ہی مسلمان لوگ کامیابی کے ساتھ نفطہ کا استعمال کر رہے تھے۔

چچ نامہ اور میر معصوم بھکری کی تاریخ سندھ میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ ۷۱۲ء مطابق ۹۳ھ کے قریب یعنی جناب معاویہ کے ۳۹ برس بعد جب سندھ میں محمد بن قاسم اور راجہ داہر سے مقابلہ ہوا تو مسلمانوں کی طرف سے نفطہ کے ذریعے سے آتشباری کی گئی۔ راجہ داہر جس ہاتھی پر سوار تھا اس پر عربوں نے حقہ ہائے آتش بازی (آگ کے بھرے ہوئے ظروف) برسائے۔ چچ نامے کے دو نسخوں میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ "محمد بن قاسم کے ہمراہ نو سو تیر انداز تھے جو تیروں کے ذریعے سے حریف پر نفطہ برسا کے آگ لگاتے تھے۔" میر معصوم کی تاریخ کا ممکن ہے کہ اعتبار نہ کیا جائے۔ مگر چچ نامے کے بیان پر شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلیے کہ مسٹر ایلیٹ کے نزدیک بظن غالب وہ کتاب ۸۵۳ء مطابق ۲۳۹ھ سے پہلے کی تصنیف ہے۔

اسی زمانے اور اسی پایہ کی ہم ایک اور شہادت بھی پیش کر سکتے ہیں۔ جس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عرب لوگ نفطہ کے استعمال کو اون دنوں جانتے تھے بلکہ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ صرف وہی اپنے آپ کو اس فن کا مالک خیال کرتے تھے۔

تاریخ یعقوبی مطبوعہ لیڈن میں ہے کہ جنید بن عبد الرحمن مری نے (جسے خلیفہ ہشام بن عبد الملک کے عہد ۱۰۷ھ (۷۲۶ء) میں بصرے کے گورنر جنرل خالد قسری نے والی سندھ مقرر کرکے بھیجا تھا) چین کے ایک مضبوط قلعے کا محاصرہ کیا۔ ایک زمانے تک سرگرمی دکھاتے رہے جب کامیابی نہ ہوئی تو اس نے روغن نفط برسانا شروع کیا۔ لیکن اسے یہ دیکھ کے حیرت ہوگئی کہ اس آگ اور روغن کے شعلوں کو قلعے والے فوراً بجھا دیا کرتے تھے۔ جنید نے ذرا تامل کرکے کہا معلوم

* چین سے مراد ہنری ایلیٹ کی تحقیق میں شہر چیناپٹ ہے جہاں کنشک نے اپنے چینی کفیلوں کو رکھا تھا۔ یہ شہر پنجاب میں دریائے بیاس سے مغرب جانب دس میل کے فاصلے پر تھا چینی سیاح ہیون تسانگ نے ۶۳۵ء اور ۶۹۹ء کے درمیان میں اسے دیکھا تھا۔ اور چودہ مہینے تک وہ ...ان رہا۔ سر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے خیال کے مطابق حملۂ عرب کے زمانے میں یہاں ایک حکومت قائم تھی جس کے فرمان رووا کو عرب بادشاہ چین کہتے تھے۔

ہوتا ہے اس قلعے مین کچھ عرب لوگ بھی موجود ہین - اس لیے کہ بغیر انکی تعلیم کے یہ
آگ نہین بجھ سکتی - اس شبہے کی وجہ سے اُس نے محاصرے مین اور سختی کی - آخر
قلعے والون نے عاجز آ کے پیغام صلح دیا - اور اطاعت قبول کی - بعد تکمیل معاہدہ ضنید
قلعے مین داخل ہوا اور ہر طرف تلاش کرنا شروع کیا تو واقعی دو عربی الاصل
شخص ملے - اور تفتیش سے ثابت ہو گیا کہ اُنھین کی حکمت سے وہ آگ بجھائی گئی
تھی - ان دونون کی اس قومی نمک حرامی پر ضنید کو سخت غصہ آیا - اور اُنھین
قتل کر ڈالا ؎

اب اس تصدیق کے دیکھنے کے بعد شبہہ نہین کیا جا سکتا کہ عرب لوگ اس فن
مین اپنے آپ کو یکتا اور فرید عصر خیال کرتے تھے - اور اُنکے علم مین بھی نہ تھا کہ نفط
کا استعمال اُنکے سوا کوئی اور بھی جانتا ہے - اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یونانیون کی طرح
اُنھین بھی اسکے مخفی رکھنے مین اہتمام تھا - چنانچہ سر ڈلیٹ کو بھی اپنی تاریخ ہند
مین یہ لکھ دینا پڑا کہ ”اگر یہ سچ ہے تو آہر کی لڑائی (۷۱۲ء) پہلا موقع ہے جبکہ
عربون نے نفط یا آتش یونان کا استعمال کیا -

ان تمام واقعات کے ملانے سے نفط کی ایجاد کے متعلق جو صحیح اور قابل وثوق
رائے قائم کی جا سکتی ہے یہ ہے کہ روغن نفط کے کنوؤن کے گرجستان اور عراق مین
موجود ہونے کے باعث اس کا نسخہ قدیم بابلیون اور مغلون کو مدت ہاے دراز سے
معلوم تھا - اُن سے مسلمانون نے اپنے ابتدائی عہد مین اخذ کیا اور ترقی دینے لگے -
اسی اثنا مین اُنکے ملک کا ایک مسیحی شخص اس نئی چیز کا حال دریافت کر کے قسطنطنیہ
مین بھاگ گیا - اور وہان کی حکومت کو اُس سے مطلع کر دیا - قسطنطنیہ والے اسے
اُسی کی ایجاد سمجھے - اور ایک نعمت ربانی تصور کر کے اُسے چھپانے لگے -

عربون نے چند روز بعد اُسے اپنے فوجی حربون مین شامل کر لیا - اور دشمنون
کے مقابل کام مین لانے لگے - یورپ والون کو جو اُن دنون مشرقی دنیا کے حالات سے
بالکل ناواقف تھے اسکی خبر نہ ہونے پائی - اور سمجھتے رہے کہ یہ چیز قسطنطنیہ والون ہی کی
ایجاد ہے - مگر جب صلیبی لڑائیون کے زمانے مین اُولوالعزمی سے کام لے کے شام
و فلسطین مین آئے تو مسلمانون کو نفط کے ذریعے سے آتش باری کرتے دیکھ کے ہکا بکا

رہ گئے -

عربون کا سب سے بڑا کمال اس بارۂ خاص مین وہ تھا جسے ہم اس سے پیشتر
دلگداز کے ایک نمبر مین بتا چکے ہین کہ عکہ کے محاصرے کے وقت اُنھون نے اسکی
قوت اتنی بڑھا دی کہ جو چیزین آگ نہین پکڑتین اُن مین بھی اس کے خوفناک اثر
کو قائم کر دیا - اور وہ برج جلا کے خاک کر دیے جو بڑے اہتمام کے ساتھ فائر پروف
بنائے گئے تھے اور جن پر آگ سرایت ہی نہ کر سکتی تھی - نفط مین قیامت کی یہ
بات تھی کہ اسکی آگ پانی سے بجائے بجھنے کے اور مشتعل ہوتی تھی - سمندر اور تالاب
کی سطح پر وہ اسی طرح مشتعل رہتا تھا جس طرح کسی لکڑی کی چیز پر مشتعل ہو - اور
اس کی بجھانے والی صرف تین چیزین تھین - بالو - پیشاب اور سرکہ - جن لوگون
کو یہ اجزا نہ معلوم ہوتے وہ اس کے بجھانے سے عاجز تھے -

مغربی یورپ والون اور فرنگیون کو اس کا نسخہ یونانیون اور قسطنطنیہ
والون سے نہین حاصل ہوا - بلکہ صلیبی لڑائیون کی بدولت اُنھین یہ چیز مسلمانون
سے ہاتھ لگی - مسٹر کانڈر اپنی کتاب لیٹین کنگڈم آف جروسلیم مین لکھتے ہین کہ
فرانس کا بادشاہ فلپ دوم تھوڑا سا روغن نفط عکہ سے واپس جاتے وقت
اپنے ساتھ لیتا گیا تھا - جس کی مدد سے وطن پہونچ کے اُس نے شہر ڈی اپ کی
لڑائی مین انگریزون کا پورا بیڑا تباہ کر دیا - مگر پھر بھی مدت ہاے دراز تک
فرانسیسیون کو اس کے بنانے کی ترکیب نہین معلوم تھی - اور انسائیکلو پیڈیا
برٹانکا مین ہے کہ ۱۷۵۵ء مین دو فرانسیسی شخصون نے جن کے نام گوبر اور ڈوپرے
تھے اس آتش سیال کا از سر نو پتہ لگا لیا تھا - مگر وہ بھی اُس کے شائع کرنے
سے روکے گئے -

لیکن اسی نفط کے نسخے اور استعمال نے انسان کو بارود کا نسخہ بتا دیا جیسے
ظاہر ہوتے ہی دنیا کا فن جنگ ہی بدل گیا - اور وہ آتش سیال اسکے مقابل
دشوار اور دقت طلب ہونے کے باعث ایسی مٹی کہ آج دنیا مین شاید کوئی صحیح نسخہ
جاننے والا بھی نہ موجود ہوگا - بارود کے متعلق ہم کسی اور موقعے پر بحث کرین گے -
لہذا اس بحث کو یہین پر ختم کرتے ہین -

ریش مقدس

انسان کی متلون مزاجیوں کی جس قدر مکمل تصویر ڈاڑھیوں کو دیکھ کے نظر آتی ہے ہم اور کسی جگہ نہیں دیکھ سکتے۔ تمام حیوانات خاص کر طیور میں پوری طرح نمایاں ہے کہ قدرت نے نر و مادہ میں کچھ نہ کچھ امتیاز ضرور رکھا ہے۔ نر کو بعض قسم کے پر و بال زیادہ دیے ہیں۔ جن میں طرح طرح کی رنگ آمیزی اور حیرت انگیز چمک دمک ہوتی ہے اور مادہ کی دلفریبی اور دلکشی میں چاہے کتنا ہی جذب و اثر ہو مگر غیر جنس کی نظر میں نر کی زیبائی و رعنائی مادہ سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم اپنے شوق اور اپنے تقاضائے نفس سے عورتوں کو زیور پہناتے اور اُنھیں ہر قسم کے سامانِ زینت سے آراستہ کرتے ہیں۔ مگر قدرت نے اپنا خوشنما اور نظر فریب زیور نر ہی کو پہنایا ہے۔ اسی قدرتی زیور میں سے ایک ڈاڑھی بھی ہے جو قدرت کی جانب سے مرد کو دی گئی ہے۔ لیکن مرد نے بجائے قدر کرنے کے اس زیور میں ایسی ایسی قطع و برید کی اور اس میں ترمیم و تغیر کر کے ایسی ایسی وضعیں بنائیں کہ حیرت معلوم ہوتی ہے۔

ابتدائی زمانے میں جبکہ انسان نے زیادہ ہاتھ پاؤں نہیں نکالے تھے اور جب تک نہ اُسترا ایجاد ہوا تھا نہ قینچی نہ کنگھی تھی نہ آئینہ۔ ڈاڑھیاں اپنی اسی اصلی حالت پر رہیں۔ جیسا کہ خدا نے اُنھیں بنایا تھا۔ توراۃ کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے منہ پر اچھی خاصی ڈاڑھی تھی۔ جو بظن غالب جھنڈولی اور ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ پاپایان روم کے ایوان میں حضرت آدم کا ایک پرانا سنگی تابوت رکھا ہے جس پر آپ کی ایک تصویر بھی ترشی ہوئی ہے۔ اُس میں بھی سنگتراش نے آپ کی اسی وضع کی ڈاڑھی تراشی ہے۔ روایت توراۃ کی بنا پر یہود نے اس سنتِ آدمی کو اپنا اخلاقی قانون بنا لیا تھا۔ اور ہر یہودی کے منہ پر لمبی چوڑی مقدس ڈاڑھی ضرور ہوا کرتی تھی۔ اور اُنکا اعتقاد تھا کہ ڈاڑھی کی جس قدر خدمت کی جائے اُسی قدر ثواب ہوتا ہے۔ کیونکہ ڈاڑھی خدا کی ایک متبرک ودیعت ہے۔ یہود کو اپنی داڑھیوں سے جس قدر محبت تھی اُس کا پتہ اس سے لگ سکتا ہے کہ مصر میں باوجودیکہ فراعنہ اور قبطی ڈاڑھی مُنڈاتے تھے اُن لوگوں

کو گویا ڈاڑھی سے عناد سا تھا مگر یہود نے اُنکی وضع کو ہرگز اختیار نہ کیا۔ اور صدیوں کی غلامی کے بعد بھی اپنی ڈاڑھیاں بچا کے نکل آئے۔ یہود ہی پر منحصر نہیں۔ اگلے زمانے کے اکثر شریف قوموں میں ڈاڑھی شرافت و عزت کا مرکز خیال کی جاتی تھی۔ سچے آدمی کے لیے ایک متبرک و محترم چیز اور مرد کی مردانگی کا تمغہ اور اُس کی شرافت و عزت کا مظہر خیال کی جاتی تھی۔ سچے آدمی کے لیے راست بازی کی نمایاں علامت ڈاڑھی ہی تصور کی جاتی تھی۔ کوئی شخص کسی بڑے کام کا حوصلہ کرے اور کسی دشواری کے مقابلے پر جائے تو اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہتا "انشاء اللہ!" کوئی کسی سے پناہ مانگے اور اپنے آپ کو امان میں دینا چاہے تو اُس کی ڈاڑھی کو ادب و نرمی سے چھو لیتا۔ چنانچہ تاریخ توراۃ کا بہادر یوآب اپنے حریف امسا کے سامنے گیا تو فریب کی راہ سے اس کی ڈاڑھی چھوی اور کہا "بھائی اچھے ہو؟" امسا اس فقرے میں آکے غافل ہو گیا اور یوآب نے اپنی تلوار اُسکے سینے میں بھونک دی۔ بچے۔ عزیز و اقارب۔ اور دوست احباب اپنے محترم عزیز یا دوست کی ڈاڑھی کو تعظیماً آہستہ سے ہاتھ لگاتے تو سمجھا جاتا کہ وہ نہایت ہی محبت و عزت سے پیش آئے۔ لیکن اگر کوئی شخص گستاخانہ حیثیت سے کسی کی ڈاڑھی پر ہاتھ ڈال دے تو سمجھا جاتا کہ اُس نے اُس کی سخت توہین کی۔ مصر میں فراعنہ اور امرائے قبط اگرچہ سب کے سب ڈاڑھیاں مُنڈاتے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے ذہن میں ڈاڑھی کی قدر و منزلت کا خیال ضرور موجود تھا۔ چنانچہ بڑی عید دن اور خاص تیوہاروں میں فراعنہ مصنوعی ڈاڑھیاں منہ پر لگا لیا کرتے تھے جیسا کہ اُن کی تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور مردہ دیوتاؤں کے چہرے پر بھی نوکیلی ڈاڑھیاں بنایا کرتے تھے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانے والے فرعون کی ڈاڑھی موتیوں سے گُندھی رہتی تھی۔

ادھر مشرق میں بھی ڈاڑھی کی قدر تھوڑی نہ تھی۔ شاہان فارس ڈاڑھی کے اوپر جو فولادی ریش پوش لگاتے اُسے سونے کے تاروں سے کستے تھے۔ اور زبردست تاجداران نینوا اپنی گھونگھر دار ڈاڑھیوں میں تیل ڈال کے اور کنگھی کر کے بڑے بناؤ سے گھر سے باہر نکلا کرتے تھے۔ اگلے دنوں یہ بھی نظر آتا ہے

کہ بعض ملکون اور سلطنتون مین محض ڈاڑھی کے باعث لڑائی چھڑ گئی اور بڑی بڑی
خونریزیان ہوئین۔ تاتاریون اور ایرانیون اور چینیون اور تاتاریون مین صرف
اس اختلاف کے باعث لڑائی ہوئی کہ ایک قوم کہتی تھی ڈاڑھی مونڈی جائے
اور دوسری کا دعوےٰ تھا کہ مونڈی نہ جائے بلکہ اُسکے بال اُکھاڑے جایا کرین
یونانیون اور رومیون مین بھی ابتداءً سب کے مُنہ پر ڈاڑھی ہوتی تھی
اُنکے تمام فلسفی اور بڑے بڑے مشاہیر ڈاڑھی والے تھے۔ مگر حضرت مسیح
سے تین سو برس پیشتر جب مقلیہ (سسلی) کے نائی وہان پہونچے تو لوگون نے ڈاڑھی
کو خیرباد کہنا شروع کیا۔ لیکن اب جو ڈاڑھیون کے مُنڈنے کا رواج ہوا تو اس
شدت سے کہ "باربرس" کا لفظ جسکے معنی ڈاڑھی والے کے ہین تمام وحشی قومون
اور اُن جماعتون کی نسبت استعمال کیا جانے لگا جو اُنکے حلقۂ اثر سے باہر تھین
مگر پھر بھی اُن مین ڈاڑھی کی عزت کا اس قدر خیال ضرور موجود تھا کہ جو شخص عاقل
و بالغ ہوتا اور جسے مرد آدمی کہنا چاہتے تو "باربٹوس" یعنی صاحب ریش کہتے
اور اسی کا اثر تھا کہ اُنکے نوخیز امرد لڑکے روز ٹھڈی مین تیل ملا کرتے کہ جلد ہی
ڈاڑھی نکلے۔ اور ہمارا شمار قوم کے بڑون مین ہو۔ زمانۂ مابعد کے بعض قیاصرہ
اور سلاطین کے مُنھون پر بھی ڈاڑھیان تھین۔ اُنکے مصنفین ہومر۔ ورجل۔ پلینی
پلوٹارک۔ اسٹرابو۔ ڈیوڈورس۔ جوونل۔ اور پرسیوس نے ڈاڑھی کے متعلق اتنے
مباحث لکھے ہین کہ اگر اُنکو جمع کیا جائے تو اچھا خاصہ لٹریچر تیار ہو جائے۔ یہ سب
تو ڈاڑھی رکھنے کے مؤیدین مین تھے مگر قیصر روم جولین نے ڈاڑھی کی مذمت مین
بھی ایک کتاب لکھ ڈالی۔ لیکن باوجود اس مخالفت کے خود اُسکے منہ پر اگلے فلسفیون
کی تقلید مین جھنڈولی ڈاڑھی تھی۔ اور گو اُسکے سارے جسم پر بال تھے مگر اُسترا سوا
سر کے کہین نہین لگنے پاتا تھا۔ پرسیوس کہتا ہے کہ دانائی ڈاڑھی سے
وابستہ ہے۔

یہ خیال اگلے دنون لوگون کے دماغ مین اس قدر بسا ہوا تھا کہ کسی بادشاہ
نے ایک بے ریش و بروت لڑکے کو ایلچی بنا کے کسی دوسرے بادشاہ کے دربار
مین بھیجا۔ اس امرد سفیر کی صورت دیکھتے ہی اُس نے سخت برہمی کے ساتھ کہا

"میرے دربار مین ایک بے ریشے لونڈے کو سفارت پر بھیجا ہے"۔ یہ سُن کے نوعمر ایلچی بولا
"میرے آقا کو اگر یہ معلوم ہوتا کہ حضور کے نزدیک ڈاڑھی کی اس قدر ضرورت ہے
تو میرے عوض ایک بکرے کو بھیج دیتا"۔

اسکندر اعظم کے عہد مین معلوم ہوتا ہے کہ یونانیون اور مقدونیہ والون مین
ڈاڑھی کا عام رواج تھا۔ مگر سکندر نے یہ بدعت ایجاد کی کہ سپاہیون کی ڈاڑھیان
منڈوا دین۔ اور اس کارروائی کا محرک یہ خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو
دشمن ان سپاہیون کی ڈاڑھیان پکڑ پائین اور بےبس کر کے مغلوب کرین
لیکن اسکے بعد یورپ مین ڈاڑھیون کا پھر رواج ہو گیا۔ جس کا حال ہم آگے
بیان کرین گے۔

قوم عرب مین مدت ہاے دراز سے ڈاڑھی رکھنے کا رواج چلا آتا تھا۔ جسکو
اسلام نے بھی شرافت و مردانگی کا تمغہ تسلیم کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے زمانے
تک یہ بات اہل عرب کے وہم و گمان مین بھی نہ تھی کہ کوئی شریف قوم ڈاڑھی منڈاتی اور
ہے۔ صرف عجمیون اور مجوس کی نسبت اتنا جانتے تھے کہ اُن کی ڈاڑھیان مُنڈی
ہوتی ہین۔ جب دارائے ایران خسرو پرویز کے سفیر یمن سے مدینے مین آ کے
اور حضرت رسالت کے مہمان ہوئے تو اُن کی مُنڈی ہوئی ڈاڑھیان دیکھ کے آپ نے
پوچھا "تم لوگ ڈاڑھی کیون مُنڈاتے ہو؟" انھون نے کہا "ہمارے مالک یہی حکم
ہے"۔ یہ سُن کے آپ نے ارشاد فرمایا "مگر میرے مالک (خدا) نے مجھے ڈاڑھی کے
چھوڑنے اور مونچھون کے کتروانے کا حکم دیا ہے"۔ اسی واسطے آپ نے صحابہ کو
تعلیم فرمائی "فطرت (انسانی یا ایمانی اس لیے کہ اسلام مین دونون متحد ہین) کا تقاضا
ہے کہ ڈاڑھی چھوڑ دی جائے اور مونچھین کتوائی جائین"۔ حضرت رسالت کے
اس ارشاد نے ڈاڑھی کا مرتبہ اور بڑھا دیا۔ صحابہ کی عام وضع یہ تھی کہ لمبی ڈاڑھیان
اور کتری ہوئی مونچھین۔ حضرت ابن عمرؓ اور بعض دیگر صحابیون کا معمول تھا کہ مٹھی سے
ڈاڑھی کو ناپتے اور جتنی بڑھی نظر آتی اُسے کاٹ ڈالتے۔ اور چارون طرف سے
برابر کرنے کے لیے بھی کاٹتے تھے۔ مگر یہ بھی خاص خاص لوگون کی وضع تھی ورنہ
عموماً سب کی ڈاڑھیان مطلقاً چھوٹی ہوئی تھین۔ اور مونچھین اس قدر کتری ہوئی کہ

جلد نظر آنے لگے۔ اسلام اس وضع و حُلیہ کی اشاعت کرتا ہوا عرب کی حدود سے باہر
نکلا۔ اور جہاں جہاں پہونچا وہاں ڈاڑھی کی قدر و منزلت بھی زیادہ ہوتی گئی اور
چندروز میں شام و مصر۔ ایران و توران۔ اور افریقہ و اندلس میں جہاں دیکھیے
نورانی ڈاڑھیوں کا جلوہ نظر آرہا تھا۔ اور حریف پر جتنا رعب لمبی ڈاڑھیوں کا پڑتا
تھا کسی چیز کا نہ پڑ سکتا تھا۔

مسلمانوں کی یہ عام وضع تھی کہ لمبی داڑھیاں ہوتیں۔ اُن میں تیل ڈالا
جاتا۔ کنگھی کی جاتی۔ اور سن رسیدہ شہسواروں کی ڈاڑھیوں پر مہندی کی سرخی اور
کبھی نیل کی سیاہی اپنا جلوہ دکھاتی۔ ڈاڑھی کو اپنی عزت سمجھتے۔ اور ساتھ ہی
خیال کیا جاتا کہ ڈاڑھی چونکہ مردانگی کا فطری زیور ہے لہذا عورتیں بھی بالطبع
ڈاڑھی والے مرد کو بے ڈاڑھی والے سے زیادہ محبوب رکھتی ہیں۔ ڈاڑھی کی
شرم سب سے بڑی شرم ہوتی۔ اور ڈاڑھی کی عزت کرنا سب سے بڑی خاطر داری
خیال کی جاتی۔ یہاں تک کہ بچوں کے ساتھ اظہارِ شفقت منظور ہوتا تو بڑے
بوڑھے اُن کی ٹھڈیوں کو اپنے ہاتھ میں لیتے۔ اور سمجھتے کہ گو ان کے ڈاڑھی
نہیں مگر ڈاڑھی نکلنے کی جگہ پر ہاتھ لگانا انکی عزت بڑھانا ہے۔

اب بعد کا زمانہ آیا۔ اور مسلمان دیگر اقوام میں مل جُل کے انکی وضع و قطع
اختیار کرنے لگے۔ پہلا تغیر تو بظن غالب عباسیہ کے آخری دور میں یہ ہوا کہ بعض
مسلمان ایرانیوں کی تراش خراش سے متاثر ہوئے اور ڈاڑھیاں کٹوانے اور
چھوٹی کرانے لگے۔ اور ڈاڑھی کی اُس اگلی عزت و حرمت میں کمی ہونے لگی۔
یہاں تک کہ عرب کے ہاتھ سے حکومت ہی نکل گئی۔ اور تاج و تخت کی وارث
ترکی قوم ہوئی۔ جس نے مختلف ممالک میں مختلف سلطنتیں قائم کیں۔ اور ہر
سلطنت کے مسلمان اپنی قلمرو کے لوکل اثروں سے متاثر ہونے لگے۔ اُدھر دولت
عثمانیہ کے وارثِ تاج و دیہیم سلطان سلیم اول نے (جس کا زمانہ سنہ ۱۵۱۲ء سے
سنہ ۱۵۲۰ء تک تھا) غالباً مسیحیوں کی وضع پسند کرکے سب کے پہلے ڈاڑھی کو خیرباد
کہی۔ ادھر دولت مغلیہ تیموریہ کے وارث شہنشاہ جلال الدین اکبر نے (جسکا عہد
سنہ ۱۵۵۶ء سے سنہ ۱۶۰۵ء تک تھا) اپنے سالے سُسروں کے اثر سے متاثر ہو کے

ڈاڑھی کا صفایا بول دیا۔ ہندوستان میں اکبر کے اس فعل کو مسلمان سوسائٹی نے
کو ناپسند کیا مگر سب نے ایسی خاموشی اختیار کی کہ نہ کسی نے مخالفت کی آواز بلند
کی اور نہ کسی نے بادشاہ کی وضع اختیار کی۔ مگر سلطان سلیم کی مخالفت نے ذرا
زیادہ جوش دکھایا۔ گو سلطان کے سامنے کسی کو زبان کھولنے کی مجال نہ تھی مگر
شیخ الاسلام نے جی کڑا کرکے پوچھا "حضور نے ڈاڑھی کیوں منڈا ڈالی"۔ سلیم نے
جس کے مسخرے پن سے کہا "تاکہ وزیر کے ہاتھ میں میری کوئی ایسی چیز نہ آسکے جسے
پکڑ کے وہ مجھے جدھر چاہے کھینچ لیجائے"۔

مگر اسلام کی گرفت ایسی نہ تھی کہ اسلامی ممالک میں یورپ کی طرح بادشاہ کی
وضع کا اثر عام سوسائٹی پر پڑ جاتا۔ نہ اکبر کی وجہ سے مسلمان شرفا و امرا نے اپنی
ڈاڑھیاں منڈائیں۔ اور نہ سلیم کی وجہ سے ترکی امرا و ارکان دولت نے۔ بلکہ
خود انکے جانشینوں میں بھی یہ وضع نہ قائم رہ سکی۔ اکبر کے بعد جہانگیر نے تو البتہ
ڈاڑھی منڈائی تھی مگر بعد جو دیکھا گیا تو ساری دنیا کے مسلمان تاجداروں کے
منہ پر لمبی اور نورانی ڈاڑھیاں تھیں۔

اب موجودہ مسلمانوں کی ڈاڑھیوں کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ بتانا
چاہیے کہ ظہورِ نیرِ اسلام کے بعد یورپ کی سرزمین میں غریب ڈاڑھی پر کیسی کیسی آفتیں
نازل ہوئیں۔ اور وہاں اُسے کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈاڑھی نے
نشیب و فرازِ عالم اور انسانی تلون مزاجیوں کے جیسے جیسے کرشمے اس مغربی
حصۂ زمین میں دیکھے کہیں نہیں دیکھے تھے۔ کبھی تو بڑی بڑی لمبی ڈاڑھیاں تھیں
اور کبھی صفاچٹ۔ مذہب عیسوی اگرچہ یہود میں سے نکلا تھا۔ اور حضرت مسیح
اور آپ کے حواری سب ڈاڑھی والے بزرگ تھے مگر مذہب نے اسکی کچھ پروا
نہ کی۔ کلیسیائے روم و کلیسیائے یونان میں جہاں اور اختلافات ہیں وہاں یہ
بھی ہے کہ کلیسیائے یونان ڈاڑھی کا موید و حامی ہے اور کلیسیائے روم
غالباً رومیوں کے آخری مذاق کی پابندی میں ڈاڑھی کے خلاف۔ بلکہ مغربی
مقتدا ڈاڑھی کو عیب خیال کرتے ہیں۔ اسوقت خود پوپ اور انکے تمام
کارڈنل (جن میں سے پوپ منتخب ہوتے ہیں) سب کی ڈاڑھیاں خوب منڈی

ہوتی ہیں - لیکن شاید یہ آخر عہد کے پاپاؤں کا بنایا ہوا قانون ہے - کیونکہ قدیم الایام کے اکثر پاپا ڈاڑھی والے تھے - نیپلز میں قدیم پاپاؤں کی مورتیں پُرانے ہی زمانے کی تراشی ہوئی رکھی ہیں - جن میں پوپ کلیمنٹ سابع (۱۵۲۳ء) سے لے کے پوپ اسکندر ہشتم (۱۶۸۹ء) تک کی مورتیں ترتیب وار نظر آتی ہیں - اور موجودہ پوپوں کی مُنڈی ہوئی ڈاڑھی مونچھوں کے بعد اُنکے چہروں پر نظر ڈالئے تو حیرت معلوم ہوتی ہے - آخر عہد میں جب پوپ نے ڈاڑھی مُنڈانے کا فتویٰ دیا تو ہر طرف ڈاڑھیوں پر ظلم ہونے لگا - یہاں تک کہ بلجیم کے دینداروں نے خواہش کی کہ ڈاڑھی والے مسیحی لامذہب اور دین عیسوی سے خارج کیے جائیں۔

تیرہویں صدی عیسوی تک انگلستان میں بھی ڈاڑھی رکھنے کا عام فیشن تھا - مگر پندرہویں صدی میں ڈاڑھیوں پر ایسے ہاتھ صاف ہونے لگے کہ ڈاڑھی والے چند ہی چہرے باقی رہ گئے تھے - ہنری ہشتم کے عہد میں لنکنزان کے معزز و محترم ارکان نے یہ قاعدہ جاری کیا کہ جس کے مُنہ پر ڈاڑھی ہو وہ بغیر دونی فیس ادا کیے بڑے میز پر نہ بیٹھ سکے - لیکن ابھی تک اکثر لوگوں کو ڈاڑھیاں اس قدر عزیز تھیں کہ باوجود ان جابرانہ قواعد کے ڈاڑھیوں سے دست بردار نہ ہوتے تھے - چنانچہ ۱۵۵۵ء میں ملکہ میری نے اپنے چار معزز اُمرا کو روس کے دربار میں سفیر بنا کے بھیجا تو اُن چاروں کے چہروں پر ڈاڑھیاں تھیں - خصوصاً اُن میں سے ایک شخص جارج کلنگ وتھ کی ڈاڑھی پانچ فٹ دو انچ لمبی تھی - جس کی صورت دیکھتے ہی شہنشاہ روس ایوان مہیب" کو بیساختہ ہنسی آ گئی - جارج کی ڈاڑھی گھنی چوڑی اور دراز تھی - اور کھانے کے بعد ایوان اُس سے کھلونے کی طرح کھیلنے لگا -

لیکن انگلستان میں اُنکے بعد جب ملکہ ایلزبتھ کا زمانہ (۱۵۵۸ء سے ۱۶۰۳ء تک) شروع ہوا تو ڈاڑھیوں پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی - اس لیے کہ اس اقبالمند مگر درشت مزاج ملکہ کے حکم سے ڈاڑھیوں پر محصول لگایا گیا - اور حکم جاری ہوا کہ ہر ڈاڑھی والا شخص اپنی ڈاڑھی کی طرف سے سالانہ ۳ شلنگ ۴ پنس محصول ادا کرے - اور جس کسی کے چہرے پر پندرہ دن اُسترا نہ پھرے لیکن

اُس کا خط پندرہ دن کا ہو گیا ہو اُسکے ذمے یہ محصول واجبی ہو جائے - ہم نہیں جانتے کہ اُن دنوں انگلستان میں نائیوں کو ڈاڑھی مونڈنے کی کیا اُجرت دینی پڑتی تھی - لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ سرکاری ٹکس نائیوں کی سالانہ اجرت سے زیادہ ہی دینا پڑتا ہو گا - کیونکہ انگلستان میں اُن دنوں زندگی بسر کرنا اس قدر گران نہ تھا جس قدر کہ اب ہے - اور اس میں شک نہیں کہ انگریزوں میں جو رواج ہو گیا ہے کہ ہر شخص صبح کو منہ دھوتے وقت اپنی ڈاڑھی آپ مونڈ لیا کرتا ہے یہ اُسی دور کی برکت ہے - تاہم بہت سے لوگوں نے اب بھی ڈاڑھی نہ منڈائی - بلکہ سرکاری محصول ادا کرنے سے اور زیادہ خوش ہو ہو کے اپنی ڈاڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے کہ محصول دینے پر بھی انکی محبت ہمارے دل میں باقی ہے -

اسکے تقریباً نوے برس بعد پیٹر اعظم نے روس میں بھی ڈاڑھیوں پر محصول لگا دیا - مملکت ہسپانیہ میں جو دو صدی پیشتر عروج پر تھی غالباً عربوں کے اثر سے ڈاڑھی کی اچھی داشت ہوتی تھی - اور کل معززین کے چہروں پر ڈاڑھیاں ہوا کرتی تھیں - لیکن ۱۷۰۰ء میں فلپ پنجم کی تخت نشینی کے ساتھ ڈاڑھیوں کی قسمت بھی پلٹ گئی - انکی بدنصیبی سے فلپ مذکور خوسا تھا یعنی قدرت ہی نے اُسے ڈاڑھی کے زیور سے محروم رکھا تھا - ڈاڑھی والوں کی سوسائٹی میں اپنے اس پیدائشی نقصان کو وہ برداشت نہ کر سکا - اور اپنی خفت مٹانے کے لیے حکم دے دیا کہ تمام امرائے دربار ڈاڑھی مُنڈا ڈالیں - اور گو شاہی اثر نے ڈاڑھی مُنڈانے کو اسپین کا فیشن بنا دیا - مگر پھر بھی بہت سے لوگ ڈاڑھی کو حسرت سے یاد کرتے اور ایک آہ کے ساتھ کہتے تھے "ہماری ڈاڑھیوں کے ساتھ ہماری جانیں بھی چلی گئیں" پرتگیزوں میں اس سے پیشتر ڈاڑھی کی بڑی قدر تھی - اور وہ بھی عربوں کی سنت پر چل رہے تھے - مگر جب زمانے کی ہوا بگڑی تو وہ بھی یورپ کے عام فیشن کے گرویدہ ہوے - اور اس قوم نے بھی ڈاڑھیوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا -

فرانس میں غالباً یورپ کے دیگر مقامات سے پہلے ہی ڈاڑھیاں مُنڈ گئی تھیں - مگر مغرب ہی میں "روسکولینی کی" نام ایک مسیحی مبتدع فرقہ نے دعویٰ کیا

که خدا کی "ربانی موت ڈاڑھی میں ہے" تاہم پوپ صاحب کا مونڈانے کا فتویٰ
سب پر غالب تھا۔ لیکن وہاں ڈاڑھیاں مونڈتے ہی مونڈتے ایک ایسا زمانہ
آگیا کہ یکایک ڈاڑھی کا نصیبہ چند روز کے لیے از سر نو جاگ اٹھا۔ فرینسس اول
جو فرانس کے "رائل کالج" اور "رائل لائبریری" کا بانی ہے ۱۵۱۵ء میں تخت پر
بیٹھا۔ اس کی ٹھوڑی پر ایک زخم کا داغ تھا جو نہایت ہی بدنما معلوم ہوتا تھا۔
اس عیب کے چھپانے کے لیے اس نے ڈاڑھی رکھ لی۔ چند روز میں سارے
دربار کا یہی فیشن ہو گیا۔ اور جسے دیکھیے اس کے چہرے پر ڈاڑھی تھی۔ مگر فرینسس
کے بعد پھر وہاں زمانے نے ڈاڑھی کے ساتھ سرد مہری کی۔

چند روز پیشتر آخری شہنشاہ فرانس نپولین نے ایک نئی وضع کی ڈاڑھی
رکھی یعنی دونوں طرف کلے مونڈے ہوئے اور ٹھوڑی پر ڈاڑھی۔ کچھ دنوں
کے لیے فرانس کی یہی وضع رہی۔ جس کا اثر اب بھی کسی قدر باقی ہے۔ اس کے
بالکل برعکس جرمن کے بوڑھے شہنشاہ اور نیز روس و آسٹریا کے شہنشاہوں
نے دونوں جبڑوں پر ٹھیکے رکھوائے اور درمیان میں ٹھڈی مونڈا ڈالی۔ یہ وضع
یورپ کے بعض فوجی افسروں کو زیادہ پسند آئی۔ اور غالباً انھیں کی دیکھا دیکھی
ہندوستان کے بعض امرا نے بھی ٹھیکے رکھوا لیے۔ جس وضع کا زیادہ مشہور
نمونہ فی الحال حضور نظام حیدرآباد میر محبوب علی خان بہادر کی ڈاڑھی ہے۔

فی الحال یورپ میں ہر جگہ ڈاڑھی مونڈانے کا عام رواج ہے۔ اور جو
ڈاڑھی رکھے اس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے مزاج میں صفائی نہیں ہے
آج کل یورپ میں سب جگہ سے زیادہ ڈاڑھیاں جرمنی میں نظر آتی ہیں۔ اور اگر
کچھ رواج باقی بھی ہے تو اس قوم میں جو اکثر موقعوں پر سلطان کی طرفداری
کرتی ہے۔

ابھی چند روز ہوئے جرمنی نقاش (مصور) "جوہان ٹایو" کی ڈاڑھی دنیا
بھر میں سب سے بڑی ڈاڑھی تصور کی جاتی تھی۔ اور واقعی اتنی بڑی
ڈاڑھی الف لیلہ کی پری بانو کے قصے کے سوا اور کہیں نہیں نظر آ سکتی۔ اس کی
ڈاڑھی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اتنی لمبی تھی کہ کھڑے ہونے میں بھی زمین پر

وٹا کرتی۔ اور اکثر مجبور ہو کے وہ اسے کمر میں لپیٹ لیا کرتا۔

لیکن ہمارے موجودہ فرمانروا قیصر ہند حضور ایڈورڈ ہفتم نے اپنے زمانہ ولیعہدی
ہی سے ایک نئی وضع کی چھوٹی اور نوکیلی ڈاڑھی ایجاد کی جو مسلمانوں کے شرعی حدود
کے اندر آ جاتی ہے۔ اور اگر قوم میں من تشبہ بقوم فہو منہم کے مرض تفرق اتصال کا
اندیشہ نہ پیدا ہو اور اس حدیث کا حکم صرف امور دینی تک محدود رکھا جائے تو
یقین ہے کہ اس دور کی فیشن ایبل ڈاڑھیاں خلاف شرع نہ سمجھی جائیں گی۔
یہ ڈاڑھی اب یورپ میں بھی رواج پاتی جاتی ہے اور ہندوستان میں بھی یہاں
تک کہ شہنشاہ روس نے بھی اپنے آبا و اجداد کی وضع کے خلاف اس وضع کی
ڈاڑھی رکھ لی۔ اکثر شاہزادگان یورپ کے چہروں پر اس ڈاڑھی کا جلوہ نظر آ رہا ہے۔
ابھی چند روز ہوئے ہمارے ولیعہد سلطنت پرنس آف ویلز بہادر ہم میں اور ہمارے
ملک میں تھے۔ اور ان کا خوبصورت چہرہ بھی اسی ڈاڑھی کی خوشنمائی کا ثبوت
دے رہا تھا۔

ہم تو سمجھتے ہیں کہ اسلام کو ہمارے شہنشاہ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ کیونکہ
اسلام ڈاڑھی کا سب سے زبردست حامی ہے اور یورپ کی موجودہ دست برد
سے امید نہ تھی کہ کسی شخص کی بھی ڈاڑھی بچنے پاتی۔ ہمارے شہنشاہ کی توجہ
سے یہ غریب ان کے زیر حمایت آ گئی۔ ورنہ دوسری قومیں درکنار مسلمانوں کے چہروں
پر بھی شاید اتنی ڈاڑھیاں نہ ہوتیں جتنی کہ اب نظر آتی ہیں۔ سلیم اور اکبر کا
ڈاڑھی مونڈانا تو مسلمانوں پر کچھ اثر نہیں ڈال سکا تھا مگر مغربی تہذیب کے عروج
اور یوروپین اقوام کے میل جول سے اکثر ترقی یافتہ ممالک کے مسلمان اپنے قومی
کیرکٹر اور اپنے پرانے حلیوں کو بھول گئے۔ سب نے ایک سرے سے ڈاڑھی
کو خیرباد کہہ دی۔ ادھر ترکوں نے بے تکلف ڈاڑھیاں منڈانی شروع کر دیں۔
ادھر ایرانیوں نے۔ اور چونکہ یہ دونوں ملک فی الحال مسلمانوں کی سوسائٹی
کے مرکز خیال کیے جاتے ہیں لہذا دیگر ممالک کے مسلمان بھی ان کو دیکھ کے اور
نیز مغربی حکام کی وضع و قطع پسند کر کے عموماً ڈاڑھیاں منڈانے لگے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں سنیوں کے مقابل شیعوں نے ڈاڑھیوں کی

کی طرف سے پہلے بے پروائی کی۔ اُنکے مقتدایان دین نے بھی فتویٰ دیدیا کہ کوئی لمبی ڈاڑھی رکھنے پر مجبور نہین بلکہ قصر بھی جائز ہے۔ بس اتنی داڑھی ہونی چاہئے کہ دُور سے کوئی دیکھے تو یہ نہ سمجھے کہ مُنڈی ہوئی ہے۔ مگر اُنکے پیرو اس حد سے گذر گئے۔ بے تکلف مُنڈانے لگے۔ اور لکھنؤ کا فیشن ہو گیا کہ ڈاڑھی منڈا اور موچھین بڑھی۔ قریبًا کچھ کم ایک صدی سے ہندوستان مین یہ امتیاز چلا آتا تھا۔ کہ شیعونکی ڈاڑھی منڈی ہوئی اور سنیون کے مُنہ پر ڈاڑھیان۔ یہان تک کہ انگریزی تعلیم اور علی گڑھ کالج کے جدید فیشن نے یہ امتیاز بھی اُٹھا دیا۔ اور اب سنی و شیعہ سب ایک وضع کے ہیں

ختنہ

یہ رسم قدیم الایام سے بعض پُرانی قومون مین چلی آتی ہے۔ اور اس کے سب سے بڑے حامی یہود اور مسلمان ہین۔ مسیحی اگر سچے پیرو مسیح ہوتے تو اُن مین بھی ضرور اس کا رواج ہوتا۔ مگر انھون نے غیر مختون یونانیون اور رومیون کے اثر سے جہان سُور کو جائز کیا۔ ہیکل سلیمانی یعنی مسجد اقصیٰ کی تعظیم ترک کی وہان ختنے سے بھی آزاد ہو گئے۔

دنیا کی مختلف اقوام کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو نظر آتا ہے کہ اگلے زمانے کی بہت سی اور قومین بھی بغیر اسکے کہ مذکورہ ختنہ کرنے والی قومون سے متاثر ہوئی ہون ختنہ کرتی تھین۔ قدیم اہل مصر فراعنہ کے دور مین ختنہ کراتے تھے مصر مین قرناق کی ہیکل خنسو کے کھنڈرون مین ایک دیوار پر تصویر بنی ہے کہ دو لڑکون کا (جو بظاہر اسباب فرعون رعمسیس دوم کے بیٹے معلوم ہوتے ہین) ختنہ کیا جا رہا ہے۔ ان لڑکون کی عمرین چھ سال اور دس سال کے درمیان ہیں اور ختنہ کرنے والا معتقد اعظم ہے۔ وسط امریکہ کی بعض شایستہ و متمدن پرانی قومون مین بھی ختنہ کا رواج تھا۔ دریاے امیزن کے علاقے مین ٹیما اور منا قوموں میں یہ طریقہ آج بھی مروج ہے۔ اس قدیم دُنیا کے جنوبی جزائر مین بہت سی مختون قومیں آباد ہین۔ آسٹریلیا کے اکثر اقوام بھی ختنہ کراتے ہین

یون لوگون نیوکلیڈ دنیا والون اور نیو ہیبریڈس کے رہنے والون مین بھی ختنہ مروج ہے۔

بر اعظم افریقہ پر اگرچہ فتوحات عرب کا بے انتہا اثر پڑا مگر وہان بھی بعض ایسی وحشی اور غیر اثر پذیر قومون مین ختنہ کیا جاتا ہے کہ اُسے عربی اثر کا نتیجہ بتانا ذرا دشوار ہے یہاں یہ کافر لوگون مین مروج ہے۔ بچوانا قوم میں یہ حالت ہے کہ مختون لڑکے اپنی صحبت الگ قایم کرتے ہین اور غیر مختونون کو اُس مین شریک نہین ہونے دیتے۔ بعض مورخین سمجھتے ہیں۔ کہ ختنہ دراصل قوم عرب کا شعار تھا یہود نے اُن سے سیکھا۔ اور بعض سمجھتے ہین کہ یہود سے یہ طریقہ عربون مین آیا۔ غرض یہ بہت پُرانا رسم ہے جس کی نسبت یہ پتہ لگانا کہ کس سے نکلا اور کس سے کس مین پہونچا نہایت دشوار بلکہ غیر ممکن ہے۔

یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہے کہ دنیا مین اس عجیب رسم کا رواج کس غرض سے ہوا۔ مصر والون اور نیز شام کے فینقیین مین یہ مشرکانہ مقولہ پھیلا ہوا تھا کہ "را (سورج) دیوتا جب اپنے عضو کے کاٹنے کی خواہش کرتا تو اُس سے خون بہنے لگتا"۔ علیٰ ہذا القیاس یہ دیومالا بھی اس سے تعلق رکھتی ہے کہ "ایل نے اپنے باپ اُرانوس کا یا خود اپنا ختنہ کیا۔ اور خون چشمون اور ندیون مین بہنے لگا"۔ مگر ختنہ کو بت پرستی کے ان افسانون سے متعلق کرنا غلطی ہے۔ یونان کا پُرانا مورخ ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ "مصر والون مین ختنہ کا رواج صفائی کے خیال سے تھا"۔ یون تو حفظ صحت کے اصول سے بھی ختنہ کو تعلق ہے مگر سچ یہ ہے کہ اس رسم کی بنیاد دُنیوی مصالح کے مقابل دینداری پر زیادہ ہے۔ اصل مین یہ ایک قسم کی قربانی تھی۔ جس سے مقصود یہ تھا کہ اپنی خواہش نفسانی کا خون کرکے خدا کی حکومت اپنے اوپر تسلیم کی جائے۔ یا ایک حصہ جسم فدیہ مین دے کے باقی جسم کے محفوظ رکھنے کی اُمید رکھی جائے۔

مورخین ان باتون کی چھان بین جا ہے جہاں تک اور جس قدر بھٹکتے پھرین مگر اس مین شک نہین کہ مذہبی روایات نے قطعی طور پر فیصلہ کر دیا کہ ختنہ کا آغاز حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے خدا کے ایک عہد کیطرح لینے سے ہوا۔ توراۃ

کی کتاب تخلیق کے ۱۷ باب میں آیات ذیل اس مضمون کو صاف طور پر بتا رہے ہیں
"(۹) پھر خدا نے ابرہام (ابراہیم) سے کہا کہ تو اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت میرے عہد کو نگاہ رکھیں۔ (۱۰) اور میرا عہد جو میرے اور تمھارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے۔ (۱۲) تمھاری پشت در پشت ہر لڑکے کا جب وہ آٹھ روز کا ہو ختنہ کیا جائے گا۔ کیا گھر کا پیدا کیا پڑوسی سے خریدا ہوا۔ (۱۴) اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہیں ہوا وہی شخص اپنے لوگوں میں سے کٹ جائے کہ اُس نے میرا عہد توڑا۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم سے یہ خدا کا ایک عہد تھا جس کی پابندی پوری نسل ابراہیم نے کی اور آج تک ہو رہی ہے۔ ایک طرف بنی اسرائیل سختی سے پابند تھے حتیٰ کہ خود جناب مسیح کا بھی ختنہ ہوا۔ اور دوسری طرف بنی اسمٰعیل میں اسکا پورا رواج تھا۔ جن کی کوشش سے چند ہی روز میں ایسا زمانہ آگیا کہ کوئی خطۂ زمین نہیں جہاں مختون خدا پرست نہ موجود ہوں۔

توراۃ سے پتہ چلتا ہے کہ خدا اس رسم کو اپنے پوجنے والوں اور اپنے خاص بندوں کے لیے نہایت اہم جانتا تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ جب بی بی بچوں کو لے کے مصر کی طرف واپس چلے تو رستے میں اُنھیں خدا ملا۔ اور چاہا کہ موسیٰ کو ہلاک کر ڈالے (اس کا سبب سیاق عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے بیٹے کا ختنہ نہیں کیا تھا) تب آپ کی بی بی صفورہ نے ایک تیز پتھر سے بیٹے کا ختنہ کر کے کٹی ہوئی کھال خدا کے قدموں پہ پھینکی اور کہا "تو بیشک خون کے سبب[عہ] سے میرے سسرے کی جگہ ہوا۔ تب اُس نے (خدا نے) اُسے (موسیٰ کو) چھوڑ دیا۔"

عہ یہ واقعہ مسلمانوں کے عقائد کی رو سے نہایت لغو اور موحدین کی جگہ مشرکین کے مذاق کا ہے۔ اور یقیناً ترجمے نے یہ خرابیاں پیدا کر دیں۔ عبرانی زبان کے محاورات پر حکومت رکھنے والا ہی سمجھ سکتا ہے کہ اصل الفاظ کا مفہوم کیا تھا۔ محاورات کا لفظی ترجمہ ہمیشہ ایسی خرابیاں پیدا کر دیا کرتا ہے۔ عربی میں "بَیْنَ یَدَیْہِ" کے لفظی معنی ہیں اُسکے دونوں ہاتھوں کے درمیان۔ مگر اسکا علی العموم مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اُسکے سامنے۔ اب فرض کیجیے کہ خدا نے کسی جگہ فرمایا ہو "میری

حضرت مسیح کے زمانے زمانے میں پولوس نے مسیحیوں کی گنتی بڑھانے کی بے دینوں میں جب ہر قسم کے مشرکانہ رواج کو گوارا کر لیا تو ختنہ کی ضرورت بھی اُٹھا دی۔ جس کے باعث یہود و تعلیم کے اصلی مسیحی اور خاص حضرت مسیح کے صحبت یافتہ لوگ کے دشمن اور خون کے پیاسے ہو گئے۔ لیکن مغرب کی آزاد مسیحیت بڑھتی گئی اور اصلی مسیحیت جو ارض مقدس میں تھی کمزور ہو کے فنا ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ سچا یہی فرقہ جو "ناصری" کہلاتا تھا دنیا سے ناپید ہو گیا۔ اور حضرت رسول آخر الزمان علیہ السلام کو مبعوث ہو کے پکار دینا پڑا کہ اصلی مسیحیت نہیں باقی رہی۔

اب مسیحیت یہود کے ساتھ مختونیت کا بھی استیصال کر رہی تھی۔ اور قریب تھا کہ رومی بت پرستی جو مسیحیت کے جامے میں نمودار تھی اس ابراہیمی عہد کو خدا کے بندوں سے تڑوا دے کہ حضرت سرور کائنات کی بعثت سے عرب کا دور شروع ہوا۔ اور بنی اسماعیل جو اب سنتِ ابراہیمی کے سچے حامی تھے توحید کی صدا بلند کرتے ہوے دنیا میں پھیلے۔ اور چند ہی روز میں یہ معجزہ دکھا دیا کہ خدا کا یہ عہد صرف ارض فلسطین میں نہیں بلکہ ہر جگہ پورا ہو رہا تھا۔

مگر یہود کے اور اسلام کے ختنے میں تھوڑا فرق ہے۔ یہود لازمی طور پر ہر بچے کا ختنہ اُسکی ولادت کے آٹھویں دن کیا کرتے تھے۔ اور مسلمانوں میں اسکی پابندی نہیں۔ وہ ولادت سے بلوغ تک جب چاہیں ختنہ کرا سکتے ہیں۔ بلکہ قدیم زمانے میں عربوں کے ختنے کا زیادہ تر رواج بالغ ہونے کے وقت تھا۔

لیکن تعجب یہ ہے کہ بعض قوموں میں عورتوں کا ختنہ بھی مروج تھا۔ اُنکی شرمگاہ سے گوشت کا کچھ زائد حصہ کاٹ لیا جاتا تھا۔ اور بعض خاص عورتیں تھیں جن کے ہاتھ سے اس رسم کی تکمیل ہوتی تھی۔ قدیم اسٹرابو کے زمانے میں یعنی اسلام سے بہت پہلے مصر اور عرب کی عورتوں میں عموماً ختنہ ہوا کرتا تھا۔ مسٹر لین تصدیق کرتے ہیں کہ خلیج فارس کے دونوں جانب یعنی بحرین عمان۔ عراق اور فارس میں یہ عموماً

ہم سمجھ والے اُس کا مطلب یہی سمجھیں گے کہ میرے سامنے۔ مگر محتاط لفظی ترجمہ کرنے والا کہے گا۔ "میرے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں"۔ ایسی خرابیاں توراۃ میں کثرت سے پیدا ہو گئی ہیں۔ اور چونکہ عبرانی زبان مردہ ہو گئی اس لیے اصلی راز کا کھلنا میرے نزدیک امکان سے باہر ہو گیا۔

مروج ہے - افریقہ کے بعض مغربی اضلاع مین بھی عورتین مختون کی جاتی ہین - چنا
ڈھومی قوم بھی اس کی پوری طرح پابند ہے۔

مسلمانون اور عیسائیون مین امتیاز لباس

عام مسلمانون مین یہ بے بنیاد واقعہ کثرت سے مشہور ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا کہ نصاری چھوٹے دامنون کے کپڑے پہنین اور گھوڑون کی دُمین کٹوا ڈالین۔ حالانکہ جہان تک کتب تواریخ کا تتبع کیا جائے خلافت راشدہ کے پُرامن و عدل عہد مین کسی ایسی تفریق کا ہرگز پتہ نہین لگتا۔ گھوڑون کی دُمین کاٹنے کا ایک عجیب واقعہ صحابہ ہی کے آخر دور مین ہندوستان کی سرحد پر پیش آیا جسے علامہ بلاذری نے فتوح البلدان مین بیان کیا ہے۔ یعنی حملہ آور عربون نے حریف کے چند سوارون کے گھوڑون کی دُمین کٹی ہوئی دیکھین۔ روشن خیالی اور وسیع النظری اُن دنون مسلمانون مین اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اس وضع کو عربون نے پسند کیا اور کہا "ہم لوگ ان لوگون سے زیادہ اس بات کے مستحق ہین کہ اپنے گھوڑون کی دُمین کاٹ دین"۔ یا تو اُنھین مسلمانون کا یہ مذاق تھا کہ دشمنون اور مخالفون کی ہر اچھی اور مفید بات کے اخذ کرنے کو تیار رہتے۔ اور یا یہ زمانہ ہے کہ ادنی ادنی معاشرتی امور پر "من تشبہ بقوم فھو منھم" کا اصول پیش کرکے کفر و الحاد کا فتوے دے دیا جاتا ہے۔

رہا لباس کا فرق۔ اس بارے مین قرون اولی کی کوئی ایسی شہادت ہمارے پاس موجود نہین ہے جس سے یہود و نصاری اور مسلمانون کے وضع و لباس کی تفریق کے متعلق اسلامی حکومت کا کوئی خاص حکم ثابت کیا جا سکے۔ ہان مصر کے خلفائے بنی فاطمہ مین سے، جنھین اکثر مورخین "عبیدیین" کے لفظ سے یاد کرکے بدنام کرتے ہین، "حاکم بامر اللہ" نے ایک مرتبہ یہ بھی حکم جاری کر دیا تھا کہ حمام کے اندر بھی اور باہر سڑکون پر بھی عیسائیون کا لباس مسلمانون کے لباس سے جدا ہوا کرے۔ مگر حاکم بامر اللہ کے احکام و افعال کا ذمہ دار نہ اسلام ہے اور نہ مسلمان ہین۔ وہ ایک مجنون سا خلیفہ تھا اور روز ایک نیا اور انوکھا حکم جاری کیا کرتا تھا۔ اگر

اُس کی حالت اور اُسکے احکام کو دیکھیے تو بڑی حیرت معلوم ہوتی ہے۔

۳۹۵ھ مین اُس نے حکم جاری کیا کہ شہر مصر کے گلی کوچون مین اور کل عالیشان مسجدون اور مکانون کے در و دیوار پر صحابۂ کرام کے نامون کے ساتھ (معاذ اللہ) گالیان لکھی جائین۔ اسی قدر نہین۔ ساری مملکت اور قلمرو مین یہ حکم جاری کر دیا کہ علانیہ صحابہ کے نامون کی توہین کی جایا کرے۔ اسکے بعد ۳۹۷ ہجری مین کچھ ایسی مت پلٹی کہ یکایک فرمان خلافت جاری ہوا کہ جو کوئی صحابۂ کرام کے محترم نامون کے ساتھ کوئی سخت لفظ استعمال کرے یا اُنکے نامون کی توہین کرے اُس کا فوراً سر اڑا دیا جائے اور سخت سزا دی جائے۔ ایک مرتبہ بیٹھے بیٹھے یہ فرمان واجب الاذعان نافذ ہو گیا کہ تمام کتے مار ڈالے جائین۔ گلی کوچون مین جو کتا [ملا] فوراً مار ڈالا گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ سارے شہر مین کہین کتون کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ایک بار حکم ہوا کہ کھیر کی قفلیان ہرگز نہ بکنے پائین۔ پھر یہ فرمان جاری ہوا کہ کشمش ہرگز نہ بکنے پائے۔ جو کوئی کشمش تھوڑی ہو یا بہت ہو، بیچتا نظر آئے واجب التعذیر ہے۔ یہ مالیخولیا اس قدر بڑھا کہ پانچ سو دینار صرف کرکے جتنی کشمش ملی خرید کے جلا دی گئی۔ اسکے بعد یہ حکم قضا شیم جاری ہوا کہ انگور ہرگز نہ بکنے پائے۔

انہین احکام کے ذیل مین ایک یہ حکم بھی تھا کہ یہود و نصاری مسلمانون کا سا لباس نہ پہنین۔ نہ حمام کے اندر اور نہ حمام کے باہر سڑکون اور راستون مین۔ پھر اُس کا جوش زیادہ بڑھا تو ایک حمام یہود کے لیے، ایک نصرانیون کے لیے، اور ایک مسلمانون کے لیے الگ الگ تعمیر کر دیا گیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیون کے ساتھ اُس کا تعصب روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ لباس کی تفریق کے بعد یہ حکم ہوا کہ آراستہ و پیراستہ زین پر یہود و نصاری نہ سوار ہوا کرین۔ اُنکے گھوڑون کی زین لکڑی کی ہوا کرے۔ کسی مسلمان کو وہ خدمتگاری پر نوکر بھی نہ رکھین۔ مسلمان گدھے والے کے گدھے پر کرایہ دے کے سوار بھی نہ ہون۔ جس کشتی کے ملاح مسلمان ہون اُس پر بھی سوار نہ ہون۔ ان احکام سے مین یہ جانتا ہون کہ امتیاز تو تھا خیر تو بعد کی چیز ہین، مین شہر کے مسلمانون، گدھے والون، اور کشتیبانون کا نقصان پہلے ہوا ہوگا۔ اسکے بعد ۴۰۲ھ

مین اُس نے حکم دیا کہ بلادِ مصر مین عیسائیون کے جتنے کنیسے ہین سب منہدم کر دیے جائین اور اُن کا مال و اسباب مسلمانون کو دیدیا جائے ۔ اور چونکہ بیت المقدس بھی اُس کی قلمرو مین شامل تھا اس لیے حکم دیا کہ وہان کا عظیم الشان کنیسہ القمامہ ڈھا دیا جائے ۔ پھر حکم ہوا کہ خبردار کوئی شخص علم نجوم سے تعلق نہ رکھے ۔ اور جتنے نجومی ہون سب اُس کی قلمرو سے نکال دیے جائین ۔ پھر حکم ہوا کہ جتنے گویے ہین سب خارج البلد کر دیے جائین ۔ اسکے بعد بمصداق نزلہ بر عضو ضعیف می ریزد حکم ہوا کہ خبردار عورتین چاہے دن ہو یا رات اپنے گھرون کی دہلیز سے باہر قدم نہ نکالین ۔ اور جس قسم کی جوتیان پہن کے عورتین آمد و رفت کیا کرتی تھین اُنکے بنانے کی موچیون کو قطعی ممانعت کر دی گئی ۔ عورتین مصر مین اور تمام ممالک اسلامیہ مین ہمیشہ سے باہر آمد و رفت کرتی ہین اور اپنے دوستون اور عزیزون کے گھرون مین عموماً پیدل جایا کرتی ہین ۔ مگر اس حکم کی بدولت سات برس تک وہ اپنے گھرون مین قید رہین اور کسی عورت کی مجال نہ تھی کہ گھر سے باہر نکلے ۔ یہان تک کہ سات برس بعد اُس کے جانشین الظاہر نے اُنھین اُنکی پرانی آزادی دی ۔ پھر اسکے بعد یکایک عیسائیون کے حال پر مہربانی ہوئی اور حکم جاری ہوا کہ اُنکے جتنے معبد اور کنیسے کھود ڈالے گئے تھے سرکاری روپیہ سے پھر تعمیر کرا دیے جائین ۔ اور اُن کا جو مال لوٹا گیا تھا وہ لوگون سے چھین کے پھر اُنکے حوالے کیا جائے ۔

غرض یہ تھے وہ احکام جن کے سلسلے مین ایک بار تفریق لباس کا حکم بھی جاری ہو گیا تھا ۔ لیکن اس کو اسلام کا کوئی فعل خیال کرنا اگر مسلمانون کی بیوقوفی ہے جو اسے اپنا فخر و ناز سمجھ کے بیان کیا کرتے ہین تو اُن لوگون کی بھی بڑی بیوقوفی ہے جو اس کی بنیاد پر خلافتِ اسلامیہ کو تعصب کا الزام دیتے ہین ۔

اس الحاکم کی موت کا واقعہ بھی حیرت انگیز ہے ۔ اُس کا ایک عمدہ سفید گدھا تھا جس کا نام "قمر" رکھا گیا تھا ۔ ۱۷ ۔ شوال ۴۱۱ھ ہجری کو دوشنبے کی رات تھی کہ وہ اُس گدھے پر سوار ہو کے سیر کو نکلا ۔ اور چونکہ تنہائی پسند کرتا تھا اس لیے ہمراہیون کو ساتھ آنے سے منع کیا ۔ مصر کی آبادی کے باہر رات بھر پھرتا رہا صبح کو حلوان کا رخ کیا جو دار السلطنت سے ۵ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا شہر تھا جسکی نزہت گاہین نہایت

دلکش و روح افزا تھین ۔ اسوقت دو سوار ہمراہ رکاب تھے ۔ ایک ایک کر کے اُن دونون کو بھی رخصت کر دیا اور آگے کی راہ لی ۔ بس اُسوقت سے اُس کا پتہ نہ چلا کہ کیا ہوا اور کہان گیا ۔ زمین کھا گئی یا آسمان؟ ماہ شوال کی ۳۰ ۔ تک لوگ روز جلوس کا سامان اور سواری کے گھوڑے لے کے شہر کے باہر نکلتے اور شام کو ناکام واپس آتے ۔ آخر ۲ ۔ ذیقعدہ کو اُسکے غلامون اور ترک سپاہیون کا ایک گروہ اُسکی جستجو مین نکلا ۔ جب ڈھونڈھتے ہوئے پہاڑون کے درون مین گھسے تو اُسکی سواری کا گدھا قمر ملا ۔ مگر اس حالت مین کہ اُسکے چارون پاؤن تلوار سے کٹے ہوئے تھے ۔ مگر زین و چارجامہ بدستور اُس کی پیٹھ پر تھا ۔ اس سے آگے بڑھے تو ایک گدھے کے اور اُسکے آگے پیچھے دو پیدل آدمیون کے نقش قدم نظر آئے ۔ اُنکو دیکھتے ہوئے وہ سب ایک تالاب پر پہونچے جو حلوان کے مشرق جانب تھا ۔ تجسس کرنیوالون مین سے دو شخص پانی کے اندر اُترے تو اُس کا پورا شاہی لباس بھی مل گیا جس مین سات بٹنے تھے اور پائجامہ بھی اس وضع مین ملا کہ گویا کھول کے اُتارا نہین گیا تھا ۔ مگر چھرون کی ضرب سے کپڑے کٹے نظر آئے ۔ بہر تقدیر اُسکے کپڑے محل مین لائے گئے ۔ اور سب کو یقین ہو گیا کہ وہ دشمنون کے ہاتھ سے مارڈالا گیا ۔ اور بعض لوگون کا خیال تھا کہ یہ خود اُسکی بہن کی سازش کا نتیجہ تھا ۔ لیکن بہت سے ایسے بے وقوف ایسے بھی پیدا ہو گئے جو حلف اُٹھاتے تھے کہ الحاکم مرا نہین صرف غائب ہو گیا ہے اور اس غیبت کے بعد عنقریب ظاہر ہوگا ۔

انہار بحر

قدرت نے دنیا مین عجیب و غریب چیزین پیدا کی ہین ۔ موجودہ زمانے کی سائنس کی ترقیان اور بڑے بڑے شاندار تجربات ہر چیز کے وجوہ اور اسباب دریافت کرتے جاتے ہین مگر اب بھی بہت سی چیزین ایسی ہین جن مین عقل انسانی حیران ہے ۔ انھین مین سے ایک انہار بحر ہین جنکے متعلق کوئی قطعی طور پر نہین کہہ سکتا کہ کیون جاری ہین؟ قرآن مجید مین خداوند جل و علا فرماتا ہے "مرج البحرین یلتقیان بینہما برزخ لا یبغیان" ۔ اس کی پوری اور سچی تفسیر پوچھیے تو ان انہار بحر کا پتہ لگنے سے پہلے

دریا میں کسی کو نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔ لیکن اب موجودہ تحقیقوں اور جستجوؤں کے بعد دیکھتے ہیں کہ سمندر ہی کے اندر کس طرح نہریں جاری ہیں اور کیونکر بغیر کسی حجاب و برزخ کے ایک پانی خاموش و متحرک رہتا ہے اور دوسرا زور و شور سے جاری ہے۔

انہار بحر سمندر کے دریا ہیں۔ ہمارے بہت سے ناظرین حیران ہونگے کہ سمندر میں دریا کیسے؟ مگر خدا کی قدرت ایسے ہی معجزات دکھاتی رہتی ہے۔ جس طرح خشکی پر ہزاروں ندیاں بہ رہی ہیں بالکل اُسی طرح سمندر میں بھی ہیں۔ اس بارے میں کہ یہ سمندر میں کیونکر جاری ہیں بہت سی رائیں قائم کی گئی ہیں۔ مگر اُن میں سے کوئی توجیہ ایسی نہیں جو دل میں جم کے بیٹھ جائے۔ پہلی وجہ تو یہ بتائی جاتی ہے کہ آفتاب کی تمازت سے خط استوا اور اُس کے آس پاس کا پانی گرم ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ عام قاعدہ ہے کہ گرم چیز پھیلتی ہے اس لیے یہ گرم پانی بھی پھیلتا، اپنی سطح سے کسی قدر اونچا ہو کے بہتا، اور قطبین کی طرف چلتا ہے۔ جہاں کا پانی ٹھنڈا اور خط استوا کے پانی کی سطح سے کسی قدر نیچا ہے۔ اس طریقے سے پانی کا ایک بہاؤ قائم ہو جاتا ہے اور گرمی کے اُبھارے جو جوف پیدا ہوتا ہے اُس کی جگہ بھرنے کے لیے قطبین کے پاس سے سرد پانی نیچے ہی نیچے بہ کر خط استوا کی طرف آتا رہتا ہے۔ یہی سمندر کی بالائی اور اندرونی نہریں ہیں۔ قطبین کی طرف سے جو نہریں خط استوا کی طرف آتی ہیں وہ اکثر سطح آب کے نیچے ہوتی ہیں اور دکھائی نہیں دیتیں۔ مگر بعض سطح آب کے اوپر بھی ہوتی ہیں۔ اگر سطح زمین پر ہر جگہ ایک ہموار گہرائی کا سمندر ہوتا تو اُس کے دَور کی وجہ سے سب جگہ کے پانی کی حرارت ایک ہی درجے پر رہتی۔ مگر سمندر کی گہرائی کہیں کم ہے کہیں زیادہ۔ کہیں اُس کی سطح کے اوپر زمین بھی نکل آئی ہے۔ لہذا اس پانی کی رفتار کے خاص خاص راستے مقرر ہو گئے ہیں جو عظیم الشان نہروں کی طرح سمندر ہی میں بہتے بہتے قطبین کی طرف جاتے ہیں اور وہاں سے سطح آب کے اندر ہی اندر خط استوا تک آتے ہیں۔

اس پانی کے دَور کے خاص راستے مقرر ہو جانے کے مختلف وجوہ ہیں ایک تو یہ وجہ پیش کیجاتی ہے کہ جس طرف سطح آب پر ہوا چلتی رہتی ہے اُسی طرف ان نہروں کا بھی رُخ ہو جاتا ہے۔ اور بعض زمانۂ حال کے جغرافیہ دان اسی کو

ان انہار کے جاری ہو جانے کا اصلی سبب بتاتے ہیں۔ اور اصل بھی یہی ہے کہ ہوا سمندر کی سطح پر بہت بڑا اثر کرتی ہے۔ اور بہت سی سمندر کی چھوٹی چھوٹی نہریں محض ہوا کی رفتار سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ بحر ہند میں چونکہ ہوا کا رخ موسم کے ساتھ بدلتا رہتا ہے لہذا جس طرف کی ہوا ہوتی ہے اُسی طرف ان نہروں کا بھی رُخ ہو جاتا ہے لیکن سمندر کی اندرونی یعنی سطح آب کے نیچے کی نہروں کے لیے یہ وجہ نہیں ہو سکتی۔ سمندروں کے بعض حصوں میں ہوا ہمیشہ شمال و مغرب کی طرف چلا کرتی ہے اور بعض مقامات پر جنوب و مغرب کی طرف۔ بس ان حصوں میں سب سے بڑی بڑی نہریں ہمیشہ مغرب ہی کی جانب بہتی ہیں۔ بعض مقامات پر نہریں مشرق کی جانب بھی جاری ہیں۔ کہ وہاں ہوا کا رخ بھی مشرق ہی کی طرف ہوتا ہے۔

عام قاعدہ ہے کہ زمین کی گردش کی وجہ سے کوئی چیز اگر کرۂ زمین پر حرکت کرتی ہو تو اگر وہ خط استوا سے شمال میں ہو تو داہنی جانب اور اگر جنوب میں ہو تو بائیں جانب کسی قدر ہٹ جائے گی۔ اسی وجہ سے یہ سمندر کی نہریں بھی جو مغرب کی جانب بہتی ہیں کسی قدر اپنے داہنے یا بائیں جانب مُڑ جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی زمین کا حصہ ملتا ہے جو روک کے اُن کا رُخ بالکل پلٹ دیتا ہے۔ اور وہ بجائے مغرب کی طرف جانے کے بالکل مشرق کی طرف منہ کر کے بہنے لگتی ہیں۔ بحر اٹلانٹک کی بڑی نہر مغرب کی طرف چلتی ہے۔ یہ اتنی بڑی ہے کہ چوڑائی میں خط استوا کے شمال اور جنوب دونوں جانب ہوتی ہے جو خط استوا کے شمال میں ہے وہ کسی قدر داہنے جانب ہٹ جاتی ہے۔ اور وہ بھی ساحل امریکہ سے ٹکرا کے اور دوسری طرف سے مُڑ کے مشرق کی طرف واپس ہوتی ہے۔

اگر کرۂ زمین پر تمام سمندر ہی سمندر ہوتا تو غالباً ان سب نہروں کا رخ قریب مغرب ہی کی جانب ہوتا۔ لیکن خشکی کے بڑے بڑے حصے سمندر کی سطح کے اوپر اُٹھے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے یہ نہریں شمال اور جنوب کی طرف مڑ جاتی ہیں اور اس سے ایک دَور قائم رہتا ہے تاکہ قطبین کا سرد پانی خط استوا کے قریب آ کر وہاں کے پانی کی حرارت کو کم کرتا رہے اور خط استوا کے پاس کا گرم پانی وہاں جا کے کسی قدر حرارت پیدا کر دے۔

بحر اٹلانٹک کی شمالی نہر جب ساحل امریکہ سے ٹکرا کے اور خلیج میکسکو میں سے گھوم کے نکلتی ہے تو انگریزی جغرافیہ دان اسکو گلف اسٹریم یعنی خلیج کی نہر کہتے ہیں یہی نہر بہتے بہتے برطانیہ کے جزائر اور شمالی یورپ کے ساحلوں سے گذرتی ہوئی بحر منجمد شمالی میں پہونچ کے غائب ہو جاتی ہے۔ ملک ناروے کے بندرگاہ اسی کی وجہ سے سال بھر جہازوں کی آمد ورفت کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ اگر اس کا گرم پانی وہاں سے نہ گذرتا تو یقیناً سال کے زیادہ حصے میں وہاں برف ہی برف ہوتی۔ کیونکہ بحیرۂ بالٹک کا دہانہ جو اس سے ۵۰۰ سال خط استوا کی طرف ہٹا ہوا ہے سال کے زیادہ حصے میں برف سے بند رہتا ہے اور بحیرۂ اسود جو اس سے بھی زیادہ خط استوا کی طرف ہٹا ہوا ہے وہ بھی جاڑوں میں اکثر جم جاتا ہے۔ مگر ناروے کے بندرگاہ ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور اُن کا سمندر کبھی نہیں جمتا۔

اچھا اب اُس نہر کو دیکھو جو بحر منجمد شمال کی طرف سے بہتی ہوئی ملک لیبریڈر کے ساحل کے پاس سے گذرتی ہے۔ لیبریڈر اور انگلستان قریب قریب ایک ہی خط میں واقع ہوے ہیں۔ یعنی خط استوا سے دونوں کا فاصلہ قریب قریب برابر ہے اور اس لحاظ سے دونوں جگہ سردی اور گرمی برابر ہونی چاہیے تھی۔ مگر انگلستان کے سواحل ہمیشہ برف سے صاف رہتے ہیں اور لیبریڈر کے ساحل سال میں ۹ مہینے سے زیادہ برف کی وجہ سے بند رہتے ہیں۔

بعض جگہ سمندر میں ٹھنڈی اور گرم نہریں مل جاتی ہیں یہاں اکثر کہر اپڑا کرتا ہے اور وہاں کے پانی میں تلاطم بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔

عام سمندر کے پانی میں اور ان نہروں کے پانی میں اکثر اختلاف بھی ہوتا ہے اگر نہر خط استوا کی طرف سے آتی ہے تو اُس کا پانی سمندر کے پانی سے زیادہ گرم ہوگا اور رنگ میں بھی کسی قدر زیادہ سیاہی مائل ہوگا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جہاز کے ایک طرف تو سمندر کا پانی ہے اور دوسری جانب نہر کا پانی۔ ایک طرف ڈول ڈال کے پانی نکالا جائے تو ٹھنڈا نکلے گا اور دوسری جانب اُس سے زیادہ گرم اور زیادہ سیاہی مائل۔ مگر ایسے مقامات سے جہاز کو بہت جلد نکال لے جاتے ہیں کیونکہ وہاں جہاز میں غیر معمولی حرکت ہونے لگتی ہے۔

یہ سمندر کی نہریں جن ملکوں میں ہو کے گذرتی ہیں وہاں کی آب وہوا پر بھی بہت اثر ڈالتی ہیں۔ مثلاً انگلستان کے موسم میں اسی گلف اسٹریم کی بدولت ایک خوشگواری پیدا ہو گئی ہے ورنہ وہاں سردی بہت زیادہ ہوتی۔ تجارت کو بھی ان نہروں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ بہت سے مقامات کی بندرگاہیں بعض انھیں کے اثر سے جہازوں کی آمد ورفت کے لیے سال بھر کھلی رہتی ہیں ورنہ برف سے بند رہتیں۔ بعض مقامات پر جہاز کو اپنی رفتار میں ان سے مدد ملتی ہے۔ مثلاً جو جہاز افریقہ کے جنوبی راس امید کے پاس سے ہو کر گذرتے ہیں اگر وہ انگلستان سے آسٹریلیا کی طرف جاتے ہوتے تو وہ ساحل سے بہت دور ہٹ کے نکل جاتے ہیں تاکہ اُن کو اُس نہر میں ہو کے چڑھاؤ نہ کاٹنا پڑے جو وہاں ساحل کے قریب جاری ہے۔ اور جو جہاز انگلستان کی طرف جاتے ہیں وہ ساحل سے قریب قریب جاتے ہیں تاکہ اُنکو اپنی رفتار میں اُس کے بہاؤ سے مدد ملے

یہ نہریں خشکی کی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ بہت لمبی چوڑی ہوتی ہیں۔ گلف اسٹریم کی چوڑائی تقریباً ۴۰ میل ہے اور ۳۰۰۰ فٹ سے زیادہ گہری ہے۔ بعض جگہ اس کی چوڑائی اس سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ پانی کے رنگ میں بھی ایک بہت ہی نمایاں اختلاف ہے کیونکہ اس کا پانی گہرے نیلے رنگ کا ہوتا ہے۔

جاپان کے قریب سے جو نہر بہتی ہے اُس کا رنگ سیاہ ہے اور اسی وجہ سے وہاں کے لوگ اُسے "کوروسیوا" یعنی کالی ندی کہتے ہیں۔ یہ نہر بھی جاپان کو وہی سب فائدے پہونچاتی ہے جو گلف اسٹریم انگلستان اور ناروے کے موسم اور سواحل کو پہونچاتی ہے۔

غرضکہ تمام دنیا کے سمندروں میں اسی طرح کی ہزاروں نہریں جاری ہیں جو بہتی رہتی ہیں اور تمام جہان پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔

دنیا کا سب سے بڑا اسٹیمر ٹائٹانک جو سال ڈیڑھ سال قبل تباہ ہو گیا تھا بعض انھیں انہار بحر میں سے ایک کی بدولت تباہ ہوا جو برف کا ایک بہت بڑا پہاڑ جو بیس بائیس میل لمبا چوڑا تھا اسکو گلف اسٹریم قطب شمالی سے بہا کر بحر اٹلانٹک میں لے آئی اور جہاز مذکور اُس سے ٹکرا کر تباہ و برباد ہو گیا۔

الغرض یہ سمندر کی نہریں عجائباتِ قدرت میں سے ہیں جن سے دنیا بے انتہا
فائدہ اُٹھا رہی ہے۔

کہانت

کہانت کے لغوی معنی فال گوئی کے ہیں۔ اور اسی لیے اُس شخص کو جو غیب کی
باتیں بتائے اور اپنے آپ کو مخفی اسرار سے واقف ظاہر کرے "کاہن" کہتے
ہیں۔ اسلام سے پہلے تمام مذاہب کے حالات پر غور کیجیے تو صاف نظر آتا ہے
کہ دینی پیشوائی اور مقتدائی کے لیے کہانت لازمی تھی۔

مصریوں کے مقتداؤں نے اپنے آپ کو نامعلوم اسرار و رموز کا خزانہ بنا رکھا تھا۔
قوم بتوں، مگرمچھوں، بیلوں، پرواؤں وغیرہ کی پرستش کرتی تھی۔ لیکن الٰہیات
کے مسائل رموز باطنی کی طرح صرف مقتداؤں تک محدود تھے جو آداب مذہبی
کی تعلیم کے ساتھ غیب کی باتیں بھی بتا دیا کرتے۔ بابل والوں نے رمل اور نجوم
کے فن کو ہندوؤں کی طرح جزوِ دین بنا لیا تھا جس کی مدد سے وہ ہر امر میں آئندہ
کی بابت حکم لگایا کرتے۔ اُن کی اسی دینی جستجو نے علم ہیئت کو مدون کیا۔ کواکب
کے اثرات اور اُنکے افعال و خواص مقرر کیے۔ اجرام فلکی کے نام رکھے
انکی حرکتوں کا پتہ لگایا اور باور کرا دیا کہ نجوم کے ذریعے سے جو الٰہیات
سے وابستہ تھا انسان غیب کی باتوں کو بتا دیا کرتا ہے۔ ہندوؤں اور بابلیوں
کے قدیم مسائل بہت ملتے جلتے ہیں۔ اور نجوم و الٰہیات کے لحاظ سے ضرور
ماننا پڑتا ہے کہ یا تو نجوم و ہیئت کو بابلیوں نے ہندوؤں سے لیا یا ہندوؤں نے
بابلیوں سے حاصل کیا۔ لیکن چونکہ یہ امر تاریخ کا ایک طے شدہ مسئلہ ہو گیا ہے
کہ آریہ لوگوں نے سمٹک لوگوں (بنی سام) کے بعد ترقی کی اس لیے زیادہ
قرین قیاس یہ ہے کہ بابل والوں کے علوم ہیئت و نجوم بعد کے زمانے میں
پورے پورے ہندوؤں میں منتقل ہو آئے۔ اور اسی وجہ سے دونوں کی
کہانت بھی ایک ہی قسم کی ہے۔ ہندو پنڈت پترہ دیکھ کے اور زائچہ کھینچ کے
جس طرح بعد والی باتیں بیان کیا کرتے ہیں اسی طرح بابل کے پوجاری اور

اُن لوگ بھی بتایا کرتے تھے۔ آتش پرستوں میں بھی کہانت تھی۔ اور غالباً اُسی
سم کی ہو گی جیسی کہ اہل بابل میں تھی۔ اگرچہ اُن کی کہانت کے زیادہ مشرح حالات
ہیں نہیں معلوم ہو سکے۔

یونانیوں میں بھی کہانت تھی مگر بابل والوں کی کہانت سے بہت ادنی درجے
کی۔ اگرچہ انھوں نے بھی ہیئت و نجوم کو حاصل کر لیا تھا مگر جہاں تک پتہ لگایا
جاتا ہے یہ فنون اُن کے دین کے اصلی عنصر نہیں بننے پائے تھے۔ اُن کے کاہن
بڑے بڑے مندروں کے پوجاری تھے۔ اور اُن کی کاہنہ عورتیں وہ کنواری لڑکیاں
ھیں جن کی زندگی بتخانوں اور مندروں کی نذر ہو جاتی۔ اپالو کے مندر میں جو
یونانیوں کا سب سے بڑا مندر تھا لوہے کی ایک تپائی پر یہ لڑکیاں برہنہ کر کے
ھائی جاتیں اور نیچے کچھ بخور سلگا دیے جاتے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس
ی کے دماغ پر کچھ ایسا اثر پڑتا کہ حواس مختل ہونے لگتے۔ اور بیہوشی کے عالم
میں وہ بکنا شروع کرتی۔ اُس کے الفاظ پر مجذوبوں کی بڑ کی طرح غور کیا جاتا
ان میں طرح طرح کے معنی پہنائے جاتے۔ اور اُنھیں سے اپنی آرزوؤں اور
ارادوں کے موافق یا مخالف جواب حاصل کر لیا جاتا۔ یہی یونانیوں کی وہ فالیں
ہیں جنکا اگلے دنوں بڑا شہرہ تھا۔ اور جنکے سچ ثابت ہونے اور پورے اُترنے پر
قدیم مورخین عقیدتمندانہ حیرت ظاہر کرتے ہیں۔

رومی چونکہ علوم و فنون کی طرح مذہب میں بھی یونانیوں کے پیرو تھے اور اپنے
تاؤں کی کہانیوں۔ اُنکے حالات و خیالات اور واقعات کو یونانی دیوتاؤں
موافق ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے اس لیے اُن کی کہانت بھی یونانیوں
کہانت سے ملتی ہوئی تھی۔ یہ بات لطف سے خالی نہیں ہے کہ مشرق و مغرب
کہانت میں ایک نمایاں فرق تھا۔ مشرق میں بابل والوں ایرانیوں اور ہندوؤں
میں کہانت کا دارومدار ایک باضابطہ فن نجوم پر تھا۔ اور کسی برکت و نعمت
صل کرنے یا کسی مصیبت و آفت کے دور کرنے کی تدبیریں بھی یہ مشرقی لوگ
یں فنون کے اصول کی پابندی میں کیا کرتے تھے۔ بخلاف اسکے یونانیوں
ومیوں کی کہانت کو مجذوب پرستی سے زیادہ وقعت نہیں حاصل تھی۔

بنی اسرائیل مین بھی کہانت تھی - مگر اُنکی کہانت بالکل جداگانہ تھی - اُن مین
حضرت ابراہیمؑ اور جناب موسیٰؑ کی تعلیمات نے نبوت کی ایک خاص شان پیدا کر
دی تھی - حضرت موسیٰ کے بعد سے اُن مین نبیون کے پیدا ہونے کا ایک سلسلہ قا
ہوگیا تھا - جو عابد و زاہد نیک نفس و پاک باطن لوگ ہوتے اور ریاضت و اتقا
ذریعے سے تزکیۂ نفس کیا کرتے - ان لوگون کو مراقبے مین مکاشفہ ہوتا - اور
باتین اُن سے پوچھی جاتین اُن کا جواب گویا وہ خدا سے پوچھ کے دیا کرتے
اور اپنے آپ کو اسرار باطن اور رموز ربانی سے واقف ظاہر کرتے - اُنھین ا
کا طریقہ اُن کے کاہنون نے بھی اختیار کیا - اور جب انبیا نہ ہوتے یا بعد
ایام مین جب نبیون کے مبعوث ہونے کا سلسلہ موقوف ہوگیا تو ہر جگہ اور ہر
مین اُن کے مرتاض و نفس کش مقتدا آنکھین بند کرکے عالم ملکوت کی سیر کر
اور قوم کو اُس کے خیالات و عقائد کے مطابق عجیب قسم کے تحکمانہ لہجے ا
انوکھے دلچسپ الفاظ مین بتا دیا کرتے کہ اس معاملے مین یہ ہوگا - اور یہ بات
یون ہونے والی ہے -

اس قسم کی کہانت دوسری قدیم قومون مین بھی تھی - بلکہ یون کہنا چاہیے
کہ ساری شرقی و غربی قومون مین اسی قسم کے غیب دان اور اسرار باطنی ک
جاننے والے کاہن ریاضت و مجاہدۂ نفس کے ذریعے سے پیدا ہوا کرتے تھ
ادھر بابلیون اور ہندوؤن مین بھی جہان نجومیون اور اجرام فلکی کے اث
جاننے والے پنڈتون کا زور تھا وہان ایسے مرتاض اور تارک الدنیا اشخاص
بھی موجود تھے جن کے لہجے اور طرز گفتگو سے ظاہر ہوتا کہ مبدأ فیاض کی طرف سے
غیب کی باتین اور مشکل سے مشکل مسائل کے حل اُن کے دلون پر القا ہوجا
ہین اور الہام کے ذریعے سے انکو معلوم ہوجایا کرتا ہے کہ آیندہ یہ ہونے وا
ہے - اور فلان شخص کی قسمت مین یہ لکھا ہے - علیٰ ہذا القیاس یونانیون اور
رومیون مین بھی مندرون کے معمولی پوجاریون کے علاوہ اس قسم کے رموز باطن
جاننے والے راہبون اور عزلت گزینون کا پتہ چلتا ہے - لیکن سچ یہ ہے کہ اس
قسم کی کہانت کا آغاز تاریخی طور پر بنی اسرائیل کے انبیا اور کاہنون ہی سے

شروع ہوا - اگرچہ آخر مین یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابل کے صابئی لوگون کی کہانت
بنی اسرائیل پر غالب آگئی تھی - اسی کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ سحر بابل کی ساری دنیا
مین شہرت ہوگئی اور عیسائی حضرت مسیح کی پیدایش سے پیشتر ہی اُنکی آمد کا منتظر
اور اُنھین ایک ستارے کے ذریعے سے پہچان کے ایمان لانے والا جنھا بلی کاہنو
ہی کو بتاتے ہین جیسا کہ اناجیل مین مذکور ہے -

یہ کہنا کہ یہ زاہد و مرتاض لوگون کی کہانت کس قوم سے شروع ہوئی اور
کس ملک نے کس سے لیا فضول ہے - اس لیے کہ یہ ایک فطرتی چیز تھی انسان
کی فطری کرشمہ پرستی اُسے ہر جگہ پیدا کر لیتی تھی - یہ پرانا خیال ہے کہ روح چونکہ
لطیف اور مخفی شے ہے اس لیے وہ ہر مخفی راز کا پتہ لگا سکتی اور اسرار سرمدی
کے ہر حرم مین پہونچ سکتی ہے بشرطیکہ اُس کا تزکیہ کیا جائے جسمانی تقاضون
سے مبرا کر لی جائے اور اُس مین خلوص پیدا ہوجائے - اسکے ساتھ انسان
کی فطرت ہے کہ وہ جس جگہ اپنی تدبیرون مین عاجز آتا ہے نامعلوم ذرائع ڈھونڈھنے
لگتا ہے - اور بڑی بے صبری کے ساتھ جویا ہوتا ہے کہ کوئی اس مشکل کا دفعیہ
بتا دے - لہذا ہر وحشی سے وحشی قوم مین نوع انسانی کے اس فطری تقاضے نے
کہانت کو کسی نہ کسی عنوان سے ضرور پیدا کرا دیا -

عرب کے بت پرستون سے جاہل کون ہوگا جنکی بت پرستی نہایت ہی
مزخرف اور بے اصول طریقے کی تھی - مگر اُن مین بھی ہر جگہ کاہن موجود تھے - پھر
اس کے بعد جزیرہ نماے عرب مین بیرونی مذاہب کا ہجوم روز بروز بڑھتا گیا
پارسی بھی تھے، یہودی بھی تھے، عیسائی بھی تھے - اور تو اور بابل کے مہذب بت
پرست جو اپنے آپ کو سب سے بڑا موحد خیال کرتے ساری دنیا مین فنا کر دیے
گئے تھے اور عراق مین اُن کا نام و نشان بھی نہین باقی رہا تھا مگر ارض حجاز مین
وہ بھی موجود تھے - اور اُن سب کے کاہن عرب مین ہر جگہ موجود تھے اور
کہانت کا کام اختیار کرتے ہی وہ مذہب کی طرف سے کچھ ایسے غیر متعصب ہو
جاتے کہ سب قومین عام اس سے کہ کسی مذہب سے وابستہ ہون بلا لحاظ مذہب
اپنی مشکلین لے کے اُنکے سامنے آتین اور وہ اُنکو ایسے جواب دیتے کہ اُنکی تسلی

و تشفی ہو جاتی - اور اپنے نزدیک کامیاب اور بامراد ہو کے اپنے گھر دن کو واپس
جاتین - اُن دنون عرب کی اصلی حکومت اگر سچ پوچھیے تو اُنھین کاہنون کے ہا[تھ]
مین تھی - جنکے سامنے نہ کسی سردار قبیلہ کی چلتی اور نہ کسی تاجدار و فرمانروا کی -
جاہلیت عرب کے کاہنون کے احکام و الفاظ اگر ایک جگہ جمع کر دیے جا[ئین]
تو ایک عجیب قسم کا پُر لطف لٹریچر بن جائے گا - جن کے الفاظ مین غیر معمولی لطافت
معنی خیزی - فصاحت و بلاغت - قافیہ بندی - اور پیغمبرانہ حکومت ہوتی - اور
ایسا معلوم ہوتا کہ جس شخص کی زبان سے وہ الفاظ نکلتے ہین وہ نہین بول
رہا ہے بلکہ اُس کے جسم کے اندر سے کوئی فرشتہ باتین کر رہا ہے - اس قسم کے صد[ہا]
کاہن اور صدہا کاہنہ عورتین ارض عرب کے مشہور مقامات مین پھیلی ہوئی تھین
جن کے پاس دور دور سے بڑے بڑے قافلے اپنی آرزوئین اور تمنائین لے کر
آیا کرتے اور شاد کام و مطمئن واپس جاتے - جس طرح یونانی مندرون کی فالون
کی نسبت بتایا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ پوری اُترین اُس سے زیادہ حیرت سے ہم
دیکھتے ہین کہ عرب کے کاہنون اور کاہناؤن کے احکام پورے اُترا کرتے تھے -
اور بعض موقعون پر تو اُنھون نے ایسے سچے حکم لگائے اور اس طرح غیب کی
باتین بیان کر دین کہ اگر ان واقعات کو سچ تسلیم کر لیا جائے تو اُن غیب کی باتین
بتانے والون کی غیب دانی کی کوئی توجیہ نہین ہو سکتی -

اگلی دنیا چونکہ اُن تمام واقعات کو باور کرتی تھی لہذا ادنی و اعلی - جاہل و
عالم سب نے تسلیم کر لیا کہ انسان کسی ذریعے یا کسی ریاضت سے ایسا کمال حاصل
کر لیا کرتا ہے کہ غیب کی باتین بتا دے - اور جب یہ مان لیا گیا تو ہر شخص اپنے
مذاق و خیالات کے مطابق اس کی توجیہین بھی کرنے لگا -

چنانچہ یونانیون اور رومیون نے باوجود فلسفہ و منطق مین اعلی نمود حاصل
کرنے کے اس امر کو قبول کر لیا کہ انسان غیب کی باتین بتا سکتا ہے - بعض نے اسکی
یہ توجیہ کی کہ نفوس انسانی تصفیۂ باطن کے ذریعے سے اسرار فطرت سے واقف و
آگاہ ہو جاتے ہین - اور جیسا وہ چاہتے ہین ویسا ہی ہو جایا کرتا ہے - اس لیے کہ
اُن کے خیال مین تمام اشیا کی صورتین مثل افلاطون کی رو سے عالم کلی مین موجود تھین

ہمان یک بار پانے کے بعد انسان اُن پر تصرف بھی کر سکتا تھا - یہ تو اعلی درجے
کے ازکی خیال علماے روحانی کا خیال تھا - مگر بعض نے کہہ دیا کہ روحین جو جسمون
کے قفس سے آزاد ہین اور نیز اجنہ اُن کے بس مین ہو کے اُن کے موکل بن جاتے
ہین اور وہی اُنھین امور غیب سے آگاہ کر دیتے ہین -

عیسائیون نے جو قرون وسطی مین کہانت کے تماشے اور ولایت کے کرشمے
سب سے زیادہ دکھایا کرتے تھے اپنے کاہنون کی غیب دانی اور اُنکے تصرفات
الہی کا یہ اصول قرار دیا کہ حضرت مسیح خدا ہونے کی وجہ سے غیب کی باتین جانتے
تھے - لہذا اُن کا نفس ربانی جس پر اثر کرے وہ بھی اُن رموز باطنی سے واقف
ہو جاتا ہے - قطع نظر اسکے مسیحیون مین علم کا دیوتا یا خدا روح القدس ہے - اور
جو کچھ بھی معلوم ہو یا کسی قسم کا علم حاصل ہو اُس کی نسبت سمجھا جاتا ہے کہ اُسی
روح القدس نے آگے اپنا کمال دکھایا ہے - اور اگلے دنون چند روز تک سچے
اور خالص العقیدہ مسیحیون پر روح القدس کے آنے کی وہی شان رہی جو شان کسی
کے سر پر کسی جن یا بھوت کے آنے کی ہوتی ہے - اس لیے غیب کی باتین بھی مسیحیون
کے خیال کے مطابق روح القدس آ کے مقدس لوگون کی زبان سے ظاہر و آشکارا
کر دیا کرتا تھا -

صابئی لوگون مین غیب دانی و کہانت کی یہ تھیوری تھی کہ اوزیریس اور
واہس اول و دوم جن سے مراد ہرمس اور اغاثیمون ہین اصلی دانایان غیب تھے -
الغرض صابی لوگ اپنے مذہب کے پیغمبر بتاتے تھے - انھین کی توجہ و برکت سے اور لوگ
بھی غیب کی باتین جانتے ہین - خلاصہ یہ کہ یہی لوگ اُنکے روح القدس تھے جنکا
فیض بعد والون کو بھی غیب دان بنا دیا کرتا - اس سے اُن کو قطعی انکار تھا
کہ اجنہ یا موکل روحین آ کے انسان کو غیب کی باتین بتاتی ہین - بلکہ اُن کا یہ
خیال تھا کہ مذکورہ پیغمبرون کو مجاہدہ و تزکیۂ باطن کے ذریعے سے ایسی صفاے
قلب حاصل ہو گئی تھی کہ اسرار غیب سے مطلع ہو گئے تھے -

کہانت کا سکہ قدیم الایام مین اس قدر بیٹھا ہوا تھا کہ اُس عہد کے فلسفی
اور علماے طبیعی بھی کاہنون کی غیب دانی کے قائل تھے - اور اس کی توجیہ یہ

یہ کرتے کہ کہانت ایک لطیف جذبۂ نفسانی ہے جو صفائی قلب اور نفسانی
اور حس کی لطافت سے انسان مین پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض نے اُسے علم نجوم
اور آثار فلکی سے وابستہ کرکے کہا جو بچہ ایسے طالع مین پیدا ہو کر عطارد محل
شرف پر ہو۔ اور باقی سیارات ستہ بھی اچھے عقد مین ہون اور عمدگی سے ایک
دوسرے کی طرف ناظر اور متواضع واقع ہون وہ لڑکا ان ستارون کے
سے لازمی طور پر کاہن اور غیب دان ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ اسکے طرفدار اور ماننے والے علما سے روحانیین
جن کا بیان تھا کہ نفس ناطقۂ انسانی جب قوی اور زبردست ہوتا ہے تو
طبیعت کو مغلوب کرکے دبا دیتا ہے۔ اور انسان پر لطیف راز کو آشکارا کرکے
رمز معنوی سے واقف کر دیتا ہے۔ یہ کہتے ہین کہ انسان مین دو چیزین ہین
روح اور جسم۔ جسم بغیر روح کے کوئی چیز نہین۔ جب روح نہ ہو تو اُس
مین نہ قوت ہوتی ہے اور نہ عقل و فہم۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حس
حرکت اور ادراک و فہم سب چیزین روح مین ہین۔ اور روحون کی مختلف حالت
ہے۔ بعض مین حس زیادہ ہوتی ہے۔ بعض مین دانائی زیادہ ہوتی ہے بعض مین
جلا اور روشن ضمیری بڑھی ہوتی ہے۔ لہذا جس روح مین روشن ضمیری زیادہ
ہو اُس پر عجیب عجیب انکشافات ہوتے ہین۔ اور اسرار غیب کو وہ معلوم کر لیتی ہے
بہرحال دُنیا انھیں اختلافات مین پڑی ہوئی تھی۔ اور اُس کے ساتھ
طرح طرح کے خرافات بڑھتے اور پھیلتے چلے جاتے تھے جن کو انسانی عقل کی
کمزوری اور بڑھا رہی تھی۔ اور بجاے اسکے کہ تحقیق و تنقید سے کام لے کے
کوئی نتیجہ حاصل کیا جائے لوگ اُس کی توجیہین کرتے اور طرح طرح کے معنی پہنا کے
کہانت کو اور چمکاتے جاتے تھے۔

یہان تک کہ دنیا مین نور اسلام چمکا۔ اور خدا نے ہر چیز کو ایک نئی روشنی
مین دکھا کے تمام اگلی غلط خیالیون کو دُور کر دیا۔ اسلام نے صاف کہدیا کہ غیب
کو سوا خدا کے کوئی نہین جانتا۔ اور غیب دانی کے جو کچھ دعوے کیے جاتے ہین
سب لغو۔ مہمل اور بے سروپا ہین۔ اس طریقے سے اسلام نے اپنے ظہور کے

ساتھ ہی نجوم و کہانت کا چراغ گل کر دیا۔ اور اس قسم کے مدعیان غیب دانی کا زور
توڑ دیا گیا۔ یہ اصلاح سچ یہ ہے کہ اسلام کے اولیات مین سے ہے یعنی ایسے
وقت مین جبکہ سارے عالم پر کہانت کی حکومت تھی اور دینی پیشوائی کا لازمی جزو
غیب دانی تھا اور دنیا مین کسی کی نظر اُسکے ابطال کی طرف نہین گئی تھی۔ یک
بیک اسلام کی طرف سے اس بات کا ڈھنڈھورا پٹ گیا کہ عالم الغیوب سوا
خدا کے کوئی نہین اور جو کوئی اس کا دعوی کرے وہ جھوٹا ہے۔

بے شک خود جناب سرور کائنات صلعم نے چند غیب کی باتین یا بعض پیشین
گوئیان فرمائین لیکن اُن کی نسبت صاف طور پر بتا دیا گیا کہ خدا نے فرشتے
کو بھیج کر اپنے پیغمبر کو اُن سے آگاہ کر دیا۔ دراصل وہ خدا کی غیب دانی کا جلوہ
تھا اُسے حضرت رسالتؐ کی غیب دانی ہرگز نہین کہہ سکتے۔ اور جب آنحضرتؐ
کی وفات کے بعد جبرئیلؑ کے آنے کا سد باب اور سلسلۂ نبوت کا اختتام ہو گیا تو
پھر کوئی وجہ ہی نہین باقی رہی کہ دنیا مین کوئی شخص اسرار غیب سے واقف
ہونے اور آیندہ کی باتین بتانے کا دعوے کر سکے۔

بہرحال اسلام نے نجوم و کہانت کو بیخ و بنیاد سے اُکھاڑ کے پھینک
دیا۔ مگر افسوس چند روز بعد اسلام کے زہاد و عباد نے اسلامی مذاق کے سادے
بے ریا اور غیر مضر زہد و تقویٰ کو چھوڑ کے قدیم مذاق کے متصوفانہ زہد و عبادت
کو اختیار کر لیا۔ ولی اللہ کا عام لفظ جو ہر دیندار کے لیے تھا عباد و زہاد کے
ایک خاص گروہ کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ اور اُن مین نیک نفسی و اتقا اور
اعمال و افعال کے بدلے کرامات اور غیب دانی کے کرشمے ڈھونڈھے جانے
لگے۔ اور مجذوبون کے الفاظ مین معنی پہنائے جانے لگے تو وہی کہانت جس کے
استیصال کے لیے اسلام آیا تھا خود اسلام مین پیدا ہو گئی۔ اور جاہل تو جاہل
اکثر پڑھے لکھے مسلمان بھی صوفی سالکون اور مجذوبون کے پاس انھین مقاصد
و اغراض کو ولی مین لے کے جانے لگے جن کے واسطے اگلی قومین اپنے
کاہنون۔ نجومیون۔ اور بتخانون کے پجاریون کے پاس جایا کرتی تھین۔
اصل یہ ہے کہ بعد کی آمیزشون نے نہ اسلام ہی کو وہ اسلام باقی رکھا

جسے حضرت رسالت (روحی فداہ) لائے تھے۔ اور نہ اُسکے معتقداون ہی کو و
رہنے دیا جیسے معتقد اکہ اسلام کے لیے ہونے چاہیے تھے۔ افسوس۔

معراج

مسلمانون مین سرور کائنات صلعم کی معراج کا تسلیم کرنا نہایت ہی اہم عقی
دینیہ مین ہے۔ جس مین آنحضرت صلعم کو خدا کے فرشتے جبرئیل نے مکہ معظمہ سے
بیت المقدس تک کی اور پھر وہان سے آسمانون کی۔ سارے ملاء اعلیٰ کی او
جنت و دوزخ کی سیر کرائی تھی۔ آپ نے جنت کی نعمتین اور دوزخ کے
عذاب اپنی آنکھون سے دیکھے تھے۔ دور آسمانون پر انبیاے سلف۔ فرشتو
اور حورون سے ملے تھے۔ اس معراج کے مفصل و مشرح حالات احادیث مین
موجود ہین۔ صحابہ کے زمانے مین بہت سے مستند و معتبر لوگون کے نزدیک یہ
معراج روحانی تھی۔ یعنی آپ کا جسد انور اسی دُنیا مین رہا اور روح اطہر
ملاء اعلیٰ کی سیر کو گئی تھی۔ مگر بعد کے زمانے مین معراج کے روحانی ہونے کا
خیال کم ہوتا گیا اور عام اہل اسلام معراج جسمانی کے قائل و معتقد ہوتے گئے
یہان تک کہ آخری صدیون مین یہ حال ہو گیا کہ جو مسلمان معراج کو روحانی بتا
وہ ملحد و بے دین ہے۔ چنانچہ سرسید نے جب بعض اکابر صحابہ کی پیروی مین معراج
کے روحانی ہونے کا مسئلہ چھیڑا تو ہر طرف سے اُن کے کافر و بے دین ہونے کی
صدائین بلند ہوئین۔ مگر معراج روحانی ہو یا جسمانی اس مین شک نہین کہ
اُس نے دنیا مین بڑا کام کیا۔ اور آنحضرتؐ کے ذریعے سے گویا سارے مسلمانون کو
عالم بالا اور واقعات مابعد الموت کا مشاہدہ ہو گیا۔

ہم اس موقع پر معراج کی تفصیل اور اُس کی شرعی حیثیت سے بحث کرنا
نہین چاہتے۔ ہمین اس وقت اس بات پر غور کرنا ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے معراج
کا خیال کسی اور قوم مین بھی تھا یا نہین۔ یا آنحضرت صلعم کے بعد کون لوگ معراج
کے مدعی ہوے ہین۔ اسلام کی زیادہ باتین اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے
ملتی جلتی ہین۔ جسکی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کسی نئے دین کے لانے کے مدعی

تھے۔ بلکہ آپ کا دعوے یہ تھا کہ دین حق جس کی تبلیغ آدمؑ و نوحؑ اور ابراہیمؑ و
سیٰ و عیسیٰ اور دیگر پیمبران سلف کرتے آئے تھے وہی دین اسلام ہے۔ اصل
ین مین کسی قسم کی ترمیم نہین کی گئی بلکہ بعد والون نے دین مین جو ردو بدل کر دیا تھا
اور جو بدعات بعد کو رواج پا گئے تھے اُن کا استیصال کیا گیا۔ الغرض اس مین شک
نہین کہ شریعت اسرائیلی کی زیادہ باتین اسلام مین موجود ہین۔ مگر توراۃ و انجیل مین
ان تک ہمارا خیال ہے اور کسی پیغمبر کو معراج ہونے کا ذکر نہین ہے۔

دیگر مذاہب سلف کی کتابون مین بھی اس قسم کی کسی آسمانی سیر کا تذکرہ
نہین۔ روم و یونان کے بت پرستون کو سچ یہ ہے کہ معراج کی ضرورت ہی نہ تھی۔
اس لیے کہ اُن کے عہد اولین کے دیوتا (وہ انسان جو دیوتا بنا دیے گئے) ایسی
زبردست روحانی قوت رکھتے تھے کہ جب جی چاہتا بام فلک پر چڑھ جاتے اور
ستان والون سے مل آتے۔ مصر اور بابل و اسیریا والون مین ہمین اس قسم
کی کوئی معراج نہین ملتی۔ ممکن ہے کہ اُن مین کسی کو معراج ہوئی ہو مگر افسوس
کہ ہم کو اُنکے مذہب و عقائد اور اُن کی قومی روایات کا بہت ہی محدود حصہ
معلوم ہے۔ لیکن اس مین شک نہین کہ معراج کا خیال پہلے پہل اسی سرزمین مین
ا گیا۔

زرتشت کی نسبت اکثر کہا جاتا ہے کہ اُسے معراج ہوئی تھی۔ مگر معراجِ
زرتشت کا واقعہ اس قدر مختصر بتایا گیا ہے کہ اُسکی تفصیل کے متعلق کوئی راے
نہین قائم کی جا سکتی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے زمانے مین آتش پرستون کے
مذہب مین اس خیال کو بہت اہمیت دی گئی۔ یہان تک کہ سکندر کے بعد مملکت
ن مین جو طوائف الملوکی قائم ہو گئی تھی اُسے جب اردشیر بابکان نے دفع کر کے
سارے ملک کو اپنے زیر نگین کیا اور اصلی مذہب زرتشتی کا پتہ لگانا چاہا تو اُسے
بھی معراج ہی کی نردبان لگا کے عالم بالا کے حالات معلوم کرنا پڑے۔

طوائف الملوکی کے زمانے مین دین زرتشتی غارت ہو گیا تھا۔ سلطنت کے
ساتھ مذہبی اتحاد بھی مٹ گیا تھا۔ ہر شہر اور ہر گروہ کا نیا مذہب تھا۔ اور سب
اپنے عقائد کو زرتشت کا اصلی مذہب خیال کرتے تھے۔ چونکہ مباحثہ اور استدلال

کے ذریعے سے سب مین اتحاد پیدا کرنا دشوار تھا اس لیے اردشیر بابکان نے
نیا طریقہ ایجاد کیا کہ اپنی ساری قلمرو کے شہرون اور اضلاع مین حکم جاری کیا کہ ہر
ضلع اپنے کسی ایسے شخص کو منتخب کر کے اُس کے دربار مین بھیجے جو سب سے زیادہ
متقی و پرہیزگار ہو۔ اس طریقے سے ملک کے ایک سو منتخب اور مسلم الثبوت عابد
زاہد اُس کے دربار مین جمع ہوے۔ تب اُس نے کہا کہ تم سب اپنے مین سے
ایسے دس آدمی منتخب کر دو جن کو اپنے گروہ مین سب سے زیادہ پاک اور عبادت
گزار جانتے ہو۔ اور جب یون دس عابد چن لیے گئے تو اُن دسون سے کہا کہ اب
تم اپنے مین سے کسی شخص کو چنو جو سب سے اعلیٰ و افضل اور سب سے بڑا خدا شناس
و خدا پرست ہو۔ اس طریقے سے ایک ایسا شخص منتخب ہو گیا جو اردشیر بابکان کے
خیال کی ساری دنیا سے زیادہ افضل اور زہد و تقویٰ مین بے مثل و بے نظیر تھا۔ اس
شخص کا نام ویراف تھا۔

اس انتخاب کے بعد اردشیر نے ویراف سے کہا "مین چاہتا ہون کہ تمھین اس
دوسرے عالم مین بھیج کے وہان کے سچے حالات اور سچا دین الٰہی معلوم کرون۔" ویراف
نے طالب حق بادشاہ کی خواہش قبول کی۔ اور اُس کے روحانی سفر کی تیاریان
ہونے لگین۔ ایک بڑے حلقے مین آگ روشن کی گئی۔ اُس کے درمیان مین
ایک تختہ بچھایا گیا۔ اور اُس تختے پر ویراف بھنگ یا اور نشے کی دوا کھلا کے لٹا
دیا گیا اور وہ سو عابد جو سارے ملک سے منتخب ہو کے آئے تھے اور نیز ویراف
کی پارسا بہنین گرد بیٹھ کے خدا سے دعا کرنے لگین کہ ویراف کے ذریعے سے دنیا
کو عالم آخرت اور سروشستان کا حال معلوم ہو جائے۔ یہ سب لوگ تین شبانہ
روز تک یونھین دعا و عبادت مین مشغول رہے۔ اور ویراف آگ کے درمیان
مین غافل و مدہوش پڑا رہا۔ آخر تیسرے یا چوتھے دن اُس نے بیدار ہو کے سر
اُٹھایا۔ سب نے دوڑ کے اُسے آگ کے حلقے سے باہر نکالا اور بے صبری کے
ساتھ پوچھنے لگے کہ "آپ نے کیا دیکھا؟" اُس نے کہا کہ "پہلے مجھے کھانا کھلا دو
پھر بیان کرون گا۔ اس لیے کہ بھوک کی شدت سے مین بے دم ہو رہا ہون۔" فوراً
کھانا سامنے لا کے رکھ دیا گیا۔ اور جب وہ کھا پی کے بیٹھا اور اُس کے حواس ذرا

ٹھکانے ہوے تو اردشیر کی طرف مخاطب ہو کے کہنے لگا "اے بادشاہ میری آنکھ بند ہوتے
ہی عالم بالا کا ایک سروش (فرشتہ) آیا اور مجھے ہاتھ پکڑ کے اوپر لے گیا۔ جہان اُس نے
دوزخ و جنت کی سیر کرائی۔ اور دکھایا کہ نیکوکارون کو اعمال نیک کے ثواب مین کس
طرح کیسی کیسی نعمتین اور لذتین حاصل ہو رہی ہین اور بدکارون کو بدکاری کی
پاداش مین کس کس طرح اور کیسی کیسی سخت ایذائین اور تکلیفین پہونچ رہی ہین۔ اسی
سلسلے مین اُس نے مذہب زرتشتی کی صحت اور اُس کے باعث نجات اخروی ہونے
کے ثبوت دیے ہین۔ ساری نیکیون کے ثواب اور جزا کی صورتین اور اُس کے مقابل
ساری بدکاریون کی سزائین بتائی ہین۔ الغرض مذہب زرتشتی کی تمام چیزین جو
عالم آخرت سے تعلق رکھتی ہین سب بہ تفصیل ظاہر کر دی ہین۔"

ویراف کا یہ روحانی سفرنامہ بڑی تفصیل کے ساتھ پہلوی زبان کی ایک
کتاب مین درج ہے جو "ویراف نامہ" کہلاتی ہے وہ اصلی پہلوی خط مین مع انگریزی
ترجمے کے ساتھ لندن مین چھپی ہے۔ اور پارسیون مین بہت مقبول ہے۔ یہ کتاب اگر صحیح
روایات سے اور سند کے ساتھ اسلام سے پیشتر کی ثابت ہو جائے تو اس بات کے
کہنے کی گنجایش ہے کہ اسلام مین حضرت سرور کائنات صلعم کی معراج اسی ویراف نامے
سے ماخوذ یا آپ کی سیر عالم بالا ویراف کے سفر افلاک کی نقل ہے۔ لیکن ویراف نامہ
ایک ایسی کتاب ہے جو آج سے چھ سات صدیون پیشتر بالکل مجہول اور نامعلوم
تھی۔ پہلے پہل اُس کا ایک نسخہ ہندوستان کے شہر نوساری مین جسے پارسیون
نے اپنا مرکز قرار دے لیا تھا کسی پارسی موبد کے پاس ملا۔ اُس سے پیشتر نہ کسی
کو اس کا نام معلوم تھا اور نہ کبھی قدیم الایام مین کسی کی زبان سے اسکا تذکرہ
سنا گیا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اُن کی کتاب دساتیر کو بعد والے
پارسیون نے تصنیف کر کے اپنی پرانی آسمانی کتاب بتا دیا اُسی طرح اس
کتاب کو بھی کسی شخص نے تصنیف کر لیا۔ لہٰذا بجائے اسکے کہ آنحضرت کی معراج
اس سے ماخوذ ہو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ہمارے پیغمبر عربی کی معراج سے
حاصل کی گئی ہے۔

لیکن بڑے لطف کی یہ بات ہے کہ تیرھوین صدی عیسوی یعنی ساتوین یا آٹھوین

صدی ہجری مین ایطالیہ کے ایک رومی شاعر ڈینٹ نے الیگری مین اپنی معراج کا وا
منظوم کیا ہے جس مین معراج سرورِ کائنات سے فائدہ اُٹھا کے شاعرانہ طبع آزمائی کی
اور خیال آرائی کی گئی ہے - اور اُس سے دین مسیحی کو فائدہ پہونچایا گیا ہے - یورپ
مین اس نظم کی بہت تعریف کی جاتی ہے - اور اُسے لوگ اعلیٰ ترین طباعی و خیال
فریبی کا نمونہ بتاتے ہین -

اس نظم مین ڈینٹ کہتا ہے کہ انسانی دانائی (ورجل شاعر) کی صورت مین
آکے میری رہبر ہوئی - جسے آسمانی دانائی (بیٹرس دیوی) نے میری مدد پر آمادہ کیا
ور نور بخشنے والی حور (لوشیا) کے ذریعے سے ورجل کے پاس یہ حکم بھیجا - اور
لوشیا کو (رحمتِ الٰہی) نام ایک دیوی نے بیٹرس کے پاس اسی غرض کے لیے
بھیجا تھا -

الغرض ڈینٹ کو ایک روحانی خواب مین ورجل اس عالم سے باہر نکال لیگیا
بہت دور تک ادھر اُدھر پھرنے کے بعد وہ ایک تیرہ و تار جنگل مین جا پھنسا جہان
کی ہر چیز سے وحشت ہوتی تھی اور مہیب درندون اور وحشی جانورون کو دیکھ دیکھ کے
وہ ہانپ رہا تھا - اب اُسے دوزخ کی حالت دکھائی گئی - جسے اُس نے اپنے
خیال مین دامن کوہ صیہون مین ایک بڑے بھاری غار کی صورت مین دیکھا - اسکے
کنارے چکنے اور آسانی سے گذرنے کے قابل نہین ہین بلکہ چارون طرف زینون کے
حلقے پھیلتے چلے گئے ہین جو جس قدر نیچے ہوتے جاتے ہین اُسی قدر تنگ بھی ہوتے
جاتے ہین - زینون کا ہر حلقہ اس قدر وسیع اور دوسرے سے الگ ہے کہ بجاے
خود ایک طبقۂ جہنم ہے - اور انھین اسباب سے اس غار مین اُترنا یا اُس سے نکلنا
بغیر اسکے کہ تائید ایزدی رفیق حال ہو غیر ممکن ہے -

پہلا حلقہ "لمبو" کہلاتا ہے - اس مین وہ تمام لوگ ہین جنکو بپتسمہ نہین نصیب
ہوا اور جو حضرت مسیح سے پیشتر تھے - باقی تمام حلقے گنہگارون کے عذابون کے
نمونے پیش کر رہے ہین - جس گنہگار کا جتنا بڑا گناہ ہے وہ اُتنے ہی زیادہ گہراؤ او
زینے کے نشیبی حلقے مین ہے - اور جس قدر زینے تنگ اور گہرے ہوتے جاتے ہین اُسی
قدر عذاب بڑھتا جاتا ہے - ان مبتلاے عذاب گنہگارون مین ڈینٹ نے بہت سے

پرانے تاریخی مجرمون کو دیکھا جو طرح طرح کے عذاب بھگتتے نظر آئے -

اس دوزخ مین اُس نے خون کی ندیان دیکھین - خوفناک عفونتون کو
برداشت کیا - قیر کی ایک جھیل دیکھی - مبتلاے عذاب روحون کے غول دیکھے
جن مین سے بعض ہوا مین معلق ہین - بعض برف مین دفن ہین - بعض درختون
مین مقید ہین - ناامیدی کی آہین - اور درد و تکلیف کی چیخین کانون مین گونج
رہی ہین - بہت سے مجرم مختصر الفاظ مین اپنی دہشت ناک سزائین اور اپنے
گناہون کی سرگذشتین بیان کر رہے ہین - اور عجیب عجیب قسم کی حسرتناک داستانین
اور خدا کی عظمت و کبریائی کی باتین سننے مین آ رہی ہین -

اس غار کے انتہائی نشیب مین شیطان ہے - جو ایک خونخوار موذی ہے
اُسکے تین سر ہین - اور ہر منہ سے کسی گنہگار آدمی کی ہڈیان چبا رہا ہے - یہ کوئی حیرت
کی بات نہین ہے کہ یہودا اسخریوطی (وہ حواری جس نے دغابازی کرکے حضرت
مسیح کو دشمنون کے ہاتھ مین گرفتار کرا دیا تھا) اُنھین دوزخیون مین ہے جنھین شیطان
چبا رہا ہے - مگر اس پر البتہ تعجب ہوتا ہے کہ رومی بروٹس اور کاسیوس (قاتلین
جولیس قیصر) بھی اُسے اُنھین لوگون مین نظر آئے -

اب ڈینٹ اور ورجل دونون شیطان کے جسم پر چڑھ گئے اور بڑھتے چڑھتے
کوہ صیہون کے دوسرے پہلو پر جا اُترے جہان کوہ مذکور ایک مخروطی شکل مین
نمایان ہے - جنوبی سمندر کے ایک جزیرے مین قائم ہے اور عالم برزخ کا پہاڑ کہلاتا
ہے - اس پہاڑ کے گرداگرد نیچے سے اوپر تک زینے بنتے چلے گئے ہین جو مندرجہ ذیل
سات فانی گناہون کے مجرمون کی جاے قرار ہین - غرور - حسد - غصہ - کاہلی
حرص - جوع البقر اور شہوت -

اس پہاڑ کی چوٹی پر پہونچ کے شاعر سے بیٹرس دیوی سے ملاقات ہوئی
جو اُسے اپنے ساتھ لے کے آسمان پر چڑھ گئی - اور یکے بعد دیگرے اُسے چاند اور
دیگر سیارون مریخ - زہرہ - آفتاب - مشتری - عطارد اور زحل سے ملایا - یہان
سے چڑھ کے وہ بیٹرس کے ہمراہ اُس عالم بالا مین پہونچا جو ثوابت کا مرکز ہے - او
آخر کار اصلی فردوس بریں مین پہونچ گیا - جہان اُسے عیسیٰ مسیح اور مریم عذرا کے

جلوے نظر آئے اور آخر ایک جھلک دیدار الٰہی کی بھی نصیب ہو گئی -

اسی دیدار الٰہی پر ڈینٹ کی معراج اور اسکے ساتھ اُس کی مثنوی ختم ہو گئی ہے - لیکن اس روحانی سیر کے سلسلے مین اُس نے جیسے تاریخی واقعات پیش کر کے اپنی تاریخ دانی کا اعلیٰ ثبوت دیا ہے اور اُنکے اظہار مین جیسی کامل درجے کی قادر الکلامی ظاہر کی ہے اہل یورپ کی نظر مین بہت ہی قابل تعریف ہے - اگرچہ اُنکی شاعری کی ہم بھی تعریف کرین گے مگر یہ کہے بغیر نہین رہ سکتے کہ مضمون سرقہ کا ہے - اور اسلئے کہ اُسے مسیحی خیالات کا جامہ پہنا دیا گیا ہو اُس مین کوئی جدت نہین ہے - اُس سے بہت زیادہ جدت آفرینی ملٹن نے اپنی پیراڈائز لاسٹ (فردوس گم شدہ) مین کی ہے - اگرچہ وہ بھی ایک مذہبی نظم ہے اور حضرت آدمؑ و حوا کے جنت سے نکالے جانے کے واقعے سے ماخوذ ہے لیکن اس مین شاعری نے اپنے عقائد کی نگہداشت کے ساتھ بہت ہی انوکھی اور پُرلطف باتین پیدا کی ہین -

توحید

اس موقع پر نہ ہم نے اپنے کرم فرما مولانا حسن نظامی کے اخبار توحید پر ریویو لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا ہے اور نہ وحدت باری تعالیٰ کی تعلیم و تلقین کے لیے - بلکہ ہم اس وقت مسئلۂ توحید کی تاریخ کے متعلق اپنے چند خیالات ظاہر کرنا چاہتے ہین -

خدا کے ایک جاننے اور ایک ہی خدا ماننے کو توحید کہتے ہین - ظاہر مین دیکھیے تو کس قدر سادی اور کتنی سیدھی بات ہے کہ ہمارا اور سارے عالم کا پیدا کرنے والا ایک ہی خدا ہے - اُس کا کوئی شریک و ہمتا نہین - کل موجودات اُسی کے بنائے ہوے اور اُسی کے تابع فرمان ہین - مگر پھر بھی اس سیدھے سادے مسئلے مین انسانی جہالت نے (جسے وہ حماقت سے عقل آرائی خیال کرتا ہے) ایسے اُلجھاؤ ڈال دیے ہین کہ اگر مذاہب اور معتقدایان مذاہب کے دعوٗن کو دیکھیے تو ایک بھی موحد نہین نظر آتا -

اس مین شک نہین کہ توحید کوئی ایسی اچھی چیز ہے کہ جی سب کا یہی چاہتا ہے کہ ہم موحّد ہون اور ہمارا خدا ایک ہو - فطرت انسانی کی کمزوریون نے سیکڑون

جولائی ۱۹۱۳ء

ہزارون باطنی قوٗی اور روحانی پہلوان تسلیم کر لیے - انسان جس سے مغلوب ہوا - جس سے دبا - جس سے ڈرا - یا جس کا معترف ہوا اُس کے آگے سر جھکا کے کھڑا ہو گیا - اُس نے سنسان بیابانون - خاموش جنگلون - سراپا عظمت پہاڑون - خوفناک گھاٹیون - ناپیدا کنار سمندرون اور ہمیشہ بہنے والی ندیون مین مرعوبیت کی آنکھون سے دیو اور دیوتا دیکھے - پریان اور دیویان دیکھین - جسمانی عالم مین اپنے خیال کی مدد سے اُن کے تشخصات پیدا کر لیے - اور اُنکے آگے سجدے کرنے لگا - یہ سب ہے لیکن زبان سے یہی کہے جاتا ہے کہ "ہم موحد ہین" اور "ہمارا خالق ایک ہی ہے"

باوجود ان مشرکانہ حرکات کے وہ مانتا ہے کہ خدا کو ایسا ہونا چاہیے کہ کوئی چیز اور کوئی طاقت اُس کی حکومت و قوت سے باہر نہ ہو - کوئی طاقت اُس کی مزاحم نہ ہو سکے - اور جب ایسا خدا ہو گا تو لازم ہے کہ کوئی دوسرا خدا نہ ہو - کیونکہ دوسرا ہوا تو اگر وہ پہلے کی قدرت و حکومت سے باہر ہوا تو پہلے خدا کی خدائی مین فرق آ جائے گا اور وہ پورا خدا ہی نہ باقی رہے گا - اور اگر وہ پہلے خدا کا تابع فرمان اور مخلوق ہو گا تو وہ دوسرا خدا خدا نہ باقی رہے گا - کہنے کو تو کہہ دیا جا سکتا ہے کہ دونون کی قلمرو جدا ہو گی - انکے حدود و اختیارات مقرر و معین ہون گے - اور اپنی اپنی قلمرو پر دونون پوری قوت کے ساتھ قابض و متصرف ہون گے - لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ اس طرح دونون خدا خدا باقی نہ رہین گے - اس لیے کہ پہلے خدا کی حکومت سے دوسرے کی قلمرو باہر ہو گی - اور دوسرے کی حکومت سے پہلے کی قلمرو - اور جسکی حکومت سے کوئی چیز باہر ہو وہ خدا نہین -

اسی ضرورت اور اسی نتیجے کی وجہ سے دنیا مین شاذ و نادر ہی کوئی ایسا شخص ملے گا جو دو خداؤن کو اپنی زبان سے تسلیم کرتا ہو - ایسے لوگ مل جائینگے جو خدا کے منکر ہون اور بخت و اتفاق کو اپنا خالق بنا کے کسی قادر و توانا خدا کے ماننے ہی سے انکار کر دین - لیکن ایسے لوگ چراغ لے کے ڈھونڈھیے تو بھی نہ ملین گے جو دو برابر کے خدا مانتے ہون - یا توحید کے ماننے مین تردد اور پس و پیش کرتے ہون - تاریخ پر نظر ڈالیے تو ہر قوم اپنے آغاز مین بت پرست نظر آئے گی - لیکن اُن

دونون کے حالات اس قدر کم معلوم ہین کہ ہم ہر پرانی قوم کے اصلی عقائد سے واقف نہین ۔ اس بات کو ہم مانتے ہین کہ انسان نے جب حیوانیت چھوڑ کے انسانیت کا جامہ پہنا تو اپنی عقل کی کمزوری سے ہر اُس چیز کو جو مہیب یا باعظمت نظر آئی اس کے آگے سر جھکانے اور اُس کی پرستش کرنے کو تیار ہوگیا۔ لیکن اُسکی اس ضعیف الاعتقادی سے ہم یہ نتیجہ نہین نکال سکتے کہ کبھی وہ ایک سے زیادہ خداؤن کا بھی قائل تھا۔

اگلی دنیا کے بعض بادشاہون نے بھی خدا بننے کی کوشش کی۔ جیسا کہ نمرود و فرعون کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہ پولیٹیکل خدا تھے۔ دل مین اپنی مجبوریون اور کمزوریون کے معترف تھے مگر اپنی رعایا کے مطیع فرمان رکھنے کے لیے چاہتے تھے کہ خدا ہی نہین بلکہ ہم اپنی قوم کے معبود بن جائین۔ تاریخ ہی بتا رہی ہے کہ ایسے دنیوی خدا جہان خدائی کا دعویٰ کرتے تھے وہان بتخانون مین جا کے بتون کی پرستش بھی کیا کرتے تھے

تاریخ کی جستجو مین اگر قرائن سے مدد لی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے پہلے اُن چیزون کی پرستش کی جن سے خائف و مرعوب ہوا۔ پھر اُن لوگون کی جو قوت مین سب پر غالب تھے۔ اور اسی سلسلے مین اپنے بزرگون مورثون اور معزز نامور لوگون کو پوجنے لگا۔ لہذا جیسے معبود وہ بزرگ اور نامور لوگ تھے ویسے ہی معبود بادشاہ بھی بن جایا کرتے تھے۔ مگر اس معبودیت کے ساتھ قومی دیوتاؤن کے آگے بادشاہ اور رعایا۔ راجہ اور پرجا سب سجدے کیا کرتے تھے۔

یہودن کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اُن کی تاریخ سے بابل و نینوا اور مصر و مین کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو موحد اور باقی تمام اقوام عالم کو بت پرست بتاتے ہین۔ مصر مین بڑے بڑے دیوتا تھے۔ بابل مین ہر جگہ بت تھے۔ یہود کے قریب ہی فنیقیون اور کنعانیون مین دیوتاؤن کی پرستش ہوتی تھی۔ اور اسرائیلی اُن سب کو بت پرست اور اپنے آپ کو موحد و حق پرست بتاتے تھے۔ لیکن جس طرح اُن قومون کی بت پرستی کے پردے مین توحید تھی ویسے اسرائیلیون کی توحید بھی ہمین مغشوش نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ اسرائیلیون کا خدا "یہوا" اُنکے بیان سے خدا نہین بلکہ اُن کا قومی دیوتا

نظر آتا ہے۔ جو اور قومون کا نہین صرف اُن کا خدا تھا۔ جو اورون کے خداؤن پر غالب تھا۔ اور اُن سے وعدہ کرتا تھا کہ مین تمہین سب قومون پر غالب اور سب سے برگزیدہ بنا دون گا۔

اس کے بعد یونانیون اور رومیون کا زمانہ ہے۔ یونانی بھی توحید کے قائل تھے اگرچہ اُن کا خدا صرف علت تخلیق تھا اور جملہ صفات سے معرا تھا۔ اور رومیون کا بھی ایسا ہی تھا۔ دونون کے نزدیک عالم تخلیق مین دیوتاؤن اور دیویون کی مداخلت تھی۔ نامور انسان۔ زبردست سپاہی اور بلند حوصلہ بادشاہ بھی دیوتا بن جاتے اور اپنے روحانی اقتدارات سے دنیا پر اپنے اپنے علاقون مین حکومت کرتے اور دنیا والون کو مدد دیتے۔

مسیحیت نے دنیا مین آکے ابتدا ہی بڑے زور و شور سے توحید کا نعرہ بلند کیا اور تمام مروج و معاصر مذہبون کو شرک بتایا۔ مگر سچ یہ ہے کہ یونانی ہون یا رومی اُنکے اعمال مشرکانہ تھے عقیدہ مشرکانہ نہ تھا۔ اس لیے کہ وحدت باری تعالی مین اُنھین ہرگز شک نہ تھا۔

سب سے بڑا الزام شرک کا مجوس کو دیا گیا جن کا مذہب ہزار سال سے فارس اور خراسان وغیرہ مین جاری تھا۔ لیکن اس الزام دینے مین زیادہ دخل مسیحیون کی تحقیق کو نہین بلکہ تعصب کو تھا۔ مسلمانون مین بھی آتش پرستی کو "ثنوی المذہب" یعنی دو خداؤن کا ماننے والا مذہب کہا جاتا ہے۔ خود زرتشتی اپنے آپ کو اس الزام سے بری بتاتے ہین۔ اور اگر غور سے دیکھیے تو جیسا الزام اُن کو دیا گیا ہے حقیقت مین وہ ویسے ملزم نہین ہین۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ دنیا مین نیکی و بدی دو متضاد چیزین ہین جن کو اُنھون نے نور و ظلمت سے تعبیر کیا۔ خدائے تعالی چونکہ صرف صفات حسنہ سے متصف ہے اس لیے نور کو اُنھون نے اُس کا جلوہ بتایا۔ اور شیطان چونکہ ضلالت و بدی کا مجموعہ ہے۔ لہذا اُس کا مظہر ظلمت کو قرار دیا۔ یہ وہ مانتے ہین کہ خدا سب پر غالب ہے اور شیطان و ظلمت پر بھی وہ غالب آئے گا۔ فی الحال خدا کی مرضی کے خلاف ظلمت موجود ہے اور شیطان لوگون کو گمراہ کرتا ہے۔ ایسا نہین ہے کہ شیطان و ظلمت اُس کی حکومت و قدرت سے باہر ہون

گو ہان نافرمان اور اُسکے حکم سے باہر ضرور ہین - ایک دن آنے والا ہے جب شیطان پکڑ کے مارا جائے گا اور ظلمت دُور ہوگی - اگر غور سے دیکھیے تو اس مسئلے مین حقیقت کا دعوا کرنے والے دیگر مذاہب سے وہ اچھے ہی ہین لیکن اس کا کیا علاج کہ اُنکو الزام دے کے دو خداؤن کا ماننے والا اور مشرک بتا دیا گیا -

فرق اتنا ہے کہ عیسائیون اور مسلمانون مین شیطان کی تخلیق کا ایک واقعہ بیان کر دیا گیا ہے اور زرتشتیون مین کوئی ایسا قصہ نہین جس سے پتہ چلتا ہو کہ اہرمن (اُن کے شیطان) کو یزدان (اُن کے خدا) نے پیدا کیا تھا - اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے اہرمن اسی شان سے چلا آتا ہے ہان آخر مین البتہ مفتوح ہو کے مارا جائے گا - لیکن جب وہ اُسے فانی مان رہے ہین تو اُسکے آغاز کا پتہ نہ لگنے سے یہ لازم نہین آتا کہ اُنکے نزدیک وہ ازلی و ابدی خدائے شر ہو -

اس مین شک نہین کیا جا سکتا کہ ابتداءً مسیحیت کی توحید غیر مغشوش اور مکمل تھی - لیکن چند ہی روز مین نظر آ گیا کہ بعوض اسکے کہ وہ اپنی توحید کا اثر دوسرون پر ڈالے خود ہی دوسرون کے شرک سے متاثر ہو کے مغشوش ہو گئی - ایک ہی صدی گذری تھی کہ اُس کی توحید مین تثلیث کا جوڑ لگ گیا - اور زرتشتیون کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ خیر ہم تو ثنوی (دو خداؤن کے ماننے والے) تھے مگر تم تثلیث والے ہو - اب پھر ساری دنیا مین توحید برائے نام تھی - اور ظاہری صورت مین جسے دیکھیے مشرک تھا -

عرب کے جہلا علم و فضل سے محروم اور متمدن و مہذب قومون سے دور ہونے کے باعث اب تک پُرانے مذاق کی بت پرستی مین مبتلا تھے - اُن مین درخت، جانور اور بت سب ہی طرح کے معبود تھے - ظاہر مین معلوم ہوتا ہے کہ وہ پورے پورے مشرک ہون گے لیکن قرآن مجید جو اُن کے مذہب کے استیصال کے لیے آیا تھا وہی بتا رہا ہے کہ ایک سے زیادہ خداؤن کے وہ قائل نہ تھے - اور اگر اُن سے پوچھا جاتا کہ تمھارا خالق کون ہے تو جواب دیتے کہ "خدائے وحدہٗ لاشریک" - اسکے بعد جب الزام دیا جاتا کہ "پھر تم ان بتون کو کیون پوجتے ہو؟" تو کہتے "اس لیے کہ یہ بت خدا کی درگاہ مین ہماری شفاعت کرین گے"

اس بیان سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ اسلام سے پیشتر کے تمام مذاہب بت پرست ہون یا خدا پرست توحید کے سب قائل تھے - شرک صرف عبادت اور پرستش مین تھا عقائد مین نہین - یہ بھی نظر آ گیا کہ پُرانے مذاہب حقیقۃً بھی مشرکون کے اثر سے متاثر ہو کے اپنی اصلی توحید کو بھول بیٹھے تھے - عقائد مین اگر شرک تھا بھی تو اُسے وہ ایک متشابہ عقیدہ خیال کرتے - مثلاً عیسائیون نے تثلیث کو مانا بھی تو توحید کے اصول کو نہ چھوڑا - اور تثلیث کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے رہے کہ ہم ایک خدا کو مانتے ہین اور جب تثلیث و توحید کے باہم متضاد ہونے کی نسبت سوال کیا گیا تو سینٹ آگسٹین نے کہہ دیا کہ "یہ مسئلہ اس لیے ہے کہ دنیا مین مانا جائے اور آخرت مین جا کے سمجھا جائے" - اسی طرح زرتشتیون کو ساری دنیا ثنوی المذہب کہتی تھی - وہ خود بھی اہرمن (شیطان) کو اتنی وقعت و عظمت دیتے اور اُس سے اس قدر ڈرتے تھے کہ اُن کے طرز عمل سے دھوکا ہوتا کہ شاید یہ اہرمن کو خدا ہی کے برابر کی قوت مانتے ہین - لیکن اگر اُن سے پوچھا جاتا تو یہی جواب دیتے کہ ہمارا خدا ایک ہے - اور اہرمن تو ایک دشمن حق بُرائی ہے جو فانی ہے -

الغرض عقیدۃً خدا کے ایک ماننے مین سب متحد ہین - شرک کا جو کچھ اظہار ہوتا ہے عبادات اور طرز عمل سے - اس راز تک سب سے پہلے بنی اسرائیل پہونچے جو قدیم الایام مین بت پرستی کے سب سے بڑے دشمن تھے - مگر سچ یہ ہے کہ توحید کی اس اصلی شان کو مکمل طریقے کو پہلے پہل اسلام نے سمجھا اور اُس نے بتایا کہ زبان اور عقیدے سے ہم چاہے کتنے ہی خدائے واحد کے قائل ہون ہمارا طرز عمل ہمارا طریقہ عبادت اور ہماری معاشرت مشرکانہ ہو تو توحید باطل ہو جاتی ہے اور ہم اس قابل نہین رہتے کہ اپنے آپ کو موحد کہین -

اسلام نے کسی مافوق قوت یا کسی اپنے سے بالا دست شخص کے ماننے مین مراتب کے درجے قائم کیے - اُس نے حکم دیا "اعبدوا اللّٰہ و اکرموا اخاکم" (خدا کی عبادت کرو اور اپنے بھائی کی تعظیم کرو) پھر اسکے بعد عبادت و تعظیم مین فرق بتایا - نماز اور حج مین جن جن طریقون سے خدا کی عظمت ماننے کا اظہار کیا جاتا ہے ان کو عبادت قرار دیا اور انکے سوا اور جتنے طریقے عظمت ماننے کے ہون

ان کو تعظیم بتایا۔ ہم کسی بزرگ اور معزز شخص کو دیکھ کے کھڑے ہو جائین تو یہ تعظیم ہے
لیکن اگر اُس کے آگے سجدہ یا رکوع کرین تو شرک ہے۔

ایک یہ پُرانا خیال بھی تھا کہ خدا وند جل و علا چونکہ مجہول الکُنہ، بیچون و بیچگون
اور ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ اس لیے اُسکی ذات تک ہمارا خیال نہین پہونچ سکتا
عبادت کے لیے اُس کا خیال کرنے اور اُس کا دھیان رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس
دشواری کو قدیم مذاہب نے اپنے اپنے مذاق کے موافق حل کیا۔ اس کو تو سب نے
تسلیم کر لیا کہ اُس کی طرف دھیان لے جانے کا ذریعہ اُس کی قدرت کاملہ کے کسی
مکمل نمونے کو یا کسی ایسی چیز کو جو اُس کی کسی اعلیٰ صنعت کو ظاہر کرتی ہو قرار دے
لیا جائے۔ لیکن انتخاب مین اختلاف پڑا۔ کسی نے کسی حسینہ کی تصویر کو کسی نے
کسی قوی ہیکل انسان کی مورت کو۔ کسی نے کسی زبردست جانور کو۔ کسی نے کسی
بڑے بھاری درخت کو۔ کسی نے نور و نار کو ترجمان حق قرار دے کے عبادت انھی
کے واسطے قبلہ بنایا۔

اسلام نے ایسے تمام قبلوں کو قبلہ ہاے باطل بتایا۔ اس لیے کہ چند ہی روز
مین لوگ خود اُن قبلون مین کسی کرشمے یا کسی قدرت کو ماننے لگے۔ اور بجاے اسکے
کہ وہ انسان کے خیال کو خدا کی طرف لے جائین خود ہی معبود بن گئے۔ اُن کی
تقدیس و تنزیہ کی جانے لگی۔ ان مشرکانہ نتائج سے بچانے کے لیے اسلام نے ان
تمام قبلون کی تو تکذیب کر دی مگر اس اصول کو نہین چھوڑا کہ خدا ے بیچون کی
عبادت کے لیے کسی سمت اور قبلے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسلام نے ایک مکان
کو قبلہ قرار دیا جو موحدون کا سب سے پُرانا عبادت خانہ تھا۔ اور اُسے بھی اس
قید کے ساتھ کہ اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ مین اسے سجدہ کرتا ہون یا نماز مین
اُس کی طرف خطاب کرے تو وہ مشرک ہے۔ اس اصول کی سچائی کا اندازہ
اس سے ہو سکتا ہے کہ تمام دیگر مذاہب مین جو چیزین سمت عبادت یا قبلہ بنائی
گئی تھین وہ چند ہی روز مین معبود بن گئین اور اُنھین کی پرستش ہونے لگی۔ بخلاف
مسلمانون کے قبلے خانہ کعبہ کے جو گذشتہ تیرہ سو برس مین قبلے کی حد سے تجاوز کر کے
معبود نہین بن سکا۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانون مین بھی مرور ایام کے ساتھ شرک پیدا ہوا

اور مشرکانہ رسوم ترقی کرتے رہے۔ ہزارہا چیزین پیچ گئین۔ ہزارون چلّون۔ جھنڈون
اور فرضی تربتون کے آگے سجدے ہونے لگے مگر خانہ کعبہ کی جو حیثیت آنحضرت صلعم
کے زمانے مین تھی آج تک قائم ہے اُس مین ذرہ بھی تغیر نہین ہوا۔

مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے جیسی خالص توحید بتائی
کبھی نہین بتائی گئی تھی۔ اور اگر اُسکے تعلیمات پر پورا پورا عمل کیا جاتا تو یقیناً دنیا
مین ایک سچی موحد قوم موجود ہوتی۔ مگر افسوس کہ مسلمانون مین بھی نماز روزے
کے ساتھ مشرکانہ رسوم پیدا ہو گئے۔ اور اُن کا انجام بھی یہی ہوا کہ توحید کے مدعی
تو سب ہین مگر صحیح معنون پر دیکھیے تو اُن مین بھی شاذ و نادر ہی کوئی موحد نظر
آئے گا۔

موسیقی

موسیقی اُن فنون لطیفہ مین سے ہے جن سے انسانی طبائع پر اثر ڈالنے کے
لیے ہمیشہ اور ہر ملک مین کام لیا گیا ہے۔ اسکے موجد فطرت انسانی کے ایسے
ماننے کے جذبات ہین کہ اسکے پہلے بانی کو کسی ترقی یافتہ ملک یا متمدن قوم مین
ڈھونڈھنا نادانی ہے۔ سچ یہ ہے کہ اسکی موجد ہر قوم اور ہر سرزمین ہے جس نے
آغاز ہی مین اسے ایجاد کر لیا۔ ہر وحشی سے وحشی قوم نے اپنا موسیقی آپ ایجاد
کیا۔ مثل مشہور ہے کہ "گانا اور رونا سب کو آتا ہے"۔ جس روز کوئی پہلا وحشی انسان
کسی بات پر خوش ہو کے اُچھلا کودا اور گایا ناچا، اور جس دن تخلیق عالم کے
آغاز ہی مین کوئی جاہل عورت کسی عزیز کی موت پر بیتابی کے ساتھ سر پیٹ کے روئی
اور بین کرنے لگی اُسی دن جانیے کہ موسیقی کا فن ایجاد ہو گیا۔ اور غالباً اسی
کا اظہار قدیم مذاہب نے اس عنوان سے کیا ہے کہ اس فن لطیف کا موجد عجائب
انسان کے دیوتاؤن کو بتا دیا جو تخلیق عالم کے آغاز مین انسانون کے بڑے دوست
تھے۔ اُن سے ملتے جلتے تھے اور کبھی کبھی اُنھین اپنی صحبتون مین شریک کر لیا
کرتے تھے۔

ہندو کہتے ہین کہ موسیقی کے پہلے موجد مہادیو جی تھے جو سب دیوتاؤن سے

بڑے اور چلے تھے۔ اور مختلف راگنیاں اپنے حالات و جذبات کے مناسب شکل و شمائل اور وضع و لباس میں اُن کی بیبیاں بتائی جاتی ہیں۔ مصر والے جو قدامت میں سب سے پہلے مشہور ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ موسیقی اور آلات موسیقی یعنی مختلف باجوں کو اُن کے اعلیٰ ترین دیوتاؤں۔ اُسائرس۔ آئی سس۔ اور آرس اور ہرمس نے ایجاد کیا۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ اُنکے اعلیٰ درجے کے دیوتا زیوس کی نو بیٹیاں جو "میوزس" کہلاتی تھیں وہی تمام علوم و فنون کی بانی تھیں اور اُنھیں سے موسیقی کا فن ایجاد ہوا۔ اُن نو میوزس (دیویوں) کے نام یہ ہیں (۱) کالیوپیہ۔ مثنویوں اور افسانہ خوانی کی شاعری کی بانیہ (۲) کلیو۔ تاریخ کی موجدہ (۳) اراتو۔ عاشقانہ شاعری کی بانیہ (۴) یوتیرپہ۔ نغمہ خوانی کی شاعری کی بانیہ (۵) ملپومنہ۔ مرثیہ خوانی اور جذبات غم کو اُبھارنے والی شاعری کی بانیہ۔ (۶) پولی ہم نیا۔ نغمہ خوانی اور فصاحت و بلاغت کی دیوی۔ (۷) ترپسی خورہ۔ ناچنے کی موجدہ (۸) تھالیہ۔ جذبات مسرت کو اُبھارنے والی شاعری کی بانیہ (۹) اُرانیہ۔ علم ہیأت کی موجدہ۔ اسی قسم کے خیالات فن موسیقی کی ایجاد کے متعلق چینیوں، فارسیوں۔ اور بابل والوں میں بھی ہونگے لیکن افسوس کہ ہم اُن سے ناواقف ہیں۔ مشرق کے متاخر محققوں نے موسیقی کی ایجاد اور اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں عجب عجب خیال آفرینیاں کی ہیں مگر اب وہ زمانہ نہیں۔ کہ چڑیوں میں نغمہ سنجی کا قدرتی جوہر دیکھ کے موسیقار نام ایک طائر ڈھونڈھ کے نکالا جائے۔ موسیقی کے ایجاد کی کلغی اُسکے سر میں لگائی جائے۔ اور اُسی کی نسبت سے موسیقی کا نام موسیقی بتایا جائے۔ موسیقی کے نام کی اصلیت یہ ہے کہ یہ فن علوم کی یونانی دیویوں میوز کی جانب منسوب ہے اور میوز کا تلفظ یونانی زبان میں یقیناً "موس" تھا۔ عربی و فارسی میں اور ہماری زبان میں جس طرح نسبت کے لیے آخر میں یائے معروف لگائی جاتی ہے اسی طرح لاطینی اور یونانی میں "ق" لگایا جاتا تھا۔ اسی قاعدے کے موافق وہ موسیقی کو "موسیق" (انگریزی میں میوزک) کہتے تھے۔ عربوں کی یہ غلطی تھی کہ اس کا خیال نہ کیا کہ موسیق میں خود ہی حرف نسبت موجود ہے اور اُسپر اپنے یونان کی یائے نسبت

بھی اضافہ کر دی۔ اور اس فن کا نام ساری مشرقی دنیا میں بجائے "موسیق" کے "موسیقی" ہو گیا۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ اس فن کو کن کن قوموں نے کہاں تک ترقی دی۔ اور کس قوم کی موسیقی کس پایہ پر تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدمائے یونان میں موسیقی کا مفہوم بمقابل آج کل کے زیادہ وسیع تھا۔ اُن لوگوں میں گانا۔ ناچنا اور بجانا ہی نہیں بلکہ شاعری بھی اُس میں شامل تھی۔ اصل یہ ہے کہ اُنکے خیال میں جتنے فنون "میوزس" دیویوں کی تعلیم سے حاصل ہوئے تھے سب اُن کی موسیقی میں شامل تھے۔

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے موسیقی کو اہل مصر نے ترقی دی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اُنکی موسیقی اعلیٰ درجہ ترقی کو پہونچ گئی تھی۔ مگر اس عام تحقیق کے خلاف یونانی مورخ ڈیوڈوروس سقولوس یقینی طور پر بیان کرتا ہے کہ مصر میں قدیم الایام میں موسیقی کی تعلیم و تعلم اور اُس سے حظ اُٹھانے کی ممانعت تھی۔ اس لیے کہ اُسکے شوق میں مبتلا ہو کے آدمی عیش پرست ہو جاتے ہیں۔ اور جہاں انسان کو اس کا شوق ہو، بالکل گیا گذرا ہو جاتا ہے۔ مگر افلاطون اور ہرودوطس (جو یونانیوں ہی کا نہیں ساری دنیا کا سب سے پہلا مورخ ہے) دونوں نے مصر کا سفر کیا تھا اور دونوں یقین دلاتے ہیں کہ بخلاف ممانعت اور روک کے مصر میں علم موسیقی کو ہر طرح سے ترقی تھی۔ سلطنت اُسے روز افزوں ترقی دے رہی تھی۔ اور نوعمروں کو کمسنی ہی میں اس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ خود ڈیوڈوروس جو مصر میں اس کے ممنوع ہونے کا راوی ہے دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ "موسیقی اور اُسکے تمام سازوں کے موجد مصر کے دیوتا تھے"۔ اور یہ امر پوری طرح پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ اہل مصر کے پاس ایسے باجے اور آلات طرب موجود تھے جن سے ہر قسم کے جذبات میں تحریک پیدا کرنے والے مختلف نغمے ادا ہوتے تھے۔

اہل بابل و نینوا میں بھی موسیقی کا بڑا رواج تھا۔ ان کے وقت کی بنی ہوئی تصویریں بتا رہی ہیں کہ بادشاہوں کے ساتھ ساتھ اور نیز فوجوں کے آگے آگے چنگ و رباب بجانے والے مغنی چلا کرتے تھے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ اُن کے

وہان موسیقی عبادت مین داخل تھی۔ اور بڑے بڑے مندرون اور بتخانون مین آ
نشاط اور مغنیون کی چوکیان مقرر تھین جن کے نغمے پر اکثر پجاریون کو حال آ
کرتا۔ مگر چونکہ انکے پاس سوا پتھرون اور قصر و ایوان کی دیوارون پر کندہ کر دینے
کے اور کوئی ذریعہ اپنے علوم و فنون کو بعد والون کے لیے محفوظ کر دینے کا نہ تھا
اس لیے اُن کے جملہ علوم کی طرح اُن کی موسیقی بھی اُنھین کے ساتھ مٹ گئی۔
اگر یونانیون کی طرح پاپائرس وغیرہ کی قسم کا سامان تصنیف و تدوین اہل بابل
نینوا کے پاس بھی موجود ہوتا تو آج ہم اُن کے علوم سے اس قدر ناواقف
ہوتے۔ اور بخوبی معلوم ہوتا کہ انکی موسیقی کے کیا اصول تھے اور کیسی تھی۔
بنی اسرائیل کو بھی موسیقی کا کم شوق نہ تھا۔ توراۃ سے معلوم ہوتا ہے ک
سارے آلات طرب خصوصاً چنگ وارغنون کا موجد جوبل تھا جو حضرت آدم
کی نسل مین ساتوین پشت پر تھا۔ اُسکے ارغنون سے مراد غالباً وہ پرانے زمانے
کا ساز ہے جس مین کئی بانسریان ایک مین جوڑ دی جاتی تھین۔ اس سے صا
ظاہر ہے کہ موسیقی کی ایجاد جوبل سے پہلے ہی ہو چکی ہوگی۔ اور اگر پہلے نہ
ہوئی ہو تو اُس کے زمانے مین تو شک ہی نہین کہ یہ فن موجود تھا جس کی تائید
تقویت کے لیے آلات طرب ایجاد کیے گئے۔ مگر بنی اسرائیل کی موسیقی کے اعلیٰ
عروج کا زمانہ حضرت داودؑ کا زمانہ ہے جنکے مزامیر مشہور رہیں۔ قدیم مورخ اسیبو
کا بیان ہے کہ حضرت داود جہان جاتے اپنا چنگ ضرور ساتھ لیجاتے۔ اُنھون
مذہبی رسوم و عبادات کے لیے اہل موسیقی کی چوکیان اور باجون کے بینڈ مقرر
کیے تھے۔ اور ثابت ہوتا ہے کہ عبادت کرتے وقت وہ خود خداے واحد ذوالجلال
کے سامنے گاتے بجاتے اور ناچتے تھے۔ جبکہ آلات طرب سے کام لینے والون
طائفہ چنگ و رباب۔ طنبورہ۔ جھانجھ۔ قرنا اور ترہیان بجاتا تھا۔ اور
اپنی مناجات کے نغمے کی صدا بلند کرتے۔ اِن چیزون کو اُنکے بعد حضرت سلیمانؑ
اور زیادہ ترقی دی جبکہ معبد الٰہی اور حرم ربانی مین بہت سے گانے بجانے وا
مقرر تھے۔ یہ زمانہ بنی اسرائیل کی موسیقی کے شباب کا تھا۔ مگر اسیری بابل نے
۶۲ سال تک قائم رہی یہودی کی موسیقی اور اُنکے آلات طرب دونون کو خاک

ملا دیا۔ اس لمبی قید سے چھوٹنے کے بعد وہ پنپنے نہین پائے تھے کہ ارض یہود
و پُر فتن زمانہ شروع ہوگیا جبکہ اُن پر ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے اور مصریون
یونانیون اور رومیون سب نے یکے بعد دیگرے اُنھین مغلوب و مقہور کیا۔ اور
کبھی اتنی مہلت نہ دی کہ اطمینان سے بیٹھ کے اپنے قدیم موسیقی کو تازہ اور پرانے
آلات طرب کو پھر زندہ کرتے۔ ان تباہیون نے موسیقی کو اُن مین سے فنا کر دیا۔
اور اب اُنکے عبادات اور رسوم مذہبی کو گانے بجانے اور آلات طرب سے کوئی
تعلق نہ تھا۔ ساری دنیا کے معابد یہود سے موسیقی کا فن قطعاً علٰحدہ ہوگیا۔ اور جرمن
یہود کا مدتون سے یہ عقیدہ ہے کہ مسیحا کے ظہور سے پہلے گانا بجانا اور خوشیان
منانا غیر مناسب اور حرام ہے۔
مگر افسوس اہل مغرب نے ہندوستان کی موسیقی کی طرف کبھی توجہ نہین کی
حالانکہ سب سے قدیم اور سب سے زیادہ مکمل اسی سرزمین کی موسیقی معلوم ہوتی
ہے۔ مگر اُس کی طرف ہم اُس وقت توجہ کرین گے جب مسلمانون کی موسیقی کا تذکرہ
آئے گا۔

یونانیون مین بہت سی دیگر اقوام عالم کی بہ نسبت موسیقی کی زیادہ قدر و منزلت
تھی۔ لیکن اس تاریخی بیان کے سوا اگر ہم اس بات کو معلوم کرنا چاہین کہ اُن کی
موسیقی کیا تھی اور کیسی تھی تو کچھ بھی پتہ نہین چل سکتا۔ ہر قوم کی موسیقی اُن گیتون
کے ذریعے سے جن مین اچھی اور دلکش دُھنین بندھ جاتی ہین بعد والی نسلون
مین منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اور اُنھین کو سُن کے بعد والون کو اپنے متقدمین کی
موسیقی کی نوعیت کسی نہ کسی حد تک ضرور معلوم ہو جایا کرتی ہے۔ بخلاف اسکے
یونانیون کی موجودہ نسلون مین اپنے بزرگان سلف کی نہ زبان ہی باقی رہی او
نہ اُن کا نغمہ ہی باقی رہ گیا۔ پُرانے یونانیون کی موسیقی کا جو کچھ حصہ مل سکتا ہے
وہ انکی چند منتشر تحریرین ہین جو کسی کی سمجھ مین نہین آ سکتین۔
دنیا مین جس وقت خط ایجاد کیا گیا تو اسکی پوری کوشش کی گئی کہ انسان
کی آوازین مخارج کے لحاظ سے مختلف حروف مین قلمبند کرلی جائین تاکہ جو لفظ
مخارج کی آوازون سے مرکب ہے اپنے ہی حروف کے ذریعہ سے تحریر مین

لا یا جائے۔ لیکن اس کی کبھی کوشش نہیں کی گئی کہ آواز اپنی ترقی و تنزل۔ اپنے زیر و بم۔ اور مینڈون اور زمزمون کے لحاظ سے تحریری نشانات مین دکھائی جائے۔ ایسی کمی تھی جس کے باعث کوئی قوم اپنے موسیقی کو چاہے وہ کیسے ہی کمال کے درجے کو پہونچی ہوئی ہو دوسرون کے ذہن نشین کرنے کے لیے قلمبند نہ کر سکی۔

یونان کے اکثر قدیم فلسفیون خصوصاً فیثا غورس۔ افلاطون۔ اور ارسطو کے شاگردون نے موسیقی پر لکھا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنون یونان مین موسیقی کا سکھانا اعلیٰ طبقے کے رئیس زادون کی تعلیم کا جزو لازمی تھا۔ اور نیز یہ کہ دلچسپی اور صحبتون مین لطف ہی پیدا کرنے کے لیے نہین بلکہ مذہبی رسوم اور عبادات مین بھی موسیقی سے کام لیا جاتا تھا۔ وہ لوگ چونکہ ایشیاے کوچک سے جا جا کے بسے تھے اور وہین کے علاقون کے نام کی نو آبادیان یونان مین قائم ہو گئی تھین لہذا انھین نو آبادیون یا اُنکے اصلی ایشیائی علاقون کی جانب اُنکی دُھنین اور اُنکے نغمے منسوب تھے۔ چنانچہ اپنے بعض نغمون کو لیڈیا سے ماخوذ بتاتے تھے جہان پُرانا مغنی امفی اون اِس فن کی تعلیم دیتا تھا۔ بعض نغمون کو ارکاڈیا سے حاصل کیا تھا جہان چرواہے بانسلی وغیرہ مین نہایت ہی دلکش تانین لگایا کرتے تھے۔ اُن کے گانے کے ٹھاٹھ مقامات فریجیا۔ ڈوریا۔ ایولیا۔ اور ایونیا کی جانب منسوب تھے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ یونانیون کی موسیقی صرف سُرون تک محدود تھی۔ اور اُس مین لے نہ تھی۔ کیونکہ اُن کے نزدیک وزن کا تعلق صرف نظم سے تھا۔ مگر غالباً یہ قیاس ویسا ہی ہو جیسے ہندوستان کے موسیقی دان اکثر اعتراض کیا کرتے ہین کہ انگریزی موسیقی مین لَے نہین ہے۔ یونانیون نے اپنے علمی مذاق سے اس بات کی بھی کوشش کی تھی کہ موسیقی کی دُھنون کو تحریر مین لے آئین۔ مگر اس کوشش مین کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لیے کہ جو اُن کے گلے سے نہ سُن چکا ہو وہ اُس تحریر کے ذریعے سے ہرگز نہین سمجھ سکتا کہ وہ نغمہ سُرون کی کس مناسب ترتیب سے اور کس دُھن مین ادا ہوتا ہے۔ اُنھون نے موسیقی کی تحریر کی بنیاد حروف تہجی پر رکھی تھی۔ سُرون کے لحاظ سے اُن حرفون کی صورتین بدلی اور

بگاڑی گئی تھین جس کی بدولت ان کی بہت سی مختلف صورتین ہو گئین۔ اور پھر اُن پر زیر و بم اور زمزمہ وغیرہ کے علامات اضافہ کیے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑھتے بڑھتے سولہ سو سے زیادہ تحریری نشانات ہو گئے۔ اور موسیقی کی حیثیت سے اُن کی الف بے چینیون کی الف بے بن گئی۔ جس مین ہزارون حروف ہین۔ اور آخر اُن علامتون اور بگڑے اور بدلے حرفون کی وجہ سے وہ اس قدر پیچیدہ ہو گئی کہ کسی طرح سمجھ مین نہین آ سکتی۔ مگر اس بات کا ضرور اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھون نے موسیقی مین کس قدر زیادہ ترقی کر لی ہوگی۔ متاخرین مین یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ "آیا یونانیون کو متخالف نغمون یعنی مرکب دھنون کا علم تھا یا نہین؟" اور بڑے رد و قدح کے بعد جو فیصلہ ہوا یہ تھا کہ "نہین۔ انھین ایسی دُھنون کا علم نہ تھا"۔

یونانیون مین عرب کے بازار عکاظ کی طرح مختلف شہرون مین میلے ہوتے تھے جن مین ہر قسم کے کرتب اور ہر فن کے کمالات دکھائے جاتے۔ اُنھین میلون مین یونانی شعرا اپنی نظمون کو ہمارے مولانا شبلی کی طرح موسیقی کی مناسب دُھنون مین گا گا کے سُنایا کرتے۔ نیمین اور ارتھمین گیمون (میلون) مین موسیقی اور شاعری کے لیے انعام مقرر تھے۔ اور پیتھیا کے گیم (میلے) مین جو بہت آخر آخر زمانے مین ہوا کرتا تھا صرف باجون اور آلات طرب پر کمال دکھانے والون کو انعام دیا جاتا۔ یونانیون مین جتنی عزت موسیقی کے پروفیسرون کی تھی اور کسی فن کے پروفیسرون کی نہ تھی۔ اور انھین بڑی بھاری تنخواہین ملا کرتی تھین۔

اہل یونان نے جس طرح موسیقی کو مصر والون سے لیا تھا اسی طرح رومیون نے یونانیون سے لیا۔ روم کی قوم ایک خالص سپہ گر اور جنگجو قوم تھی۔ اور ایسے فنون لطیفہ کی طرف فوجی مذاق والون کو زیادہ توجہ نہین ہو سکتی۔ مگر پھر بھی وہ فن موسیقی کی نہایت قدر کرتے تھے اور موسیقی دانون کی اُن مین بڑی عزت کی جاتی تھی۔ اپنے ابتدائی عروج کے زمانے مین اس فن کو اُنھون نے بہت ہی کم ترقی دی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ مطلق توجہ نہین کی۔ یہان تک کہ نیرو قیصر کا زمانہ آیا

اور اُس نے باوجودیکہ ظالم تھا موسیقی کو اعلیٰ درجۂ ترقی و عظمت تک پہونچا
دیا۔ اُس نے خود اس فن لطیف کو حاصل کیا۔ اور اپنا زیادہ وقت تو زیو
کی شاگردی مین صرف کر دیا جو اُس عہد کا سب سے زیادہ نامور مغنی تھا اور
چنگ نواز تھا۔ اور چونکہ اس فن کی جانب سلطنت کی توجہ مائل ہو گئی تھی ا
نیرو کے بعد اس کے جانشینون نے بھی جہان تک بنا موسیقی۔ فوجی گرتیون
اور ڈراما کو معتدبہ ترقی دی۔ یہان تک کہ رومیون کے تنزل کے ساتھ اُن کی
موسیقی بھی مٹ گئی۔ جس کے بعد مدتون اور صدیون بعد موجودہ اہل اطالیہ
نے اپنی پرانی موسیقی کو پھر زندہ کیا۔

رومیون کے معاصر ایران کے ساسانی تھے۔ اگر غور سے دیکھیے تو اُن کی
قدیم الایام کی سطوت و حیرت ساری دنیا سے جس قدر بڑھی ہوئی تھی اور
جس انتہائی کمال کو اُنکی عیش پرستی پہونچی ہوئی تھی وہی درجہ اُنکی موسیقی
کو بھی حاصل تھا۔ اُن مین قدیم الایام سے بڑے بڑے مغنی اور سرود و چنگ
نواز ہوتے چلے آئے تھے مگر آخر مین باربد اور نکیسا نے جو خسرو پرویز کے دربار کے
مغنی کہے جاتے ہین اس فن کو ایسے کمال تک پہونچا دیا کہ اپنے نغمون سے
ساحری کا کام لیتے۔ مگر افسوس اُنکی تاریخ کی طرح اُنکی موسیقی کا بھی نام ہی
نام دنیا مین باقی رہ گیا۔ اُن کی عظمت و سطوت کی تاریخ تو دیگر معاصر اقوام
کے ذریعہ سے تھوڑی بہت مل بھی گئی مگر اُنکی موسیقی کا ذوق کسی غیر کو کیا
ہو سکتا تھا جو وہ ہمین اُسکی خوبیون سے آگاہ کرتا۔

اب عربون نے رومیون اور ساسانیون دونون کا دفتر اُلٹ کے شام
و عراق مین ایک نئی اسلامی معاشرت قائم کی۔ قرون اولیٰ مین مسلمانون نے
خداپرستی اور عبادت کے جوش و ذوق مین موسیقی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا
خصوصاً اس لیے کہ موسیقی بت پرستون کی عبادات مین داخل تھی۔ اور بنی
اسرائیل کا خداپرست گروہ اس فن سے قطعاً متنفر تھا۔ اگرچہ حضرت سرور کائنات
صلعم نے عورتون اور لڑکیون کو بارہا گاتے بجاتے دیکھا اور نہین روکا تھا۔ حبشیون کا
رقص دیکھا اور نہین منع فرمایا تھا۔ فن تجوید و قرأت کی تحصیل کو موجب ثواب آخرت

بنایا جو کہ دراصل موسیقی ہی کا ایک روح افزا شعبہ تھا۔ جس سے کافی طور پر
استدلال کیا جا سکتا ہے کہ موسیقی کا وہی حصہ ممنوع ہے جو رسوم بت پرستی یا جذبات
شہوت پرستی سے تعلق رکھتا ہو۔ مگر اسلام مین سوا ظاہریہ فرقہ اہل حدیث کے اکثر
علما نے موسیقی کو ناجائز ہی قرار دیا۔ گو صحابہ اور تابعین ہی کے زمانے مین ہم
ایسے اتنے بڑے اور اس پائے کے لوگون کو گانا سنتے دیکھتے ہین کہ ہمین تحریم موسیقی
کے عام فتوے پر تعجب آتا ہے۔ اس شرعی روک پر بھی مسلمانون مین فن موسیقی
کو اتفاقی طور پر ترقی حاصل ہونے لگی۔ جس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ صرف امراو
ملوک ہی نہین سلف کے مسلمان اتقیا و زہاد بھی دینی خلوص اور بے نفسی کے
جذبات کے ساتھ ذوق و شوق سے گانا سننے لگے۔ سب سے پہلے ابو مسجح نے
جسکو ہم دلگداز ہی کے صفحون پر بتا چکے ہین۔ فارس و روم کے دور و دراز شہرون
کی خاک چھان کے دنیا کے مسلّم باکمالون سے فن موسیقی کو سیکھا اور اسکے بعد
موقع بموقع مناسب اور مقبول عام دُھنین قائم کین۔ ابو مسجح کے بعد عربون مین
بڑے بڑے نامور مغنی پیدا ہونا شروع ہوے جن کے مفصل حالات کتب تاریخ
مین موجود ہین۔ خصوصاً مامون کے زمانے مین اُسکے دربار کے مغنی اسحٰق موصلی
اور مامون کی بہن علیہ نے موسیقی کے ایسے ایسے کمالات دکھلائے کہ عربون کے
نزدیک ساری دنیا مین اُن سے بڑے مغنی موجود نہ تھے۔ اغانی کی ضخیم کتاب
جو بیس اکیس جلدون مین ختم ہوئی ہے صرف "مائۃ اصوات المختارۃ" یعنی دولت
عباسیہ کے عہد کی سو مقبول عام دھنون کے بیان مین ہے۔

مسلمانون کے اعلیٰ کمال موسیقی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انکا سب
سے بڑا فلسفی اور حکیم ابو نصر فارابی جو حکماے اسلام مین معلم ثانی کے لقب سے یاد کیا جاتا
ہے جسکی نسبت سب کو اتفاق تھا کہ ارسطو کے بعد اُسکے پایہ کا کوئی حکیم دنیا مین
پیدا نہین ہوا۔ اور جسکے تصانیف نے ابن سینا کو حکیم بنا دیا تھا۔ چوتھی صدی
ہجری کے آغاز مین موسیقی کا سب سے بڑا باکمال پروفیسر تھا۔ موسیقی کا مشہور باجہ
"قانون" اسی کا ایجاد کیا ہوا ہے۔ وہ بخلاف دیگر علما و فضلا کے ترکی سپاہیون کی
وضع مین رہا کرتا تھا۔ اور صورت دیکھ کے لوگ سمجھتے کہ کوئی معمولی درجے کا فوجی ترک ہے

جب شہر دمشق مین پہونچا تو اُسی سادی سپاہیانہ وضع میں فرمانروائے شام سیف الدولہ بن حمدان کے دربار مین گیا۔ جہان بڑے بڑے مشہور روزگار علما جمع تھے۔ اس مہذب مجمع مین ابو نصر کو خاموش کھڑے دیکھ کے سیف الدولہ نے کہا "بیٹھ جاؤ"۔ ابو نصر نے پوچھا "اپنے رتبہ کے مناسب مقام پر بیٹھوں یا آپکے دربار کی مناسبت سے؟" سیف الدولہ نے کہا "اپنے رتبے کے مناسب مقام پر"۔ یہ سنتے ہی ابو نصر اہل دربار کی تمام صفون کو قطع کرتا ہوا خود سیف الدولہ کی مسند پر پہونچا اور اس طرح پھیل کے بیٹھ گیا کہ خود سیف الدولہ بھی مسند سے باہر نکل گیا۔ یہ دیکھ کے سیف الدولہ دل مین نہایت برہم ہوا اور اپنے مسلح غلامون کی طرف دیکھ کے ایک خاص زبان مین جسکو سوا اُسکے غلامون کے دربار کا کوئی اور شخص نہ سمجھتا تھا کہا "اس شخص نے سخت بے ادبی کی ہے مین اس سے چند سوالات کرتا ہون اگر جواب نہ دے سکے تو بے مجھ سے پوچھے اس کے ٹکڑے اُڑا دینا"۔ غلام تو خاموش ہو رہے مگر ابو نصر نے اُسی زبان مین جواب دیا "یا امیر صبر کیجیے ہر امر کا انکشاف انجام مین ہوا کرتا ہے"۔ سیف الدولہ نے گھبرا کے پوچھا "تم اس زبان کو جانتے ہو؟" جواب ملا "جی ہان جانتا ہون۔ اور اسی زبان پر موقوف نہین ستر زبانون مین بخوبی گفتگو کر سکتا ہون"۔ یہ کہکے ابو نصر نے علماے گفتگو شروع کی جو فن مین شہرت رکھتا تھا اُسی فن مین بحث کرکے اُسے خاموش کر دیا۔ اور تھوڑی ہی دیر مین ظاہر ہو گیا کہ سارے علماے دربار مین سے کوئی بھی کسی فن مین اُس کی ہمسری کا دعوے نہ کر سکتا تھا۔ تمام حاضرین اور خود سیف الدولہ کی یہ حالت تھی کہ عش عش کر رہے تھے اور حیران و مبہوت تھے۔ نوبت یہان تک پہونچی کہ علما حاضرین نے دربار شاہی کو مدرسہ بنا دیا اور جو الفاظ ابو نصر کی زبان سے نکلتے اُسے قلمبند کرنے لگے۔ یہ رنگ دیکھ کے سیف الدولہ نے دربار کے برخاست کا حکم دے کے علما کو رخصت کر دیا اور ابو نصر کو ساتھ لے کے دربار خاص مین چلا اور پوچھا "کچھ نوش فرمائیے گا؟" ابو نصر نے کہا "نہین"۔ پوچھا "کچھ پیجیے گا؟" "نہین"۔ پوچھا "اچھا گانا سنیے گا؟" ابو نصر نے کہا "ضرور! اس کا تو مجھے خاص شوق ہے"۔ فوراً ارباب نشاط حاضر ہوئے۔ اُس زمانے کی مشہور و مقبول عام گانے والیان سامنے کھڑی ہو کے مجرا کرنے لگین اور آلات طرب بجنے

بجنے اعلیٰ درجے کے ماہر شہر مین موجود تھے اپنے اپنے سازلے کے کھڑے ہوے اور بجانے لگے۔ مگر ابو نصر کی یہ حالت تھی کہ ہر ایک کے گانے بجانے مین عیب نکالتے۔ اور ایسی سخت نکتہ چینیان کین کہ اُنکے رعب سے گانے بجانے والون کو اپنا فن بھول گیا۔ اور سیف الدولہ نے تعجب سے کہا "کیا جناب اس فن کو بھی جانتے ہین؟" جواب دیا "جی ہان جانتا ہون"۔ اب سب لوگ مُصر ہوے کہ "کچھ سنائیے"۔ ابو نصر نے کہا "بہتر"۔ یہ کہکے ایک تھیلی مین سے جو ساتھ تھی لکڑی کے چند ٹکڑے سے نکالے۔ اُنھین ایک خاص ترتیب و ترکیب سے جوڑ کے بٹھایا۔ اُن پر تار کھینچے اور اُنھین بجا بجا کے ایک ایسی دُھن مین گانا شروع کیا کہ جو سنتا اُسے ہنسی آنے لگتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دم بھر مین تمام حاضرین مارے ہنسی کے لوٹنے لگے۔ پھر اُنھون نے اُسی ساز کو کھول کے نئی ترکیب سے جوڑا۔ اور ایکی سُر ملا کے جو گانا بجانا شروع کیا تو تمام حاضرین زار و قطار رو رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ در و دیوار پر رقت طاری ہے۔ اسکے بعد اُنھون نے اس ساز کو پھر کھول ڈالا اور تیسری ترکیب سے جوڑ کے بجانا شروع کیا تو تمام سامعین پر غنودگی طاری ہوئی۔ چند منٹ نہین گذرے تھے کہ سب لوگ حتے کہ خود سیف الدولہ اور پہرے والے تک غافل سو رہے تھے۔ ان سب کو غافل دیکھ کے ابو نصر نے اپنا ساز کھول کے تھیلی مین رکھا۔ چپکے سے اُٹھ کے چلے گئے۔ اور سب لوگ سوتے کے سوتے رہ گئے۔ ان باتون کا یہ اثر تھا کہ علامہ ابو نصر فارابی مرتے دم تک سیف الدولہ کے دربار مین رہے۔ اور سیف الدولہ ہی نے اُنکے جنازے کی نماز پڑھائی۔ حکیم ابن سینا بھی اس فن کا اتنا بڑا باکمال تھا کہ شہنائی اُسی کی ایجاد ہے۔

عربون نے بھی یونانیون کی طرح اس بات کی کوشش کی کہ فن موسیقی کو تحریر مین لائین۔ سُرون اور گلے کے دیگر خصائص نغمہ کے اظہار کے لیے کسی خاص نشانات کے ایجاد کی طرف تو اُن کا خیال نہین گیا مگر سُرون کو سرود کے تارون اور اُنکے ساتھ انگلیون کے تعلقات کا لحاظ رکھ کے اُنھون نے اپنے تصانیف مین مضمون کو اس طرح بتانا چاہا کہ مثلاً "ثقیلٌ اولٌ بالسبابۃ فی مجرے البنصر"

زثقیل ہے اور اول۔ بیچ کی اُنگلی سے گر چھنگلیا کے برابر والی اُنگلی کی چال میں) اسی طرح کی بیسیوں اصطلاحیں ہیں جن کو ہم اور ہمارے زمانے کے لوگ مطلقاً نہیں سمجھ سکتے۔ حالانکہ عربی کی جو ہزارہا دُھنیں ان اصطلاحوں میں بتائی گئی ہیں اُن سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ افسوس اُن سے ہمارے موجودہ موسیقی دان فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ خلافت عباسیہ کے ساتھ ہی عربوں کی موسیقی بھی مٹ گئی۔ کیونکہ جس طرح مسلمانوں نے اپنے قرونِ اولیٰ کے تمام فنون کو آخر تک محفوظ رکھا تھا اپنی پُرانی موسیقی کو وہ نہ بچا سکے۔ جو تھوڑی بدنصیبی کی بات نہیں ہے۔

اصل یہ ہے کہ موسیقی خالص علمی فن ہے۔ اور اس کا تعلق بہت کچھ ہر قوم کے زبان۔ لہجے۔ اور اُسکے مخارج و اصوات سے اور اس سے بھی زیادہ اُس قوم کے گلے کے خصائص اور اُسکے مذاق و عادات کے ساتھ ہوتا ہے۔ زبان۔ لب و لہجہ۔ مخارج اور ذوق و عادت کے چھوٹنے کے ساتھ ہی موسیقی بھی چھوٹ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان عرب سے نکلنے کے بعد جہاں گئے اپنے مذہب اور اپنے تمام علوم و فنون کو تو ساتھ لیتے گئے مگر موسیقی کو نہ لے جا سکے۔ ایران میں پہونچ کے جب وہ فارسی بولنے لگے تو اُن کی موسیقی بھی وہی ہو گئی جو ایران میں فارسی بولنے والوں میں مروج تھی۔ اور جب ہندوستان میں آکے ہندی بنے تو عربی موسیقی بالکل خواب و خیال ہو گئی اور ہندوؤں کی موسیقی اُن کی موسیقی بن گئی۔

شاعری کا فن بھی اسی قسم کا ہے۔ مگر چونکہ اُسکا بہت کچھ حصہ خیالات و تشبیہات سے وابستہ ہے۔ اسلیے مسلمان جہاں گئے اپنی شاعری کو ساتھ لیتے گئے۔ مسلمانوں کے زمانے کی فارسی شاعری دراصل عربی شاعری ہی کا ایک نمونہ ہے جس میں باستثنائے چند جملہ تشبیہات و استعارات عربی سے ماخوذ ہیں۔ اور یہی حال ہماری اُردو شاعری کا ہے جو آج تک زیادہ تر عربی شاعری ہی کا ایک ضمیمہ ہے۔ مگر عربی موسیقی نہ ایران آسکی اور نہ ہندوستان میں پہونچ سکی۔ اگر موسیقی کے لیے کوئی ایسا خط ایجاد ہو جاتا جس میں آوازیں مخارج کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے مختلف سُروں اور گھٹنے بڑھنے کے

اعتبار سے نقوش میں ادا کی جا سکتیں اور تانوں۔ میڈوں اور گٹکری وغیرہ گلے کی مخصوص حرکات کی بنا پر علامات تحریری قائم کر دیے جاتے تو شاید عربی موسیقی ایسی تحریر میں آجاتی تو آج تک بتا سکتی کہ اُنکے موسیقی کے کیا اصول تھے اور وہ کس وضع کی تھی۔

ہندوستان میں مسلمان عربی و ایرانی موسیقی کو بھول گئے اور اُنھیں اپنے پُرانے نغموں کے عوض سنسکرت کا ایک ایسا مکمل فن موسیقی مل گیا جو باعتبار اپنے قدیم اصول اور اپنی وسعت کے ساری دنیا کی موسیقی سے بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ موسیقی جو ہندوؤں کی صحبت ہائے عیش اور اُنکی عبادتوں کی جان تھی چند ہی روز میں راجاؤں کی سبھاؤں سے مسلمان بادشاہوں کے درباروں اور ہندوؤں کے مندروں سے مسلمان صوفیوں کی محفل حال و قال میں پہونچ گئی۔ اور آخر دولت مغلیہ کے عروج کے زمانے میں خود مسلمانوں میں ہندی موسیقی کے ایسے ایسے باکمال پیدا ہو گئے کہ اُنکے سامنے ہندو گویوں کی شہرت مٹ گئی اور جنکے گانے کے کمالات آج قومی روایتوں میں کرامات و معجزات کی شان سے بیان کیے جاتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ آج کی موسیقی کا فن زیادہ مسلمانوں ہی میں ہے اور بڑے بڑے مشہور گویے سب مسلمان ہیں۔ ہندی موسیقی کی تفصیل بتانے کے لیے اسوقت ہمارے پاس کافی گنجائش نہیں ہے جس کسی کو شوق ہو فارسی کی کتاب "اصول النغمات الآصفیہ" اور راجہ نواب علی خان صاحب کی کتاب "معارف النغمات" کا مطالعہ کرے۔

رومیوں کے بعد یورپ کی موسیقی مدتوں تک نہایت ہی ابتر حالت میں رہی عیسائیوں نے چونکہ بت پرستوں کی تمام باتوں کو اختیار کر لیا تھا اس لیے موسیقی کو بھی روم کے پُرانے بتخانوں کی طرح اپنے معبدوں اور گرجوں میں مروج کر دیا۔ مگر اُنکی ابتدائی زمانے کی موسیقی ہمارے ڈفالیوں کے راگ سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی۔ ۳۸۶ء میں شہر ملان کے اُسقف سینٹ امیروس نے یہ دیکھ کے کہ گرجوں کی موسیقی بالکل بے اصول اور پراگندہ ہے اصلاح کی طرف توجہ کی اور وہ خاص دُھن ایجاد کی جو "امیروسین چانٹ" (نغمہ امیروس) کے نام سے مشہور ہے۔

پوپ گرگوری کے مرنے کے بعد جو ۶۰۴ء کا واقعہ ہے اس بات کی
کوشش شروع ہوئی کہ موسیقی کی دُھنون کو کس طریقے سے قلمبند کیا جائے
مگر اِس زمانے مین جو خط موسیقی ایجاد کیا گیا اُس کا لکھنا چاہے آسان ہو مگر
گاتے وقت اُس کا لحاظ رکھنا اور اُس پر عمل کرنا بہت ہی دشوار تھا۔ اسلیے کہ
ہمارے یہان جس طرح بعض لوگون نے سُرون کے نامون کے پہلے حرف [illegible]
لکھ دیے ہین وہان بھی لکھ دیے جاتے تھے۔ مثلاً سرگم کی جگہ س یا سُر۔ رکھب
کی جگہ ر یا رکھ۔ گندھار کی جگہ گ یا گن۔ یہ تحریر کسی حد تک دُھنون کو محفوظ
ضرور کر سکتی تھی مگر گانے والے گاتے وقت اُن سے مطلق فائدہ نہ اٹھا سکتے
تھے۔ اور آواز کے دیگر خصائص تو مطلقاً نہین معلوم ہو سکتے تھے۔

دسوین صدی کے آخر مین اس تحریر کو من جمیع الوجوہ ناقص دیکھ کے
ایک نیا طریقہ ایجاد کیا گیا۔ اس مین سُرون کے شمار کے لحاظ سے سات
متوازی خطوط قائم کیے جاتے۔ نغمہ کا خط اُن مین لہراتا ہوا چلتا اور گلا جس سُر پر
پہونچتا اُسی سُر کی لکیر پر پہونچا دیا جاتا۔ اور اسکے ساتھ گلے کے دیگر خصائص و حرکات
نقطون اور خطون کے اشارے سے بتا دیے جاتے۔ اس خط نے موسیقی کی تحریر
بہت آسان کر دی۔ لیکن ۱۰۲۲ء مین جب پوپ بنی ڈکٹ ہشتم کا زمانہ تھا اس
خط موسیقی مین اور بہت سی ترقیان اور اصلاحین ہوئین۔ چنانچہ اسی زمانے
مین پادریون کے بنی ڈکٹن گروہ کے ایک راہب نے جو علاقہ ٹسکانی کے ایک
گمنام گاؤن آرزو مین پیدا ہوا تھا اور گوئی ڈو کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ساتون
خطوط متوازی کا شمار سات سے گھٹا کے چار ہی کر دیا۔ اسلیے کہ چار خطوط اور اُنکے
درمیان کی تین خلاؤن مل کے سات مقامات قائم ہو سکتے تھے۔ اس مین چونکہ
خطوط کی درمیانی خلا سے بھی کام لیا گیا تھا اس لیے نقطون اور آڑے خطون سے
علامات و نشانات اُن خطون کے درمیان مین بھی قائم کر دیے جاتے۔ یہی
تحریر موسیقی آج تک یورپ مین مروج ہے۔ اور وہان کے تمام موسیقی کالجون
مین اسی خط موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اگرچہ اس اعتراض کا جواب مین
کہ سنسکرت کی قدیم مکمل و باضابطہ موسیقی سے غافل رہ کے یورپ

والون نے اپنے آپ کو ایک بڑے علمی ذخیرے سے محروم و بے بہرہ کر رکھا ہے
مگر اس مین شک نہین کہ یورپ مین فی الحال ہر حیثیت سے موسیقی کو بڑی
ترقی ہو رہی ہے۔ اور گلے بازی اور آلات طرب دونون چیزون مین وہ ممالکِ
مشرق سے بڑھتے جاتے ہین۔

ہمارے یہان بھی اب موسیقی جاہل مغنیون سے نکل کے پڑھے لکھے اور شائستہ
لوگون مین آنے لگی ہے۔ بعض علما نے اسکے جواز کے فتوے دیے ہین۔ اور ہندوؤن
نے بھی اپنے قدیم موسیقی کو نئے سرے سنبھالنا اور اس مین از سرِ نو جان ڈالنا
شروع کر دیا ہے۔ ایسی حالت مین یہ دیکھ کر تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے موسیقی کے
تحریر مین لانے کی اس وقت تک مطلقاً کوشش نہین کی گئی۔ جبکہ اُردو کا نیا
"شارٹ ہینڈ" خط بھی ایجاد ہو گیا تو تعلیم یافتہ شائقین موسیقی کی کوشش
سے کسی مکمل خطِ موسیقی کا ایجاد ہونا ہماری موسیقی کی ترقی کے لیے لازمی
اور ضروری ہے۔ ہم امید کرتے ہین کہ ہمارے احباب اس کمی کو جلد پورا
کرین گے۔

ہندوؤن کے علوم (نومبر ۱۹۱۳ء)

دُنیا اپنی نادانی سے چاہے قدر نہ کرے مگر سچ یہ ہے کہ ہندو مذہب اور
اُسکے ساتھ ہندوؤن کی قوم موجودہ دنیا کے آغوش مین ایک نامعلوم قدامت کی
قابل قدر امانتین ہین۔ اور سلف کے جو ایام قدامت کے دُھندلکے مین آ گئے
اُنکے نہایت بیش بہا تبرکات ہندوؤن کی پُرانی زبان سنسکرت اور اُنکے ہمیشہ
زندہ رہنے والے علوم ہین۔ زمانہ ہر چیز کو مٹاتا رہتا ہے۔ کسی مین چاہے
کیسی ہی ابدی زندگی کی صلاحیت ہو زمانہ اُس پر آہستہ آہستہ مرورِ ایام کی
خاک ڈالتا ہی جاتا ہے۔ یہان تک کہ مدت دراز کے بعد وہی خاک اُسکی قبر
بن جاتی ہے۔ اور وہ بے مرے زندہ دفن ہو جاتا ہے۔ زمانے کے ان زندہ
مُردون مین مصری۔ بابلی۔ اسرائیلی۔ یونانی اور رومی ہین جو ایسے علوم
و فنون اور ایسی تاریخی یادگارین چھوڑ گئے ہین کہ قدامت کی خاک مین دب جانے

کے بعد بھی تہِ خاک سے پکار پکار کے اپنا نام بتاتے اور اپنی زندگی کا ثبوت دیـ
رہتے ہین۔ مگر ہندوستان کی پرانی آریہ قوم نے باوجودیکہ سب سے قدیم ہے زمانے
کی اُس خاک کو ہمیشہ جھٹک جھٹک کے ہٹا دیا۔ اور اُس پر مرورِ ایام کا زور نہ چلنا
تھا نہ چلا۔ اور زمانہ اورون کی طرح اُس کے زندہ دفن کرنے مین کسی طرح کا
نہ ہو سکا۔ ہندو قوم نے زندگی کی مزاحمتون پر ہمیشہ فتح پائی۔ جو جو دشواریان پیش
آئین سب کو خاک کی طرح جھاڑ کے الگ پھینکدیا۔ اور حضرت مسیح سے ہزارہا سال
پیشتر کے اُن پسماندگانِ سلف کو آج بیسوین صدی مین ہم دیکھتے ہین کہ معجز نما زند
ابدی کا جامہ پہنے ہوے اپنے پُرانے علوم کو خود ہی دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہین
آغازِ ہستی کے دنگل کے پہلوانون مین سے آج کون باقی ہے؟ بابل والے۔ اسیر
والے۔ مصر والے۔ ایران والے۔ یونان والے۔ اور اُن کے زلہ خوار اہل روم
سب مٹ گئے۔ نہ اُن کا مذہب باقی ہے نہ اُن کی معاشرت باقی ہے۔ صرف
اُن کے چند علوم ہین جو غیرون کے ہاتھ کا کھلونا ہین۔ مگر ہندو! آبِ حیات سے
سرشار ہندو۔ ابدی ڈھائی چھونے کے مشتاق ہندو! آج پامردی کے ساتھ
خود ہی کھڑے ہوے اپنے مذہب۔ اپنی معاشرت۔ اپنے کارنامون اور اپنی
کو دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہین۔ اور اگر کوئی غیر اُن کے علوم کے سمجھنے مین ذرا
بھی غلطی کرتا ہے تو فوراً جھڑک کے ٹوک دیتے ہین۔ اور اپنی تاریخ و قسمت کا
فیصلہ دوسرون کے ہاتھون مین نہین چھوڑتے۔

ہندوؤن کا نایاب علمی ذخیرہ کیا بلحاظ اُن کی مذہبی روایتون کے اور کیا
بلحاظ اُن کے رسم خط کے نہایت ہی قدیم ہے۔ اور جس قدر قدیم ہے اُسی قدر نا
اس موقع پر ہم چاہتے ہین کہ اُن کے علمون کا ایک مختصر گوشوارہ اپنے احباب
سامنے پیش کر دین۔ اُن کے پُرانے تصانیف قریب قریب سب نظم مین ہین جو ا
کہ اُن کی قدامت کا زبردست ثبوت ہے۔ ظاہر مین لوگ سمجھتے ہین کہ نثر نظم
مقدم ہے۔ لیکن علمی دنیا مین یہ صحیح نہین۔ گفتگو مین بیشک نثر کو تقدم ہے۔
جذباتِ دلی کے ظاہر کرتے وقت انسان مین ایک ایسی متانت اور غیر معمولی کیفیـ
پیدا ہو جاتی ہے کہ چاہتا ہے اُنھین کسی غیر معمولی وضع و عنوان سے ظاہر کرے۔

ق نے انسان کو اُس کے بچپن ہی مین نظم کی طرف متوجہ کر دیا۔ جذبات و خیالات
انہ کو نثر مین ادا کرنا شاعری کے بہت دنون بعد شروع ہوا۔ لہذا ہندوؤن
مین اُن کے تمام علوم کا نظم مین ادا کیا جانا ہی اُنکی قدامت کا ثبوت ہے۔
ہندوون کے قریب قریب تمام علوم کو مذہب نے اپنے آغوش مین لے لیا ہے
اپنا لباس پہنا کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اُن کے علوم مین سب سے مقدم چارون
وید ہین جو انسان مین مذہبی روح پھونکنے کے مکمل ذرائع ہین۔ اُن مین دعاؤن
اور مناجاتون کے ذریعہ سے فلسفۂ دین اور خداشناسی کی بہت اعلیٰ تعلیم دی گئی ہے
اور چارون وید حسب ذیل ہین (اول) رگ وید۔ (دوسرا) یجر وید۔ (تیسرا) سام وید
(چوتھا) اتھروید۔ ان چارون ویدون کے ماتحت چار اُپ وید ہین۔ اور جن کے
نام یہ ہین (پہلا) ایش (دوسرا) دھنش (تیسرا) گندھرب (چوتھا) ارتھ۔ ان
چارون اُپ ویدون کے بعد اُپ انگ ہین۔
چار اُپ وید جن کا ذکر آچکا ہندو مذہب مین دوسرے درجے کی مقدس و محترم
کتابین ہین جن مین جراحی۔ طب۔ موسیقی۔ رقاصی۔ سپہگری۔ معماری اور دیگر فنونِ
علمی کا بیان ہے۔ اور اُن کے دیکھنے سے انسان کو حیرت ہوتی ہے کہ اُس قدیم
زمانے ہی مین ہندوون نے امور معاشرت اور ضروریات زندگی کے متعلقہ فنون
مین کس قدر ترقی کر لی تھی۔

چھ اُپ انگ ان فنون کے بیان مین ہین جو خاص ویدون کی تعلیم سے تعلق
رکھتے ہین۔ یون کہنا چاہیے کہ ویدون کے سیکھنے اور برتنے کے آلات ہین۔ اُن مین
ایک تجوید ہے جس کے ذریعہ سے ویدون کی قرأت و تلاوت کے قاعدے معلوم ہوتے ہین
اُن مین الفاظ کے ادا کرنے کے لہجے۔ آوازون کے مخارج اور دیگر خصوصیاتِ صوت
کو ہین جن کا ویدون کے پڑھنے کے وقت لحاظ رکھنا ضروری و لازمی ہے۔ اُسی
سلسلہ مین نحو و صرف کا فن۔ آوازون کی ترتیب اور اُن کے باہمی تناسب کے
قاعدے اور علوم نجوم و ہیئت بھی بصراحت بتائے گئے ہین۔
ان تمام علمون اور فنون کی نسبت ہندوون کا اعتقاد ہے کہ خداوند جل
جلالہٗ نے اُنھین الہام کے ذریعہ سے نیک نفس و پاک باطن برہمنون کے دلون

مین الفا کر دیا تاکہ اُن کی رو سے دنیا وید کی ربّانی تعلیمون سے فائدہ نہ اُٹھا سکتی۔

اُپ انگ کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وید انگون کے بعد اور اُن سے کم درجے کے ہین۔ لیکن اگر غور سے دیکھو تو وہ بہت ہی عظیم الشان اور اعلیٰ درجے کے علوم عقلی و روحانی پر حاوی ہین۔ اُن مین منطق ہے۔ اور الٰہیات ہین۔ یعنی وہ مسائل و رموز علم الٰہی جو ویدون کی تصریحات کی تشریح کے لیے بعد والون کے ذریعہ سے معلوم ہوے۔ احکام شریعت کا شمار بھی انھین مین ہے۔ اور اسی سلسلہ مین دیوتاؤن اور پُرانے رشیون اور مُنیون کی کہانیان اور داستانین بھی ہین۔ ان سب ضروری کتابون کی مجموعی تعداد اٹھارہ ہے اور یہی کتابین پُران کہلاتی ہین جن کے ماننے سے آریہ سماج والے انکار کرتے ہین۔ لیکن چاہے اُن پر بھروسہ نہ کیا جائے مگر یہ غیر ممکن ہے کہ اُن سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے۔ اس لیے کہ یہ تمام علوم ویدون کے حرم مین داخل ہونے کی کنجیان ہین۔ جن کو چھوڑ دیا جائے تو نہ ویدون کے معنون سے صحیح استدلال کیا جا سکے گا اور نہ اُنکے سمجھنے پر پورا وثوق ہو سکے گا۔

مذکورہ علمی کتابون کے علاوہ ہندوون کے قدیم علمی خزانے کا زیور دو نہایت ہی مہتم بالشان منظوم کتابین ہین جو مقدس روایات مین شامل کر دی گئی ہین۔ یہ دونون رامائن اور مہابھارت ہین۔ رامائن مین اجودھیا کے چندربنسی تاجدار راجہ رام چندر جی کے حالات و واقعات عجب موثر و معجز نما شاعری مین بیان کیے گئے ہین جو نہایت ہی دلچسپ و نتیجہ خیز ہین۔ اور تاریخی قصے کے عنوان سے دینی و روحانی برکتین ظاہر کرتے ہین۔ رام چندر جی۔ بشن جی کے ساتوین اوتار مانے جاتے ہین۔ اور اُنکی زندگی اعلیٰ ترین کمالات انسانی کا نمونہ ہے۔ مہابھارت مین وہ عظیم الشان لڑائی مذکور ہے جو ہستناپور کے تخت کے لیے پانڈو اپنے بنی اعمام کوروون سے لڑے تھے۔ اور جس کی نسبت ہندوون کا عقیدہ ہے کہ دنیا مین کبھی اس سے بڑی کوئی لڑائی نہین ہوئی تھی۔ ان کتابون کے مقابلے مین یونان کے پہلے شاعر ہومر کی مثنویان ایلیڈ اور اوڈسے پیش کی جاتی ہین۔ مگر کیا بلحاظ حسن بیان اور کیا باعتبار شاعرانہ خوبیون کے یونان کی اُن دونون پُرانی منظوم کتابون

کو ہندوستان کی رامائن و مہابھارت سے کوئی نسبت نہین۔ مہابھارت اٹھارہ کتابون یا بابون پر منقسم ہے اور اُس مین ایک لاکھ سے زیادہ بند ہین۔

اب ہندوون کی اُن چند کتابون کا مختصر تذکرہ بھی ضروری ہے جو اُن کے مذکورہ قدیم لٹریچر سے ملحق اور اُنکے ضمیمے ہین۔ اول مُگدھ بُدھ (یعنی حُسن علم) مصنفہ گوسوامی جی۔ یہ اصل مین سنسکرت کی بہترین گرامر ہے۔ جس مین قواعد صرف و نحو نہایت صفائی و توضیح سے بتائے گئے ہین۔ فن لغت مین سنسکرت کی اٹھارہ کتابین مشہور ہین۔ مگر اُن سب سے بہتر اور مکمل "امر سنگھ" ہے۔

سنسکرت کی نظمون سے عجب قسم کا سوز و گداز اور نہایت ہی شیرینی ظاہر ہوتی ہے جس کا آغاز اُن کے قدیم تر شاعر والمیکی جی سے ہوا ہے۔ انھون نے اپنی مشہور کتاب رامائن کے علاوہ ایک اور پُر درد واقعہ منظوم کیا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک نوجوان اپنی تازہ فرین معشوقہ کے ساتھ گھر بار سے دُور ایک پُر فضا دشت مین سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ جو مار ڈالا گیا۔ اور اُس کی معشوقہ اُس جنگل مین اپنے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جانے والے عاشق کی لاش پر روتی پیٹتی اور آہ و زاری کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ والمیکی کے متبرک قلم نے جسے مبدأ فیاض سے الہامی دولت ملی تھی اس حسرتناک داستان مین کیسا سوز و گداز اور کیسا دل کو تڑپا دینے والا اثر پیدا کر دیا ہوگا۔

ڈراما کی ایجاد اگرچہ بہت پہلے ہو چکی تھی مگر کالی داس کی شہرت نے پُرانے سنسکرت ڈراما کو تقریباً فنا کر دیا۔ یورپ والے اب جو اُسکے کمالات سے واقف ہوئے ہین اُسے مشرق کا شیکسپیئر کہتے ہین۔ اس کا بہترین ڈراما "سکنتلا" ہے جس کا ترجمہ انگریزی مین سر ولیم جونس نے اور جرمنی زبان مین فارسٹر ہرڈر اور دیگر سنسکرت دان مصنفین جرمنی نے کیا ہے۔ ہرڈر کو یہ ڈراما اس قدر پسند آیا کہ کہتا ہے "اس عظیم الشان ڈراما کا ہر سین ایک چمن ہے۔ جس کی ہر ہر کیاری سے دلچسپ واقعات فطرتی طور پر خوبصورت پودھون کی طرح اُگ آتے ہین اور اس مین کثرت سے وہ پُر اثر اور نازک خیالات ملتے ہین جن کا یونانی ڈرامون مین کہین پتہ نہین۔ اسی کالی داس کی ایک اور نظم "میگھ دوت" ہے۔

ولکنس نے انگریزی مین اس کا ترجمہ کیا ہے اور شرق کے شاعرانہ کمالات پر شعرائے مغرب کو حیران کر دیا ہے۔

ہندو لٹریچر کی قدر یورپ خصوصاً جرمنی مین روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ مگر ہندو لوگ محض اس غرور مین کہ یہ علوم اُن کے اور اُنکے گھر کے ہین اُس قدر توجہ نہین کرتے جیسی کہ ہونی چاہیے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ہندؤن کو سنسکرت دانی کا شوق ہو چلا ہے۔ اور جا بجا اُس کے مدارس اور کالج قائم ہو رہے ہین۔ خصوصاً بنارس تعلیم سنسکرت کی اعلیٰ یونیورسٹی قرار پا گیا ہے۔ لیکن جب تک سرکاری یونیورسٹیون کا یہی طرز عمل رہے گا اور جب تک یونیورسٹی کی ڈگریان ذریعہ معیشت بنی رہین گی ابنائے وطن مین ہندو ہون یا مسلمان تحصیل علم کا سچا ذوق پیدا ہونا دشوار ہے۔ دعویٰ کیا جاتا ہے اور بظاہر صحیح بھی نظر آتا ہے کہ ان یونیورسٹیون اور تعلیم کے موجودہ انتظامات نے ہندستان مین علم کو بڑھا دیا ہے۔ لیکن اگر غور کرو تو علم بڑھا نہین بلکہ گھٹا اور گھٹتا جاتا ہے۔ جو قوم علم کو کاسۂ گدائی بنانا چاہتی ہوُاسے علم ہرگز نہین آ سکتا۔ اگلے زمانے کا ایک متبحر ویدانت یا شاستری اسی طرح مسلمانون مین ایک عالم و فاضل آج کل کے سیکڑون سند یافتہ گریجوئیٹون سے اچھا تھا۔ ویسے دو عالم اچھے اور ایسے دو ہزار زبردست علم فروش نہین اچھے۔ کاش ہندو مسلمان اپنی اپنی یونیورسٹیان قائم کرنے کے خبط کے عوض اس بات کی کوشش کرتے کہ سرکاری یونیورسٹیان علم کی سچی اکاڈمیان بنا دی جائین۔ اور ملازمت و کسب معیشت سے انکو کوئی واسطہ نہ رہے جیسا کہ خود انگلستان مین ہے۔ مگر ابھی ہندوستانیون کو اسکی مصلحت سمجھنے کے قابل ہوش نہین آیا ہے۔ ابھی اس مسئلے کو چھیڑنا انگریزی تعلیم یافتون اور گریجوئیٹون کے حقوق مین دخل دینا ہے۔ وہ زمانہ بعد آئے گا جب ہندوستان کے تمام فرزندون کو معلوم ہوگا کہ اپنے وطن۔ اپنی قوم۔ اپنے علوم۔ اور اپنے قدیم کمالات کے حقوق چند گریجوئیٹون کے حقوق سے مقدم ہین۔

—— ⁂ ——

چیچک کا ٹیکہ اور لیڈی مانٹیگو

کتنی بڑی حیرت کی بات ہے کہ چیچک کا ٹیکہ جو آج دنیا مین خدا کی ایک بڑی بھاری برکت ہے اور جس کے رواج دینے پر یورپ جسقدر فخر و ناز کرے بجا ہے در اصل ایک مشرقی علاج ہے۔ اور غالباً مسلمانون ہی سے لیا گیا ہے۔

ہم ہندوستان مین دیکھتے ہین کہ کامیابی کے اتنے تجربون کے بعد بھی اب تک یہ حال ہے کہ ٹیکہ لگائے جانے کے خوف سے مائین بچون کو چھپاتی پھرتی ہین۔ پرانے مذاق کے باپ بجائی ننھے بچون کے لیے ٹیکہ لگانے والون سے کشتیان لڑنے یا اُنھین رشوتین دینے کو تیار ہو جاتے ہین۔ بڑے بڑے مہذب لوگون کا یہ حال ہے کہ دفع الوقتی کے لیے جھوٹ فقرے بناتے ہین اور بہت سے ملکی حکیم اور وید بھی باوجود عقل رکھنے کے اپنی طرف سے تصنیف کر کر کے ٹیکے کے رواج دینے پر مخلف اور طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہین۔ اور یہ نہین پسند کرتے کہ اس لاکھون دفعہ کے آزمائے ہوے علاج سے فائدہ اُٹھایا جائے اُن کی اِس نفرت و مخالفت کو دیکھ کے جب ہم اس کا خیال کرتے ہین کہ یہ طریقۂ علاج اُنھین کے یہان سے سیکھا گیا ہے تو بڑی حیرت معلوم ہوتی ہے۔ اور تعجب آتا ہے کہ اپنی ہی چیز اگر غیرون کے ہاتھ سے ملے تو وہ کس قدر اجنبی اور مہیب بن جاتی ہے؟

ٹیکے کو سب سے پہلے انگلستان کی ایک تعلیم یافتہ شریف زادی اور مہذب دانا خاتون نے رواج دیا جس کا نام لیڈی مانٹیگو میری ورٹلی تھا۔ وہ ۱۱۱۹ھ مطابق (سنہ ۱۶۹۰ء) مین انگلستان کے علاقہ نوٹنگھم شائر مین پیدا ہوئی تھی۔ اعلیٰ درجے کے امیر اور شریف گھرانے کی بیٹی تھی اس لیے اچھی صحبت مین نشو و نما ہوا۔ اُس کا باپ ڈیوک آف کنگسٹن روشن خیال امرائے انگلستان مین تھا اُس نے بیٹی کو اچھی سے اچھی تعلیم دلائی۔ اور بیٹی کو بھی علم و فضل کا ایسا شوق تھا کہ لاطینی زبان مین بہت اچھا درخور حاصل کر لیا اور بڑی نمایان ترقی کی۔

اُنیس برس کے سن کو پہونچی تو انگلستان کے ایک نامی گھرانے کے اقبالمند نوجوان ایڈورڈ ورٹلی مانٹیگو کے ساتھ شادی ہوگئی - جو پہلے ارل آف سینڈوچ کا فرزند تھا - چند روز مین وہ بڑا اقبال - آزاد اور روشن خیال ممبر ثابت ہوا - مشہور شاعر اڈیسن سے اُس سے بڑی دوستی تھی - اور انگلستان کے اعلیٰ درجے کے مدبران سلطنت مین شمار کیا جاتا تھا -

۱۱۳۵؁ محمدی (۱۷۱۶؁ء) مین مسٹر مانٹیگو قسطنطنیہ کے سفیر مقرر ہوگئے دولت عثمانیہ کے دار السلطنت کو روانہ ہوے اور لیڈی میری مانٹیگو نے بھی جن کی عمر اب ۲۶ برس کی تھی پیارے شوہر کے ساتھ استنبول کی راہ لی - جہان دونون میان بیوی کو دو سال تک رہنا پڑا -

قسطنطنیہ مین انگلستان کے بہت سے سفیر اس سے پہلے بھی آچکے ہونگے مگر مسٹر مانٹیگو نے محض اپنی بیوی کی قابلیت سے جو ناموری و شہرت حاصل کی اس سے پہلے کسی کو نہین نصیب ہوئی تھی - لیڈی میری یہان ترکی امرا کے خاندانون سے ملین اُنکے حالات دریافت کیے - اور جو کچھ واقعات معلوم ہوتے انھیں لکھ لکھ کے لندن مین اپنے دوستون کو بھیجا کرتین - یہ خطوط اسقدر دلچسپ تھے کہ لوگون نے شوق اور قدر سے جمع کیے - اور ہر طرف لوگون مین اُنکے پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا -

قیام قسطنطنیہ کے زمانے ہی مین لیڈی میری مانٹیگو کو پتہ لگا کہ یہان کے بعض گانوُن مین چیچک کے روکنے کے لیے بعض مائین اپنے بچون کے ٹیکہ لگایا کرتی ہین - اس نئے اور عجیب علاج کو اُنھون نے اُس گانوُن مین جاکے دریافت کیا - جو عورتین اُس کا طریقہ جانتی تھین اُن سے مل کے کیفیت معلوم کی - اُن لڑکون کو دیکھا جن کے ٹیکہ لگایا گیا تھا - خوب اچھی طرح آزما لینے کے بعد خود اپنے فرزند کے ٹیکہ لگایا - اور دیکھا کہ وہ چیچک سے بالکل محفوظ رہا - تب اُنھون نے آزمایش کے لیے اور بہت سے لڑکون کے ٹیکہ لگایا - اور پھر اُسے عام لوگون مین پھیلانے لگین - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی یورپ مین اُن کی کوشش سے ٹیکے کا رواج ہوگیا - اور لوگ اس حکمی علاج کی قدر کرنے لگے -

۱۱۴۷؁ محمدی (۱۷۱۸؁ء) مین لیڈی میری اپنے شوہر کے ساتھ انگلستان واپس آئین اور مقام ٹوئی کنھم مین بود و باش اختیار کی - اب یہان اُن سے انگریزی کے مشہور شاعر پوپ سے بہت راہ و رسم ہوگیا تھا - اور گو کہ وہ اپنے دلچسپی کے اوقات پوپ کی صحبت مین بسر کرتی تھین مگر یہان بھی اُنھین شب و روز ٹیکے کے رواج دینے کی فکر رہا کرتی تھی -

اسکے بعد خدا جانے کیا بات ہوئی کہ پوپ سے بگڑ گئی - اور پوپ نے باوجود ایک بلند خیال اور روشن دماغ شاعر ہونے کے جذبے مین آکے لیڈی میری کی ہجو مین چند شعر کہہ ڈالے جن مین اُن کے اخلاق پر حملہ کیا - اور چاہا کہ لیڈی میری کی مسلمہ ناموری - قابلیت - پاکیزگی خیال اور نیک نفسی کی شہرت کو خاک مین ملا دین - مگر چونکہ اخلاقی جرأت نہ تھی اور پوپ کے دل مین خود ہی چور تھا اس لیے اُن اشعار کو گمنام طور پر شایع کیا - اگر کسی نے پوچھا بھی کہ یہ آپ کے اشعار ہین تو انکار کر دیا لیکن ایسی باتین کہین چھپائے چھپتی ہین ؟ ہر جگہ شہرت ہوگئی کہ یہ شعر اصل مین پوپ صاحب کے ہین - مگر چونکہ بے اصل و حقیقت ہین اس لیے وہ اپنی طرف منسوب کرتے ڈرتے ہین - نتیجہ یہ ہوا کہ بجاے اسکے کہ لیڈی میری کے نام پر کسی قسم کا حرف آئے خود پوپ کو سخت بدنامی نصیب ہوئی - عام لوگون نے اُنکی اس حرکت کو ناپسند کیا اور اُلٹے اُنھین کو ذلیل و کمینہ سمجھنے لگے -

اب ۱۱۶۰؁ محمدی (۱۷۳۹؁ء) شروع ہوا - اور لیڈی میری کا سن ۴۹ سال کا تھا - طبیعت ناساز رہنے لگی - اور معلوم ہوا کہ انگلستان کی آب و ہوا موافق نہین ہے - تبدیل آب و ہوا کے لیے اطالیہ کا سفر کیا - وہان شہر وینس مین جاکے اقامت گزین ہوئین - اور صحبت برقرار رکھنے کے لیے اس طرح پاؤن توڑ کے بیٹھین کہ ۲۲ سال وہین گذر گئے - ۱۱۶۸؁ محمدی مین گئی تھین اور ۱۱۹۰؁ محمدی (۱۷۶۱؁ء) مین ۷۱ برس کی بوڑھی اور واجب التعظیم خاتون بن کے پھر انگلستان مین آئین - اس لیے کہ اُنکی صاحبزادی لیڈی بیوٹ نے تاکید سے بلایا تھا - مگر عمر پوری ہو چکی تھی - تندرستی نے جواب دے دیا - اور وطن مین آکے

شاید پورے ایک برس بھی نہ رہی ہوں گی کہ سنہ ۱۱۹۱ محمدی (سنہ ۱۷۶۲ء) میں دنیا
سے رخصت ہوگئیں۔ اور ناموری و نیکوکاری کے رجسٹر میں اپنا نام لکھوا کے
دوسرے عالم باقی میں جا پہنچیں۔

مگر دنیا میں اُن کی دو نہایت ہی قابل قدر یادگاریں ہمیشہ باقی رہیں گی
جن میں سے ایک بھی کسی کو حاصل ہو تو اُس کی ناموری و برکت کے زندہ
رکھنے کو کافی ہے۔ ایک تو چیچک کا ٹیکہ جس سے اب ساری دنیا نفع اُٹھا
رہی ہے۔ اور ہندوستان ہی نہیں دنیا کے ہر ایک میں شہروں اور گاؤں کے اندر
لیڈی میری کی یہ یادگار اپنی برکتوں سے نوع انسانی کو نفع پہونچا رہی ہے۔

اور دوسری یادگار اُن کے وہ خطوط ہیں جو اُنھوں نے قسطنطنیہ سے
اپنے احباب کو لکھے تھے۔ انگلستان کے لوگوں میں اُن کے مطالعہ کا شوق اس
قدر بڑھا کہ اُن کی وفات کے دوسرے ہی سال یعنی سنہ ۱۱۹۲ محمدی میں وہ تین
جلدوں میں مرتب و مدوّن ہو کے چھپے اور شائع ہوئے۔ چند روز بعد لوگوں کو
کچھ اور خطوط ملے اور چوتھی جلد بھی مرتب ہو کے شایع ہوگئی۔ ان خطوط کی
زبان ایسی دلکش اور شیرین تھی کہ بہت ہی پسند کیے گئے خصوصاً اسلیے کہ ترکوں کے
قومی خصائص معلوم ہونے کا یورپ میں جس قدر شوق تھا اُسی قدر حالات سے
لاعلمی تھی۔ لیڈی میری سے پہلے کسی نے ایسی تفصیل و تحقیق سے آل عثمان کے
حالات نہیں بتائے تھے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ترکوں کے حالات میں جو پہلی کتاب
انگلستان میں شایع ہوئی یہی تھی۔

لوگوں نے اس کتاب کے لیے اس کثرت سے شوق کے ہاتھ پھیلائے کہ
پہلا ایڈیشن چند ہی روز میں ختم ہوگیا۔ دوبارہ چھپی اور تھوڑے زمانے میں
فروخت ہوگئی۔ غرض برابر ایڈیشن پر ایڈیشن شایع ہوتے چلے جاتے تھے۔ یہاں
تک کہ سنہ ۱۲۳۲ محمدی (سنہ ۱۸۰۳ء) میں یعنی لیڈی میری کی وفات کے ۴۱ برس
بعد اُن کے صاحبزادے نے از سر نو درست اور مرتب کر کے اُن خطوط کی چاروں
جلدوں اور اپنی ماں کی دیگر قابل قدر تصانیف کا ایک نیا اعلیٰ درجے کا
ایڈیشن شایع کیا۔

لیڈی میری کے صاحبزادے اڈورڈ ورٹلی ماٹیگو کی نسبت کہتے ہیں کہ
دماغ بگڑا ہوا تھا۔ امارت اور گھر کی فارغ البالی پسند نہ تھی۔ جب دل میں
آتی گھر سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ اور کسی ایسے کام کو اختیار کر لیتے جو اُن کی
حالت و حیثیت سے بہت ہی گرا ہوا ہوتا۔ دوسرا کمال اُن میں یہ تھا کہ سچ سے
نفرت تھی۔ غلط اور بے بنیاد واقعات کو اس طرح شوکتِ الفاظ سے بیان
کرتے اور ایسے تعلقے باندھ دیتے کہ سننے والے کو سچ کا یقین آ جاتا۔ اس
میں اس قدر ملکہ بڑھا ہوا تھا کہ فی البدیہہ قصے پر قصے دل سے بٹ کے بیان
کرتے چلے جاتے اور کیا مجال کہ سلسلہ ٹوٹ جائے۔ مگر بھاگنا قیامت تھا۔

پہلی بار بھاگے تو گھر والوں کو ملنے سے یاس ہوگئی۔ چند روز بعد پتہ
ملا کہ آپ ایک چمنی سوئپ کے نوکر ہیں۔ انگلستان کے ہر مکان بلکہ ہر کمرے
میں آتش خانہ بنا ہوتا ہے۔ اُس میں سے دھواں نکلنے کے لیے جو نل دیوار کے
اندر ہی اندر اوپر تک چلا جاتا ہے اُسے چمنی کہتے ہیں۔ اس چمنی میں دو چار
مہینے میں اتنا کاجل جمع ہو جاتا ہے کہ نہ نکالا جائے تو راستہ بند ہو جائے۔ اس
لیے وہاں بہت سے لوگ چمنی سوئپری یعنی چمنیوں میں سے کاجل جھاڑنے کا کام
کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے کپڑوں میں چونکہ ہمیشہ کاجل بھرا رہتا ہے اس لیے
سب سے زیادہ میلے کچیلے رہتے ہیں۔ اور انگلستان میں جو شخص جتنا زیادہ میلا ہو
اُسی قدر زیادہ ذلیل و حقیر تصور کیا جاتا ہے۔ غرض چمنی سوئپروں سے زیادہ ذلیل
اُس سرزمین میں کوئی نہیں ہوتا۔ مگر آپ کو جوشِ خاکساری میں یہی پیشہ سب سے
زیادہ پسند آیا۔

لوگوں کو معلوم ہوا تو سمجھا بجھا کے گھر میں لے آئے۔ لیکن چند روز بعد پھر رفو چکر
ہو گئے۔ ابھی خبر لگی کہ ایک مچھلی والے کے شاگرد ہیں۔ اور اُس کے ساتھ کشتی میں
بیٹھے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ لوگ گھیر گھار کے پھر لائے۔ مگر تھوڑے زمانہ کے بعد
پھر غائب ہو گئے۔ ابکی شاید ماں کے مطبوعہ خطوط کا اثر تھا کہ قسطنطنیہ میں آ کے
ترکوں کی طرح رہنے لگے۔ اُنھیں کی وضع اختیار کر لی۔ اُنھیں کے سے کپڑے
پہننا شروع کیے۔ اُنھیں کی سی ٹوپی اور بھاری دستار سر پر تھی۔ اور چونکہ اُنگی

پوری پوری معاشرت اختیار کرلی تھی اس لیے ہمیں امید ہے کہ تثلیث سے توبہ کر کے مسلمان بھی ہو گئے ہوں گے۔ لہذا ہم اُن کے حق میں دعائے مغفرت کر کے سلسلۂ بیان کو ختم کرتے ہیں۔

عربی رسمِ خط

۶ نومبر سنہ ۱۹۱۲ء کے ہمدرد میں بیت المقدس سے خواجہ کمال الدین صاحب کا ایک خط شایع ہوا ہے جس میں جناب موصوف خط نسخ کی تاریخ کے متعلق مسلمانوں کی تحقیق معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس مسئلے پر کسی حد تک غور کیا ہے اور جابجا کچھ لکھا بھی ہے۔ اگرچہ اس وقت میرے پاس کافی کتبخانہ نہیں موجود ہے۔ تاہم جس نتیجے کو میں پہونچا ہوں اُسے بکمال ادب خواجہ صاحب کی خدمت میں عرض کیے دیتا ہوں۔

ہمارے پیغمبر علیہ السلام ہی اُمّی نہ تھے بلکہ ساری قوم عرب اُمّی تھی جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے "بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا" قدیم الایام میں ارض یمن میں ایک خط مروج تھا جو جدا جدا حرفوں میں لکھا جاتا۔ اور سوائے اُمرا و شرفائے قوم کے کسی عامی کو نہ بتایا جاتا۔ اس علمی بخل کا یہ نتیجہ ہوا کہ جب نیّرِ اسلام چمکا ہے اُس خط کا جاننے والا دنیا میں کوئی نہ تھا۔

ولادت سرورِ کائنات علیہ السلام کے قریب ہی ابو سفیان کے والد حرب بن اُمیہ ارض حیرہ سے ایک خط سیکھ آئے اور دو چار دوستوں اور عزیزوں کو بھی سکھا دیا۔ خود حرب کا بیان تھا کہ میں نے اس خط کو حیرہ کے ایک شخص اسلم بن سدرہ سے سیکھا۔ اور وہ علاقۂ انبار کے ایک شخص مرامر بن مرہ کا شاگرد تھا اور چونکہ مرامر کا کوئی اُستاد نہیں معلوم تھا اس لیے قریش میں خیال پھیل گیا کہ اس خط کا پہلا موجد مرامر ہے۔ اور ارضِ انبار اُس کا مولد ہے (ملاحظہ ہو ابن خلکان۔ حالات علی بن ہلال المعروف بہ ابن بوّاب کاتب)

غرض یہی عربی کی پہلی تحریر اور ہمارے موجودہ خطِ نسخ کا نقش اولین ہے۔ اسی میں قرآن مجید لکھا گیا۔ اسی میں آن حضرت صلعم کے خطوط و معاہدات لکھے گئے

اور اسی میں صحابہ مراسلت کرتے تھے مگر اپنی ابتدائی حالت میں یہ خط اس قدر ناقص تھا کہ جس قدر رواج پاتا تھا اُسی قدر زیادہ اُس میں اصلاحوں اور ترمیموں کی ضرورت محسوس ہوتی جاتی تھی۔ اور یقیناً بہت سی اصلاحیں ہوئی ہوں گی جن کی ہمیں خبر نہیں ہے۔

اس عہد کے نمونے ہمارے ہاتھ میں بہت ہی کم ہیں جن سے کچھ اندازہ کیا جائے۔ آنحضرت نے جو خطوط لکھوا کے بھیجے تھے اُن میں سے دو خط اہل یورپ نے خدا جانے کیونکر اور کہاں سے برآمد کر کے پیش کیے ہیں اور دعوے کیا جاتا ہے کہ وہ اصلی خط ہیں۔ ان دونوں کے فوٹو میں نے دیکھے ہیں۔ ایک مسیلمۂ کذاب کے نام ہے سنہ ۱۹۰۶ء میں لندن کے پکچر میگزین نام ایک رسالے میں چھپا تھا۔ میں نے اُس کا ورق نکال کے اُس کی پلیٹ بنوالی ہے جو میرے پاس احتیاط سے رکھی ہے گو ابھی تک چھپوانے کی نوبت نہیں آئی۔ دوسرا خط فرمان روائے مصر مقوقس کے نام ہے جس کا فوٹو ہیروز آف دی نیشن سیریز کی کتاب "محمد" مصنفۂ ڈی۔ اس۔ مارگولیتھ میں مصر کے رسالۂ الہلال سے لے کے درج کیا گیا ہے۔

ان دونوں خطوں کی تحریر ایک ہی زمانے۔ ایک ہی وضع۔ اور ایک ہی شان کی ہے۔ اور دونوں کے نیچے آپ کی مُہر ہے۔ خطوط کی عبارت کے الفاظ بھی وہی ہیں جو احادیث میں صحیح روایات سے مروی ہیں۔ بہرحال ان کو دیکھ کے یقین ہوتا ہے کہ اصلی تحریریں ہیں۔ اور یہی میرا خیال ہے۔ چنانچہ میں ان خطوں کے فوٹوؤں کو تمام اگلے تبرکات سے زیادہ واجب التعظیم اور حرز جان بنانے کے قابل خیال کرتا ہوں۔ اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ہم ان مبارک نامہائے رسالت کا جن پر آپ کی مُہر مبارک ثبت ہے اور اُنکی تاریخ کا پتہ لگانے کہ کیونکر محفوظ رہے۔ کہاں سے کہاں پہونچے۔ کس سے کس کو ملے۔ اور آخر میں کیونکر اہل یورپ کے ہاتھ آئے؟

ان خطوط کے بعد کی تحریر کا نمونہ حضرت عثمان ذی النورین رضی کے عہد کے قرآن پاک ہو سکتے ہیں۔ جن کا کوئی نسخہ اس وقت تک کسی ہندوستانی مسلمان کی نظر

نہین گذرا۔ کہا جاتا ہے کہ اُن مین کا ایک قرآن قسطنطنیہ مین موجود ہے۔ اگر خواجہ صاحب کسی تدبیر سے اُس کی زیارت سے شرفیاب ہو کے اُسکے کسی صفحے کا فوٹو حاصل کرین اور اُسے شایع کردین تو مسلمانون پر بڑا احسان کرین۔

مذکورہ بالا دونون خطوط رسالت کی تحریر کی شان یہ ہے کہ نہ نقطے ہین نہ اعراب ہین نہ علامات اوقاف ہین۔ الف سیدھی لکیر نہین بلکہ نیچے کا سرا پیچھے مڑا ہوا ہے جس سے اُسکی قطع "ا" کی سی ہے۔ عظیم کا لفظ یون لکھا ہے "عطىم" القبط کی صورت یہ ہے "الهىط"۔ سلام کی وضع تحریر یہ ہے "سلم" الھدیٰ کی صورت یہ ہے "الهد"۔ من کی صورت "م" اور بعضنا بعضاً کو "ىعصىا ىعصا"۔ معلوم ہوتا ہے کہ نصب کے ساتھ تنوین مین ایک الف جو موجودہ رسم خط مین بڑھا دیا جاتا ہے یہ اُسی زمانے کا ہے۔ اشہدوا کی صورت "اسهدوا" ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جمع کے آخر کا الف بھی اُسی زمانے کا ہے۔ اس کی پابندی نہین ہے کہ لفظ سطر مین ختم ہی ہو جائے۔ "ورسولہ" مین سے "ور" ایک سطر کے آخر مین ہے اور "سولہ" دوسری سطر کے شروع مین۔ "تولوا" مین سے "ت" ایک سطر مین ہے اور "ولوا" دوسری سطر مین "مسلمون" مین سے "مس" ایک سطر کے آخر مین ہے اور "لمون" دوسری سطر کے شروع مین۔

خلفاے راشدین کے عہد مین اس خط مین کسی نمایان تغیر کا پتہ نہین چلتا۔ سب سے پہلے اس تحریر کے نقصان پر ابوالاسود دوئلی کی نظر پڑی جن کا حال مین نے مئی اور جون سنہ ۱۹۱۳ء کے دلگداز مین لکھا ہے۔ انھین نے رسم خط کی اصلاح کی اور انھین نے ابتدائی قواعد نحو عرب کو بھی مدون کیا۔

زیاد نے حکومت بصرہ کے زمانے مین اُن سے خواہش کی تھی کہ قرآن کے رسم خط کی اصلاح کیجیے مگر اُنھون نے غالباً قرآن کے متعلق سنتِ قدیم مین دخل دینا بدعت خیال کر کے انکار کر دیا۔ لیکن ایک دن ایک قاری قرآن کو إِنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ مین رَسُولُهُ کو رَسُولِهِ پڑھتے سُن کے ایسے گھبرائے کہ زیاد کے پاس دوڑے گئے۔ اور کہا "اب مین آپ

کی خواہش پوری کرنے کو موجود ہون"۔ پھر اُس سے ایک کاتب لیا۔ اور اُسے پاس بٹھا کے ہدایت کی کہ مین قرآن کو لکھواتا ہون۔ جس حرف کے ادا کرنے مین اپنا منہ کھول دیا کرون اُس کے اوپر تم ایک نقطہ لگا دیا کرو۔ جس حرف مین منہ کو گول کر کے ادا کیا کرون تم اُس کے آگے ایک نقطہ لگا دیا کرو جس حرف کے ادا کرنے مین آواز کا رخ نیچے کی طرف ہو تم اُسکے نیچے نقطہ دیا کرو۔ اس طرح قرآن مین پہلے پہل یہ اعراب لگائے گئے۔ جن کی صورت ابتدائی ایجاد مین بجاے ترچھی لکیرون کے نقطون کی سی تھی۔ اور پیش بجاے حرف کے اوپر کے سامنے لگایا جاتا تھا۔ آج کل جو نقطے ب ت اور ث مین یا ج۔ ح۔ خ مین امتیاز دیا کرتے ہین اُن کا اُسوقت تک مطلقاً پتہ نہ تھا۔ اور نہ شاید اُن کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

ابوالاسود دوئلی نے سنہ ۶۹ھ مین انتقال کیا۔ اُنکے بعد کہتے ہین کہ میمون بن اقرن نے پھر عنبسہ بن معدان فہری نے پھر عبداللہ بن ابی اسحٰق حضرمی نے۔ پھر ابو عمرو بن علاء المتوفی سنہ ۱۵۴ھ نے اس خط مین اور اصلاحین کین۔ مگر ہم نہین جانتے کہ وہ کیا اصلاحین تھین۔ یہان تک کہ خلیل بن احمد ازدی المتوفی سنہ ۱۷۰ھ اور علی بن حمزہ کسائی المتوفی سنہ ۱۸۲ھ کا زمانہ آیا جبکہ کوفے اور بصرے مین نحو صرف اور علم زبان کا شباب تھا۔ کہتے ہین کہ خلیل نے اس خط کی طرف بہت توجہ کی اور اس درجے کو پہونچا دیا کہ کسائی نے جو ہارون رشید کا اُستاد اور علمی ترقیون کا بیحد شایق تھا خط عربی مین ایک نئی شان پیدا کی جسکو اہل کوفہ نے بے انتہا پسند کیا۔ اور وہی خط خط کوفی کے نام سے مشہور ہوا (ملاحظہ ہون کتاب الفہرس ابن الندیم۔ ابن خلکان حالات ابن مقلہ کاتب۔ و ابن البواب کاتب۔ اور آغانی جلد ۱۱ صفحہ ۱۰۶ حالات ابوالاسود دوئلی) اس کو مین نہ مانون گا کہ کسائی نے یک بیک پُرانے خط کو بدل کے خط کوفی کر دیا۔ در اصل مسلسل تغیرون اور ترمیمون نے رفتہ رفتہ خود ہی اس خط کی بنیاد ڈالی دی تھی۔ کسائی نے قواعد نقاشی و خوشنویسی کو کام مین لاکے تو اس خط کی ایک خاص شان پیدا کر دی۔ جسے لوگون نے عموماً پسند کیا اور اُسی

اُسی کی پیروی کرنے لگے۔

تاہم اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ خط کوفی کی ایجاد ۲۰۰ھ کے قریب
ہوئی ہے۔ اس سے پہلے جو خط مروج تھا کوفی نہ تھا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک
کوفے کو کوئی علمی حیثیت ہی نہیں حاصل ہوئی تھی۔ حضرت علیؓ نے کوفے کی سکونت
اختیار کی۔ اور اسی وجہ سے اکثر عوام میں مشہور ہے کہ حضرت علیؓ کے ہاتھ کے لکھے
ہوئے قرآن خط کوفی میں تھے۔ مگر انھیں اس کی خبر نہیں کہ ان دنوں کوفہ تو
بیشک تھا اور کوفہ میں حضرت علیؓ بھی تھے۔ مگر خط کوفی نہ تھا جس کا کاتب
حضرت علیؓ کو فرض کر لیا گیا ہے۔ خط کوفی کا دَور دوسری صدی ہجری کے
آخر سے شروع ہوا ہے۔ جبکہ ہارون رشید کا زمانہ تھا۔

مامون کے زمانے کی ایک فرد حساب کا فوٹو میں نے مدت ہوئی مولانا
شبلی کے پاس دیکھا تھا۔ جس کی اصل یورپ کے کسی کتب خانے میں موجود ہے
گو اسوقت پوری تفصیل سے اُسکے حرفوں کی شکلیں یاد نہیں ہیں۔ مگر اجمالی نظر
سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نہایت ہی پختہ اور پاکیزہ خط ہے۔ اور خط کوفی کی قسم
ہے۔

اب مجھے یہ بتانا ہے کہ خط کوفی میں اور پُرانے خطوں میں کیا فرق تھا
میں نے خط کوفی کا کوئی مکمل قرآن نہیں دیکھا ہے۔ لیکن ہیروز آف دی نیشن
سیریز کی کتاب "محمدؐ" مصنفہ ڈی۔ ایس۔ مارگولیوتھ میں خط کوفی کے ایک قرآن
کے ایک صفحے کا فوٹو موجود ہے۔ اصل نسخہ بوڈلین لائبریری کا ہے اور معلوم
نہیں کہ کس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں الف کی قطع " ا " د کی قطع
ن کی قطع " ل " ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خط خوبصورت اور زیادہ واضح
روشن ہو گیا ہے مگر اُسی پُرانے خط سے ملتا ہوا ہے۔ صرف پختگی اور ایک
مناسبت و ہم وضعی پیدا ہو گئی ہے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ اس کوفی خط کے قرآن
میں اعراب کا کہیں پتہ نہیں۔ نہ نقطے ہی ہیں اور نہ ترچھی لکیریں ہیں۔ معلوم
ہوتا ہے کہ ابوالاسود کی ایجاد کا عام طور پر رواج نہیں ہوا تھا خاص ہی خاص
نسخہ ہائے قرآن میں اُن کے رسم خط کی پابندی کی جاتی ہوگی مگر عام کا

اُن کا لحاظ نہ کرتے تھے۔

اس خط کوفی میں سب سے بڑی مفید ترقی یہ ہوئی ہے کہ موجودہ نقطوں کی
ایجاد ہو گئی۔ جن سے اُن تمام مختلف الصوت حرفوں میں امتیاز کر لیا جا سکتا ہے جو ہمشکل
ہیں۔ مگر خط کوفی کے نقطے ہمارے موجودہ خط نسخ کے نقطے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کی جگہ
چھوٹی اور باریک ترچھی لکیریں زیر زبر کی سی اختیار کی گئی ہیں۔ مثلاً یا ایھا المزمل
قم اللیل کو "یا ایھا ا لمزمل قم الیل" کی وضع میں لکھا ہے۔ اس سے
بخوبی یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب ب ت ث اور اسی طرح کے دیگر حروف میں امتیاز
کی ضرورت محسوس ہوئی تو بجائے نقطوں کے ترچھی باریک لکیریں اختیار کی گئیں۔
اور نقطوں سے جو ابوالاسود نے ابتداءً اعراب و حرکات بنانے کا کام لیا تھا
وہ خاص خاص قرآنوں میں تھے۔ عام تحریروں اور کتابوں میں انکی ضرورت
نہیں سمجھی جاتی تھی۔

اب اس وقت سے کچھ کم ڈیڑھ سو برس تک خط کوفی کا زمانہ رہا۔ مگر
زمانہ جوں جوں گذرتا جاتا تھا اس خط میں بھی کچھ نہ کچھ تغیر اور ردوبدل کرتا جاتا تھا۔
خط کوفی جیسا کہ ہمیں نظر آتا ہے زود نویسی کے لیے موزوں نہ تھا۔ چنانچہ ۲۷۲ھ
میں زمانے نے ابو علی محمد بن علی بن حسین کاتب کو جو "ابن مقلہ" کے لقب سے
مشہور ہے پیدا کیا۔ یہ بہت بڑا شخص تھا۔ اور اگرچہ اس کی زندگی اسقدر پُر آشوب
تھی کہ ترقی کی تو خلافت بغداد کا وزیر اعظم بن گیا۔ اور اقبال نے ساتھ چھوڑا
تو ہاتھ کاٹا گیا۔ زبان کاٹی گئی۔ قید ہوا۔ اور خدا جانے کیسی کیسی مصیبتیں جھیل
کے ۳۲۸ھ میں چھپن برس کی عمر میں قید خانے ہی کے اندر مرا۔ لیکن ناقدردان
دشمن اُس کی جان لے سکتے تھے اُس کے کمالات کا مٹانا غیر ممکن تھا۔

دیگر کمالات کے علاوہ ابن مقلہ خوشنویسی اور خط نسخ کی اصلاح میں
بھی کمال رکھتا تھا۔ چنانچہ اُس نے مروجہ خط کوفی کو تقویم پارینہ کر کے موجودہ
خط نسخ ایجاد کیا۔ (ملاحظہ ہو ابن خلکان حالات ابن مقلہ کاتب) اس نے خط
میں اعراب و حرکات کے اظہار کے واسطے ابوالاسود دوئلی کے نقطوں کو موقوف
کر کے زیر۔ زبر کے لیے حرف کے اوپر اور نیچے ترچھی لکیریں اور پیش۔ جزم۔ تشدید

دو زبر اور دو زیر کی موجودہ شکلیں اختیار کی گئیں۔ متشابہ حروف کے باہمی ا
کے لیے خط کوفی کی باریک ترچھی لکیروں کو چھوڑ کے نقطے قائم کیے گئے۔ اور
حرفوں کی صورتوں میں مقبولِ عام خوشنمائی، سادگی اور آسانی پیدا ہو
خلاصہ یہ کہ ہمارا موجودہ خط نسخ ابن مقلہ کا ایجاد ہے۔ ابن مقلہ کے اس خط
یہ شان اس قدر پسندیدہ ثابت ہوئی کہ ساری کتابت اسی میں ہونے لگی
لکایک خط کوفی ایسا مٹا کہ آج اُس کا لکھنا درکنار دنیائے اسلام میں ا
کوئی پڑھنے والا بھی نہیں ہے۔

ابن مقلہ کے کچھ کم ایک صدی بعد ابن بوّاب کاتب پیدا ہوا جس
اپنی مشہور عام خوشنویسی سے خط نسخ کو انتہائے کمال کے درجے کو پہونچا دیا
بوّاب کا نام ابوالحسن علی بن ہلال تھا۔ مگر چونکہ ایک دربان کا بیٹا تھا اس
"ابن البوّاب" کے لقب سے مشہور ہوا۔ علامہ خلکان اُس کی نسبت لکھے
"اگلوں پچھلوں میں سے کوئی شخص اُس کے مثل کتابت نہیں کر سکا۔ خط
سے بدل کے موجودہ خط کو ایجاد تو ابوعلی بن مقلہ نے کیا تھا۔ لیکن ابن بوّ
نے اس کی شان کتابت شایستہ، مہذب اور خوشنما بنا دی۔ اور تمام لوگوں
اتفاق ہے کہ اس بارۂ خاص میں وہ منفرد اور بے نظیر تھا۔" ابن بوّاب
سنہ ۴۱۳ھ یا سنہ ۴۲۳ھ میں انتقال کیا۔ اور خط نسخ میں ایسی شان پیدا کر کے چھو
جس کی لوگ آج تک پیروی کر رہے ہیں۔

اس مسئلے پر اس قدر تحقیق کرنے کے بعد اب میں خواجہ صاحب
سوالات کا جواب دیتا ہوں۔

(۱) ۹ نومبر کے زمیندار میں ایک واقف کار صاحب نے بتا دیا ہے کہ مو
خدا بخش خاں کے کتب خانہ بانکی پور میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے ہاتھ
لکھے ہوئے قرآن مجید موجود ہیں۔ مجھے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہاں
حضرت عثمان کے ہاتھ کا تو کوئی قرآن نہیں ہے ہاں حضرت علی کے ہاتھ کے
پارے بتائے جاتے ہیں۔ مگر جب تک کوئی خط عرب کی تاریخ جاننے وا
اُن پر تنقیدی نظر ڈال کے نہ بتائے اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس

قرآن مل جائے تو ہم کو اس مسئلہ میں صحیح نتیجے تک پہونچنے میں بہت کامیابی
سکتی ہے۔

(۲) آپ کی تحقیق کے اس حصے سے مجھے اتفاق نہیں کہ سیدنا عثمانؓ کا
مصحف خط کوفی میں تھا۔ اس لیے کہ خط کوفی اُس زمانے سے تقریباً ڈیڑھ صدی
ایجاد ہوا ہے۔ لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ اُس میں حرکات و سکنات نہ تھے۔

(۳) اس دفعہ کے مضمون (الف) کے متعلق عرض ہے کہ خط نسخ کی تاریخ
نے اوپر تفصیل سے بتا دی ہے جس سے تمام استفسارات کا جواب مل سکتا ہے۔
اتنا اور عرض کرتا ہے کہ میں نے کبھی کوئی قرآن خط نسخ اور خط کوفی میں ملا
ہیں دیکھا۔ لیکن ابن مقلہ کے ظہور سے چند روز پیشتر جو قرآن لکھے گئے ہونگے
وہ یقیناً ویسے ہی خط میں ہوں گے جن کی شان خط کوفی اور موجودہ نسخ سے
ملتی جلتی ہوگی۔

ضمن (ب) کے متعلق عرض ہے کہ نقطوں کا آغاز خط کوفی میں باریک
خطوط کی وضع میں ہوا جو خطوط ابن مقلہ کے زمانے میں نقطے بن گئے۔ ان
پیشتر بادی النظر میں حروف منقوط و غیر منقوط یا ایک اور دو اور تین نقطوں
والے حرفوں میں مابہ الامتیاز کوئی علامت نہ تھی۔ اور صرف قیاس اور معانی
کی مناسبت سے اُن کا امتیاز کیا جاتا تھا جس طرح کہ اُردو میں ہم حرکات کا
امتیاز بغیر کسی علامت کے کر لیا کرتے ہیں۔ "ب" اور "ت" کا امتیاز خط کوفی
سے پہلے کے پُرانے خط میں نہ مفرد میں تھا نہ مرکب میں۔ مگر کوفی میں جیسا کہ میں
بیان کر آیا ہوں نیچے اوپر باریک خطوط کا امتیاز پیدا ہو گیا تھا "ت" کی شکل
"تـ" اور "ب" کی "بـ" تھی۔

ضمن (ج) بعض کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ نقطوں سے پہلے حرکات
کی علامات کا استعمال شروع ہوا۔ اور وہ بذریعۂ نقطہ تھا۔ اور نقطے اوّلاً حرکات
کی علامات کے لیے استعمال ہوئے۔ موجد حرکات ابوالاسود دوئلی نے زیر۔ زبر۔ پیش
کے اظہار کے لیے اپنے کاتب کو اوپر نیچے اور سامنے نقطہ ہی لگانے کی ہدایت
کی۔ جو باعتبار روایت ہر طرح قابل تسلیم ہے۔ امتیاز حروف کے لیے

نقطوں سے اور حرکات کے سمجھنے کے لیے ترچھے خطوں وغیرہ سے کام لینے کا
آغاز ابن مقلہ کے زمانے سے ثابت ہوتا ہے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ اس
پیشتر ہی کاتبوں کا رجحان اس ترمیم وتہذیب کی طرف ہونے لگا ہوگا۔ ابن مقلہ
نے اُسے اختیار کرکے اس قدر رواج دیدیا کہ سب نے یہی طرز تحریر اختیار کرلیا
ضمن (د) بے شک قدیم کتابت میں "ذلٰث" اور جنّٰت" کے ایسے
ایسے لفظوں میں الف نہیں لکھا جاتا تھا۔ اور نہ اُس کے امتیاز کے لیے کوئی
علامت تھی۔ مذکورہ صحفِ رسالت میں الفاظ "رحمان" اور "یا اہل" بغیر
کے صرف کھڑے زبر سے یعنی "رحمٰن" اور "یا ھل" کی صورت میں لکھے گئے
اُن دونوں "حرث" اور "حارث" کے ناموں میں امتیاز دشوار تھا۔ اس لیے کہ دو
نام "حرث" کی صورت میں لکھے جاتے تھے۔ اب بھی اکثر حارث کا لفظ "حرث" لکھا
جاتا ہے۔

اسی طرح دیگر سوالات کا جواب بھی اس مضمون کے ابتدائی مباحث سے
حاصل کرلیا جاسکتا ہے۔

رقص

یہ دلچسپ و دلفریب فن بھی انسان کے اُن فطری جذبات میں سے
جو بلا ارادہ اور بغیر کسی کوشش کے خود ہی ایجاد ہوگئے۔ ناچ کی نسبت نہ کچھ
یہ معلوم ہے کہ کیوں، کب، اور کیونکر ایجاد ہوا۔ اور نہ اُس کے ابتدائی ظہور
متعلق کوئی روایت یا قصہ بنی آدم میں مشہور ہے۔ مگر باوجود اس کے انکار نہیں
کیا جاسکتا کہ دنیا کی اگلی پچھلی تمام اعلیٰ وادنیٰ شائستہ اور وحشی
وحشی قوموں میں ناچ کسی نہ کسی شان سے ضرور موجود ہے۔ اور اسکی وجہ یہ
ناچ ایک فطری چیز ہے۔ اسکی ابتدا اس سے ہے کہ انسان جسمانی اوضاع وحرکات کو ا
وجذبات کے موافق بنائے۔ اکثر لوگ بات کرنے میں "موشن" یعنی جسمانی حرکات کو زیادہ
دیا کرتے ہیں اسکی نسبت سمجھنا چاہیے کہ ان میں ناچ کا مادہ فطرۃً زیادہ رکھا گیا ہے
اسکے بعد جب موسیقی میں آواز کے نشیب و فراز کی ترتیب نے ایک دلکش

پیدا کی تو رقص نے اُس میں اور لطف پیدا کردیا۔ اور اسی کی مناسبت سے
رقص نے چلتے چل ایک باقاعدہ فن کی حیثیت حاصل کرلی۔
تاریخ عالم میں سب سے پُرانی تاریخ بنی اسرائیل کی ہے۔ اور انھیں کے معاصر
بلکہ اُن سے بھی ترقی میں سبقت رکھنے والے مصری اور بابلی ہیں۔ ان تینوں
پرانی متمدن قوموں میں ناچنا عبادات میں داخل تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ رقص کو
عبادت سے خاص علاقہ ہے۔ عبادت کرتے وقت انسان اپنے معبود کے سامنے
یا تو ایسے حرکات کرتا ہے جو اظہار عبودیت کے ہیں۔ یا صرف چہرے ہی کو اظہارِ
خشوع وخضوع کے لیے ملتجیانہ اور عاجزانہ بناتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں
اصولاً رقص میں داخل ہیں۔

اہل بابل اور قبطی دونوں عبادت میں ناچتے تھے۔ بنی اسرائیل کی عبادت
میں ناچنے کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ توراۃ میں ہے "انھیں اُس (خدا) کے
نام کی حمد کرنے اور ناچنے دو" یہ بھی لکھا ہے کہ "داؤد علیہ السلام خدا کے سامنے
ناچے"۔ اسی طرح قدیم الایام ہی میں محفل عیش وطرب کا ناچنا بھی تینوں
مذکورہ قدیم قوموں میں موجود تھا۔ اسیریا ومصر کی صحبت عیش کا ناچ اُنکے
منہدم محلوں کے در و دیوار کے نقش ونگار سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہود میں اسکا
ثبوت اِس قصے سے بخوبی مل سکتا ہے کہ ارض جلیل کے یہودی بادشاہ ہیرودنطی
پاس کے سامنے ہیرودیا نام اُسکے خاندان کی ایک حسین لڑکی ناچی۔ ناچ کے
اُسے رجھایا اور اپنا فریفتہ بنایا۔ اور جب اُس نے بے اختیار ہوکے کہا "مانگ
کیا مانگتی ہے؟" تو اُس سنگدل حسینہ نے بجائے زر وجواہر یا کسی اور چیز کے
حضرت عیسیٰؑ کو بپتسمہ دینے والے یوحنّا کا سر مانگا۔ اور لے کے دم لیا۔

یونانیوں نے بھی قدیم الایام میں ناچنے کو ایک ایسا فن قرار دیا جس کے
ذریعے سے اظہار جذبات میں قوت آجائے۔ ہومر شاعر کے بیان سے معلوم
ہوتا ہے کہ تقریبوں اور تکلف کی صحبتوں میں ناچ ہوا کرتا تھا۔ اور ارسطاطالیس
نے رقص کو فن شعر میں شامل کردیا ہے۔ یونان میں اہل اثینہ کے مقابل اسپارٹا
والے زیادہ خشک مزاج اور دنیوی عیش وطرب سے متنفر تھے مگر ناچنے کے

فن کو اس قدر ضروری خیال کرتے تھے کہ اپنے بچوں کو پانچ ہی برس کی عمر سے رقص کی تعلیم پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔ لوگ ان بچوں کو لے کے نکلتے۔ اور وہ مجمعوں میں گا گا کے ناچتے۔ اہل اسپارٹا میں "فرنک رقص" کے نام سے ایک فوجی ناچ مروج تھا۔ اُن کے نوجوان اُس رقص میں کمال دکھاتے اور معلوم ہوتا کہ قاعدے کے طریقے سے ایک فرضی جنگ ہو رہی ہے۔

قدما میں تین طرح کے ناچ تھے۔ اول فوجی ناچ جس میں سپہگری کی مشق کرنا اور اپنے آپ کو ایک اعلیٰ درجہ کا بہادر سپاہی بنانا مقصود ہوتا۔ اور نیز یہ غرض ہوتی کہ جسم خوب تیار ہو سڈول اور پھرتیلا ہو جائے اور اُس میں طاقت آئے۔ یہ ناچ دراصل ایک قسم کی ورزش تھی۔ دوسرا معاشرتی ناچ۔ یہ محض دلچسپی اور تفریح کے لیے اور قومی تقریبوں میں دلبستگی پیدا کرنے کے لیے ہوتا۔ تیسرا ایک اور ناچ اِن دونوں کے بین بین ہوتا تھا جو گناہ کا کفارہ ادا کرنے اور چڑھاوا چڑھاتے کے وقت عبادت کی حیثیت سے عمل میں آتا۔

قدیم مسیحیوں کے رقص کا اگرچہ انجیل میں کہیں تذکرہ نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اپنے مذہبی مجمعوں میں وہ لوگ بھی ناچا کرتے تھے۔ اسلام سے پیشتر جاہلیت عرب میں بھی ناچ قبائل عرب میں موجود تھا۔ خصوصاً مشرکین عرب اپنے بتوں کے سامنے ناچا کرتے تھے۔ اسلام نے بت پرستی کے ساتھ بت پرستوں کے طریقۂ عبادت کو بھی مٹا دیا۔ اگرچہ رقص کی حرمت و ممانعت کے بارے میں کوئی نص قطعی نہیں موجود ہے۔ مگر اسلامی تہذیب نے موسیقی کے ساتھ اُسے بھی ترک کرا دیا۔ تاہم جس طرح نیک نفسی و پاکبازی کا گانا عورتوں میں باقی تھا جیسا کہ متعدد احادیث سے ظاہر ہوتا ہے اُسی طرح وہ ناچنا بھی ترک نہیں ہوا تھا جس میں شرک کا شائبہ نہ تھا۔ چنانچہ حبشیوں کا رقص حضرت سرور کائنات علیہ السلام نے خود بھی دیکھا اور اپنی محبوبہ جناب عائشہؓ صدیقہ کو بھی دکھایا۔ ایک قسم کا فوجی ناچ عربوں میں آج تک موجود ہے۔ جب حملہ کے لیے وہ اپنا غول باندھ کے چلتے ہیں تو گاتے بجاتے ناچتے کودتے اور خوش فعلیاں کرتے ہوئے جاتے ہیں۔

لیکن اسلامی تہذیب کا تمام ممالک مشرقی پر یہ اثر پڑا کہ رقص و سرود کے فنون علی العموم ممنوع و مکروہ اور غیر مشروع سمجھے جانے لگے۔ اور جو لوگ ان فنون میں ترقی کرتے ہیں چاہے کیسے ہی اعلیٰ کمال کا درجہ حاصل کر لیں سوسائٹی میں اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔ اور ذلیل اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

مصر میں ناچنے گانے والوں کا ایک خاص گروہ موجود ہے جن کی عورتیں حسین و بڑی چالاک ہونے کے ساتھ نہایت بیباکی سے سڑکوں پر ناچتی پھرتی ہیں۔ اور اپنی نسل کو برمکی خاندان وزارت کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ دیگر مشرقی ممالک اسلام میں نوعمر لڑکے ناچ کی تعلیم پاتے ہیں۔ اور انھیں کے متناسب و موزوں حرکات سے نوجوانوں کی صحبتوں میں گرمجوشی پیدا ہوتی ہے۔

مگر ہندوستان میں قدیم الایام ہی میں موسیقی کا فن نہایت ہی کمال کے درجے کو پہونچ کے مدوّن و باقاعدہ بن گیا تھا۔ ہندوؤں میں ناچنا افضل عبادت ہے۔ جس طرح فی الحال جنوبی ہند کے مندروں کے متعلق بکثرت ایسی عورتیں ہوتی ہیں جو دیوتا کی مورت کے سامنے روز بلاناغہ جا کے ناچتی ہیں اسی طرح کی عورتیں ہزار بارہ سو برس پیشتر شمالی ہند کے بڑے بڑے مندروں میں بھی ہوا کرتی تھیں۔ قدیم سیاحان عرب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتان کے سب سے بڑے مشہور و ممتاز مندر میں ہزارہا عورتیں تھیں جنھوں نے اکثر عربوں کو بھی اپنا اسیر گیسو بنا لیا تھا۔ یہ عورتیں مُرلیاں کہلاتی ہیں۔ اپنی زندگی دیوتاؤں کی نذر کر دیتی ہیں۔ رقص و سرود اُن کا کام ہوتا ہے اور زناکاری کے ذریعے سے اپنا پیٹ پالتی ہیں۔

اس عام رجحان نے ہندوستان میں موسیقی کو غیر معمولی ترقی دلائی۔ اور اس کے متعلق کئی فن پیدا ہو گئے۔ پہلے تو یہ کہ موسیقی میں جس طرح مختلف آوازوں یعنی سُروں کے نشیب و فراز موزوں ترتیب سے مرتب کیے جاتے ہیں اسی طرح ناچ میں جسمانی حرکات متناسب ترتیب سے مرتب کر کے دلکش و دلفریب بنائے جاتے ہیں۔ اس فن نے موسیقی کے قدم بقدم ترقی کی۔

اور جس طرح موسیقی میں بہت سے ترانے اور دھُنیں قائم ہو گئی ہیں ویسے ہی
رقص میں حرکات جسمانی کی بہت سی گتیں بن گئی ہیں۔ اس میں جسم کا سُبک
اور پھُرتیلا بنانا۔ پاؤں میں گھونگھرو باندھ کے یہ قدرت پیدا کرنا کہ جب
چاہیں وہ بجیں اور جب چاہیں نہ بجیں۔ اور بجنے کی صورت میں جے گھونگھرو
چاہیں بجائیں۔ اس فن کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ بعض باکمال ناچنے والے
تلوار کی باڑھ پر ناچتے ہیں اور تلوے میں چرکا نہیں لگتا۔

دوسرا فن بتانا ہے۔ وہ یہ کہ گانے میں جو الفاظ زبان سے نکلتے جائیں
اپنی صورت سے اُن کی تصویر کھینچ کے دکھاتے جائیں۔ اس فن میں بعض
باکمال ناچنے والوں کو اس حد تک کمال حاصل ہوتا ہے کہ ایک ایک مصرع
کو سیکڑوں طریقوں سے بتاتے ہیں۔ اور چونکہ محفل میں بہت سے لوگ ایسے
ہوتے ہیں جو باریک تشبیہوں اور نازک خیال آرائیوں کو نہیں سمجھ سکتے اسلیے
ضرورت ہوتی ہے کہ ایک شارح پاس کھڑا ہو کے اُن باتوں کی تشریح
کرتا جائے۔

بہر تقدیر ہندوستان میں رقص کا فن بہت اعلیٰ درجۂ کمال کو پہونچا ہوا
ہے اور اس قابل ہے کہ بجائے بے پروائی کرنے کے اس کی قدر کی جائے
اور جہاں تک ممکن ہو اُسے ترقی دلائی جائے۔

رَحِمَ اللہُ مَنْ ہَدٰی اِلیٰ عُیُوبِی

عرب کی ایک مثل ہے جس کا مطلب یہ کہ "جو میرے عیب بتائے خدا اُس پر
رحمت کرے"۔ یہی مثل ہمارے قدیم کرم فرما مولانا مولوی حبیب الرحمٰن خان
صاحب شروانی رئیس بھیکم پور ضلع علیگڈھ پر صادق آتی ہے۔ ہم نے مضمون
"ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" میں غازی الدین حیدر اور نصیر الدین
حیدر فرمانروایان اودھ کے حالات میں ہاتھیوں اور درندوں کی لڑائی کا ذکر
کرتے وقت یہ دعویٰ کیا تھا کہ "قدیم ہندوستان کی تاریخ میں درندوں کے لڑانے
کا ذکر کہیں اور کبھی نہیں سُنا گیا تھا"۔ مولانا شروانی نے ہمارے اس دعوے

کی تغلیط فرمائی ہے۔ اور ایک کارڈ کے ذریعہ سے ہمیں مطلع فرماتے ہیں "تاریخ
سے ثابت ہے کہ مغلیہ سلطنت میں ہاتھی قلعہ کے میدان میں لڑائے جاتے تھے۔
برنی ار نے اس کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ عالمگیر کا اُس ہاتھی سے مقابلہ کرنا جو
اپنے حریف ہاتھی سے لڑکر بھاگا تھا مشہور ہے"۔

بے شک یہ ہماری کمی نظر تھی۔ اور برنی ار کے سفرنامے کو ہم نے نہیں پڑھا
تھا۔ اور اب اس کے تسلیم کر لینے میں ہمیں کوئی عذر نہیں ہو سکتا کہ دہلی میں ہاتھی
لڑائے جاتے تھے۔ اور یہ مذاق لکھنؤ میں وہیں سے آیا ہوگا۔ لیکن شاید درندوں
کا باہم لڑانا اور ہاتھی کا شیر۔ تیندوے۔ اور گینڈے سے مقابلہ کرانا لکھنؤ ہی
میں ثابت ہو سکے گا۔ ممکن ہے کہ یہ شوق ہندوستان کے کسی اور بادشاہ کو بھی
رہا ہو۔ مگر ہمیں اُس کی اطلاع نہیں ہے۔

بہرحال ہم مولانا کے نہایت ہی شکرگذار ہیں اور اُمید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ
یونہیں ہماری غلطیوں سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ مولانا ہی پر موقوف نہیں،
ہندوستان میں یہ مذاق پیدا ہونا چاہیے کہ محقق و صاحب علم حضرات تحقیق
و تدقیق مسائل خصوصاً تاریخی تفتیش میں قلم اُٹھانے والوں کے مدد و معاون رہا
کریں۔ ہم قدیم زبانی روایات یا بعض تحریری سندوں سے فائدہ اُٹھا کے جو کچھ
لکھتے ہیں یقینی نہیں ہو سکتا۔ اور ممکن ہے بہت سے حضرات کے علم میں ایسی باتیں
ہوں جو ہماری جستجو اور ہمارے قیاسی فیصلوں کے خلاف ہوں۔ ایسے
حضرات اگر بے توجہی کو چھوڑ کر ہمیں متنبہ کرتے رہیں تو ہمیں اپنی تحریرن پر زیادہ
بھروسا ہو جائے۔

سچّا عاشق کون ہے؟ مرد یا عورت؟

شاعری کا اصلی تعلق انسان کے دلی جوش و جذبات سے ہے۔ اور
جذباتِ انسانی میں سب سے زیادہ اہم عشق ہے۔ اگرچہ یہ کشش حیوانات اور
دیگر اصناف مخلوقات میں بھی نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ مگر ہماری شاعری کو
اسی عشق سے بحث ہے جو انسان میں ہو۔ اسی وجہ سے شاعر عشق کا بندہ ہوتا ہے

اور دعویٰ کرتا ہے کہ ع عشق انسان کے آب و گل مین ہے"۔ مگر انسان کی دو قسمین ہین۔ مرد اور عورت۔ اور کشش عشق کا پہلا مصدر انھین دونون گروہون کے دل ہین۔ جن کی باہمی کشش اور محبت نے دنیا مین نیرنگیان دکھائی ہین او شعرا کو خیال آرائی کا موقع دیا ہے۔

لیکن شاعر اُس عشق کو چاہتا ہے جو تمام جذبات پر غالب آجائے۔ اور عشق کے دُنیا و مافیہا سے علاقہ نہ باقی رہے۔ لہذا غور طلب یہ امر ہے کہ انسان کے دونون طبقون مرد اور عورت مین سے کس مین عشق زیادہ ہے؟ اور کس کا عشق زیادہ مستقل اور سچا ہوتا ہے؟ جذباتِ عشق کے اعتبار سے نوعِ انسان کے ان دونون حصون کو باہم ضرب دیا جائے تو چار شکلین پیدا ہوتی ہین (۱) مرد کا عشق مرد کے ساتھ۔ (۲) مرد کا عشق عورت کے ساتھ۔ (۳) عورت کا عشق مرد کے ساتھ (۴) عورت کا عشق عورت کے ساتھ۔ ان چار شکلون کے سوا کوئی پانچوین شکل نہین ہو سکتی۔

اب غور طلب یہ امر ہے کہ اِن چارون شکلون میں سے کون سی شکل شاعری کے لیئے زیادہ موزون ہے؟ کس مین کشش اور بیقراری بڑھی ہوئی ہے؟ اور کس مین زیادہ سچائی اور استقلال ہے؟ اِس سوال کا اگر ہم کافی اور اطمینان بخش جواب دے سکین تو مختلف زبانون کے شعرا کا ایک بہت بڑا جھگڑا چکا دین گے اور فیصلہ کر دین گے کہ کس زبان کے شاعرون کا مذاق اچھا اور سچا ہے۔

ان چار شکلون مین سے دو فطری ہین اور دو غیر فطری جنھین قانون کی زبان مین "خلاف وضع فطری" کہا جائے تو زیبا ہے۔ اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ مرد کا عشق عورت کے ساتھ یا عورت کا عشق مرد کے ساتھ فطری ہے۔ اور اسی وجہ سے جن زبانون کے شعرا نے ان دو شکلون کو اختیار کیا ہے اُن کے مذاق مین فطرت اور نیچرل مذاق کی زیادہ جھلک بھی ہے۔ اور جن شاعرون نے غیر فطری عشق کی صورت اختیار کی ہے اُن کا مذاق شاعری فطرت صحیحہ سے کوسون دور ہو کے صرف خیال آرائی۔ لفاظی اور مبالغون مین پھنس کے رہ گیا ہے

اب ہم یہ بتاتے ہین کہ کن زبانون کے شاعرون نے کن شکلون کو اختیار کیا ہے۔ عربی۔ یونانی۔ رومی۔ انگریزی۔ فرانسیسی اور دیگر مغربی زبانون کے شعرا کے مذاق نے مذکورۂ بالا شکلون مین سے دوسری فطری شکل اختیار کی ہے۔ یعنی مرد کا عشق عورت کے ساتھ۔ آخر عہد کے مولدین[۵] عرب، ترکی، فارسی او اُردو کے شعرا نے پہلی غیر فطری شکل اختیار کی ہے یعنی مرد کا عشق مرد کے ساتھ۔ ہندوستان کی بھاشا اور غالباً سنسکرت نے تیسری فطری شکل اختیار کی ہے۔ یعنی عورت کا عشق مرد کے ساتھ۔ چوتھی غیر فطری شکل یعنی عورت کا عشق عورت کے ساتھ۔ یہ مذاق ہمین ابھی تک کسی زبان کے شعرا مین نہین نظر آیا۔ بد اخلاقی نے بعض اشخاص مین چاہے یہ مذاق بھی پیدا کر دیا ہو مگر کسی قوم اور کسی زبان کے شعرا کا یہ مذاق نہین سنا گیا۔ پہلے مورخ یونان ہیروڈوٹس نے دامن کوہ قاف کے ملک گرجستان مین جب امیزونون (جنگجو عورتون) کا دور دورہ بتایا ہے اُن دنون ممکن ہے کہ وہان یہ مذاق ہو۔ اس لیے کہ کہتے ہین وہ سورما عورتین مردون سے متنفر تھین۔ اُنکو اپنی قلمرو مین رہنے نہ دیتی تھین۔ ضرورت کے لیے اپنے علاقے کے باہر جا کے دوسری سرزمین کے مردون سے حاملہ ہو آتین مگر اس کی روادار نہ تھین کہ کوئی مرد اُن مین رہے۔ وہان اُن دنون چونکہ عورتین ہی عورتین تھین۔ اور مردون سے دشمنی رکھتی تھین اس لیے قرین قیاس ہے کہ باہم عشق و محبت کے روابط رکھتی ہون۔ اُن کا قومی مذاق یہی ہو کہ عورت پہ فریفتہ ہون۔ اور اُن کی شاعری اسی رنگ مین ڈوبی ہوئی ہو۔ لیکن دنیا مین اور کہین یہ مذاق نہین سُنا گیا۔

الغرض موجودہ شعرائے ارض کے مذاق کا عشق تین ہی طرح کا ہے۔ (۱) یا مرد مرد پر عاشق ہو (۲) یا مرد عورت پر عاشق ہو (۳) یا عورت مرد پر عاشق ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اِن تینون صورتون مین کون سی صورت بہتر ہے۔

[۵] مولّد اُن عربون کو کہتے ہین جن مین عجمی خون مل گیا ہو۔ یعنی مولد انگریزون کے یوریشین ہین۔ مولد شعرائے عرب وہ ہین جن کا مذاق شاعری بیرونی اثر سے مغشوش ہو گیا تھا۔

اور شاعری کے لیے زیادہ موزون ہے؟

پہلی صورت چونکہ ہماری اور ہماری ہم مذہب دوسری زبانون کا شعار بنی ہوئی ہے۔ اس لیے مہوت ہے چاہے ہم اُس پر نکتہ چینی نہ کریں مگر اس حقیقت کو نہیں مٹا سکتے کہ وہ مذہباً شرعاً اور عرفاً بد اخلاقی و معصیت قانوناً و تمدناً جرم۔ اور فلسفیانہ طور پر خلاف فطرت ہے۔ لہذا شعرا کے لیے اُس سے زیادہ لغو۔ بیہودہ۔ بے حقیقت۔ بدمزہ۔ اور بےحیائی و بے غیرتی پیدا کرنے والا کوئی مذاق عشق نہیں ہو سکتا۔ اُس عشق مین چونکہ فطرت کی سچی کشش نہ تھی اُس کا مذاق حقیقت سے دور اور واقعیت سے جدا تھا۔ اُس لیے اس عشق کے مبتلاؤن کی شاعری کو سچائی اور نیچرل دلکشی سے کوئی علاقہ نہیں رہا۔ وہ دل سے عاشق نہیں بلکہ صرف بنے ہوے فرضی عاشق ہین۔ اُن کا معشوق ایک خیالی پیکر ہے جس پر دراصل نہ وہ خود عاشق ہین اور نہ کوئی اور عاشق ہو سکتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اُن مین سچے جذبات پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ اُن کے استعارے۔ اُن کی تشبیہین۔ اُن کی خیال آرائیان۔ اُن کی نازک خیالیان صرف فرضی ہوتی ہین۔ اپنے عشق مین اصلیت و واقعیت نہ ہونے کو وہ خود محسوس کرتے ہین۔ اور فطری کششون سے اپنی شاعری کو مطلقاً محروم دیکھ کے کبھی لفاظی اختیار کر کے فضول گوئی کے مرتکب ہوتے ہین۔ کبھی رعایت کے پیچھے پڑ کے ضلع جگت بولنے لگتے ہین۔ کبھی مبالغے کو اپنا شعار بنا کے جھوٹ کے پل باندھتے ہین۔ کبھی صنعتون اور بوقلمونیون کی بھول بھلیان بنا کے کھڑی کرتے ہین اور کبھی دور از کار اوہام اور بناوٹی پیچیدہ خیالون کو جنگل کی وحشی چڑیون کی طرح زبردستی پکڑ پکڑ کے الفاظ کے پنجرون مین بند کرتے ہین۔ جو کبھی تو اُڑ بھاگتی ہین اور کبھی اُسی مین پھڑک پھڑک کے دم دیتی ہین۔ غرض سب کچھ کرتے ہین اور زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہین مگر ایسی ایک بات بھی مشکل سے کہہ سکتے ہین جو دل کو لگے۔ اور سامعین کو بیتاب کر دے۔ اس لیے کہ جھوٹے کی زبان مین اثر نہیں ہوتا۔ اُن کا مذاق جھوٹا ہے ان کی شاعری بے حقیقت ہے۔ اُن کا خیال مجرمانہ ہے۔ جس کی بنا پر وہ مذہباً

گنہگار۔ اخلاقاً سوسائٹی کو گندہ اور ناپاک کرنے والے۔ اور قانوناً جیل میں بھیجے جانے کے قابل ہین۔

اس بدمذاقی اور جھوٹے عشق نے سچے اثر کی برکتون اور سادی مؤثر کششون کی برکت سے محروم کر کے انھین مجبور کر دیا ہے کہ اپنی شاعری کی عمارت کو صرف خیال کے مال مسالے سے تعمیر کر کے رعایت لفظی اور طرح طرح کی آورد کی صنعتون سے آراستہ کر دین۔ اس لیے کہ اگر اُن کے اشعار پر کسی دل سے "آہ!" نکلنے کی اُمید نہین تو شوکتِ الفاظ دیکھ کے "واہ" ہی نکل جائے۔

اس صورت کے بیہودہ و بے اصل ثابت ہو جانے کے بعد دو ہی صورتین رہ جاتی ہین (۱) مرد کا عشق عورت پر اور (۲) عورت کا عشق مرد پر۔ پہلی صورت کو جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہین قدیم شعرائے عرب اور یورپ کی اکثر اگلی پچھلی زبانون کے شعرا نے اختیار کیا۔ اور دوسری صورت کو ہندی شاعری نے۔ یہ دونون صورتین فطرت کے موافق ہین۔ ایک مرد جب اپنی محبوبہ کے فراق مین فریاد کرتا ہے۔ اور ایک باوفا عورت جب اپنے شوہر اور مرد معشوق کی یاد مین بیتاب و بیقرار ہو کے روتی ہے۔ دونون کی زبان مین بلا کا اثر ہوتا ہے اور چونکہ ان جذبات عشق مین سچائی مضمر ہوتی ہے اس لیے اُن کی زبان کا ہر ہر لفظ تیر و نشتر کا کام دیتا ہے۔ اور جس کے کان تک پہونچتا ہے بیتاب کر دیتا ہے۔

لیکن اِن دونون مین امتیاز دکھا کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا آسان نہین ہے۔ مگر ہم فیصلہ ضرور کرین گے۔ اور سچا فیصلہ کرین گے۔ دنیا مین اکثر فیصلہ کثرتِ رائے اور ووٹون کی زیادتی پر ہوا کرتا ہے۔ اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ مرد عاشق کے طرفدار بہت ہین۔ ساری دُنیا اُسی کی سی کہہ رہی ہے۔ اور مغرب کے اگلے پچھلے سب زور و شور سے اُس کی تائید کر رہے ہین۔ اور اُس کے مقابل دکھیاری عورت عاشقہ بیکس ہے اُس کی درد بھری آواز گھر سے باہر نہ نکل سکی اور اس لیئے اُس کے اثر کا اندازہ بھی دنیا مین

بہت ہی کم لوگوں کو ہوا ہے۔ لیکن اگر سنو گے تو جو درد۔ جو سوز و گداز۔ اور جو اثر اُس کے لہجے اُس کی آواز۔ اور اُس کے بیان میں پاؤ گے کہیں نہ نظر آئیگا۔ مگر اس بحث کو ہم اس وقت اُٹھائے رکھتے ہیں۔ اور کسی آیندہ موقع پر بتائینگے کہ دونوں میں سے کون اچھا ہے اور کیوں اچھا ہے۔

زبانِ اُردو کی شامت

چند سال ہوے ایک دن صبح کو ہم نے اپنے شہر کے قابل اور ہیدار مغز میونسپل کمشنر پنڈت اقبال نرائن مسلہ دان بیرسٹرایٹ لا کو اپنے مکان کی طرف سے گذرتے دیکھا۔ اور صاحب سلامت کے بعد تعجب سے پوچھا "آج اِدھر کہاں بھول پڑے؟" فرمایا "آپ کے پڑوس والے میونسپل اسکول کے معائنہ کو آیا تھا۔" پوچھا "تو کیسا پایا؟" اُنھوں نے جواب میں فرمایا کہ "یہ دیہاتی مدرس تو بجائے اُردو کی تعلیم دینے کے لڑکوں کی زبان خراب کرتے ہیں۔" مین نے کہا "آپ کے سررشتۂ تعلیم نے انتخاب مدرسین کا جو طریقہ رکھا ہے اُس سے اہل زبان درکنار کسی زبان دان مدرس کے ملنے کی بھی اُمید نہیں ہوسکتی۔"

خیر وہ گفتگو انھیں دو باتوں میں ختم ہوگئی۔ مگر مجھے خیال رہا کہ شاید پنڈت صاحب موصوف کی توجہ کوئی مفید نتیجہ پیدا کرے۔ اس کے بعد جب یہ سُنا کہ پنڈت مہاراج نرائن صاحب حکیبت تمام میونسپل اسکولوں کے انسپکٹر مقرر ہوے ہیں تو اُمید اور قوی ہوگئی۔ اور دل کو یقین ہوگیا کہ ان دونوں بزرگوں کی کوشش کوئی نہ کوئی مفید نتیجہ ضرور ظاہر کرے گی۔

لیکن اپنی چھوٹی لڑکی کو پڑھانے کی ضرورت سے اتفاقًا ہم نے اپنے ملک کے مروجہ اُردو نصاب تعلیم کو دیکھا تو حواس جاتے رہے اور اصلاح کی جو کچھ اُمیدیں دل میں پیدا ہوئی تھیں سب خاک میں مل گئیں۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب جس کا نام "اُردو کی پہلی ریڈر" ہے اس کے مصنف منشی برج باسی لال صاحب بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس قسمت بنارس" ہیں۔ جن کو یا شائد سررشتۂ تعلیم کو دعویٰ ہے کہ اس کتاب کو اُنھوں نے جدید طرز تعلیم کے مطابق

"تصنیف" نہیں کیا بلکہ "بنایا ہے"۔

مین نہ یہ جانتا ہوں کہ گریجوٹ کتاب بنانے والے صاحب کس خطّے کے رہنے والے ہیں اور نہ اس سے آگاہ ہوں کہ اُنھوں نے اُردو کی تعلیم کہاں پائی ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جو گریجوئیٹانہ لٹریچر اُنھوں نے اپنی اس بنائی ہوئی کتاب میں درج فرمایا ہے اُس سے سررشتۂ تعلیم کی اُردو شاید کسی کو آجائے مگر جس زبان اُردو کو ہم لوگ بولتے جانتے اور پڑھتے لکھتے ہیں وہ اگر کسی بچے کو آتی بھی ہوگی تو اُس کے چوپٹ کردینے کے لیے یہ نصاب بہت اچھی طرح کافی ہے۔

گر ہمین مکتب ست و این مُلّا کار طفلان تمام خواہد شد

ایک سرسری نظر میں اس کتاب کے جو زبان اُردو کی مرمت کرنے والے خاص خاص محاورات نظر آئے حسب ذیل عرض کیے جاتے ہیں۔

پہلے صفحے کا پہلا جملہ ہے "باباجی کے ہاتھ میں مالا ہے" اور اُس کے بعد دوسرا فقرہ ہے "وہ گیت گایا کرتا ہے"۔ ہماری اُردو میں جس کے نام کے ساتھ "جی" یا اس قسم کا اور کوئی تعظیمی لفظ استعمال کیا جاتا ہے اُسکے لیے ہمیشہ فعل جمع لایا جاتا ہے۔ یعنی اس جملے کو یوں بولیں گے کہ "وہ گیت گایا کرتے ہیں"۔ مگر شاید یہ انگریزی اُردو ہو جس میں تعظیم کے لیے جمع کا فعل لانا صاحب بہادروں کے محاورے کے بالکل خلاف ہے۔

تیسرے صفحے کی پہلی اور دوسری سطر میں ہے "پہلا جلد جلد قدم اُٹھاتا ہے اور دوسرا دھیرے دھیرے"۔ آخری لفظ ہندی گیتوں میں البتہ سُنے گئے مگر اُردو میں آج تک نہیں سُنے تھے۔ دھیرے دراصل اُردو زبان کا لفظ ہی نہیں ہے۔

پانچویں صفحے کی پانچویں اور چھٹی سطر میں ہے "پیسے بھُنا لاؤ"۔ ہمارے یہاں روپیہ بھُنایا جاتا ہے۔ اور پیسہ اُس وقت بھُنایا جاتا ہے جب اُس کی کوڑیاں منگوانا ہوں۔ لیکن ایسی صورت میں فقط ایک پیسہ بھُنایا جاتا ہے "پیسے بھُنانے" کا اتفاق نہیں ہوتا۔

دسوین صفحے پر ہندوستانی معاشرت کی ایک تصویر ہے جس مین حکیم صاحب ایک اسٹول پر بیٹھے مریض کی نبض دیکھ رہے ہین - مریض نے بجائے بیٹھنے کے ایک گھٹنا زمین پر ٹیک دیا ہے اور دوسرا پاؤن آگے بڑھا کے اُس پر ہاتھ رکھ لیا ہے - اس شائستگی سے نبض دکھانے والے آج تک یہان کسی حکیم کے مطب مین نہین دیکھے گئے تھے - بڑی عنایت ہوتی اگر ہمارے گریجویٹ مصنف بچون کو فقط اپنی زبان سکھاتے اپنی تہذیب و شائستگی کے بھی سکھلا دینے کا ارادہ نہ فرماتے -

بارہوین صفحے کی چوتھی اور پانچوین سطر مین ہے "اس لحاف کی سنجاف اچھی ہے" - "سنجاف" گوٹ کی ایک خاص وضع کا نام ہے - کوئی مستقل چیز نہین ہم لوگ لحاف کی گوٹ کہین گے - لحاف کی سنجاف نہین کہہ سکتے - مگر مصنف صاحب کی زبان کون پکڑ سکتا ہے؟ جو چاہین فرمائین -

پندرہوین صفحے کی پہلی سطر مین ہے "مجھے تیرنا نہین آتا" یہ محاورہ اگرچہ بعض عوام بول جاتے ہین مگر زبان دان بخوبی جانتے ہین کہ اُردو مین کسی لکڑی بے جان چیز کے آپ ہی آپ پانی کے اوپر قائم رہنے کو تیرنا کہتے ہین اور جو ذی روح ہاتھ پاؤن کی کوشش سے اپنے آپ کو پانی کے اوپر قائم کرے اُس کے اس فعل کو تیرنا نہین "پیرنا" کہتے ہین -

اُنیسوین صفحے مین چھٹی سطر پر ہے "اُنچاس مین سے بائیس گھٹاؤ" اہل زبان اُنچاس کہتے ہین - لیکن ہمارے معلم زبان مصنف صاحب کی زبان اُنچاس ہے - مگر کاش یہ زبان اُن کے گھر ہی مین رہتی -

بائیسوین صفحے کی چوتھی سطر مین ہے "جو اُستاد پڑھاوین اُس پر دھیان دو" ہماری اُردو مین اس موقع پر کہین گے "اُس مین دھیان لگاؤ" مگر افسوس کہ مصنف صاحب کی زبان مین "اُس پر دھیان دو" کہتے ہین - اور ہمارے بچے مجبور ہین کہ اُن کی یہ بولی سیکھیں بھی -

تیئسوین صفحے مین ایک لڑکا اپنے باغ مین گیا ہے جس کی نسبت (سطر سات آٹھ مین ہے) "وہان اُس کا دادا زمین کھود کر آم کے چھوٹے چھوٹے پودے

لگا رہا تھا" یہ کسی مالی کا لڑکا ہو تو ادبات ہے - لیکن کسی شریف لڑکے کا ذکر ہو رہا ہے تو اُس کے دادا کی اس طرح توہین نہین کرتے بلکہ کہتے ہین کہ اُسکے دادا ایسا کام کر رہے تھے -

چوبیسوین صفحہ کی پانچوین اور چھٹی سطر مین ہے "لوگ اپنے بزرگون کے مرنے کے پیچھے عزت سے یاد کرتے ہین" اس مین اول تو "مرنے کے پیچھے" کی جگہ "مرنے کے بعد" کہنا چاہیے - مرنے کے پیچھے صحیح اُردو نہین - دوسرے یہ نہین پتہ چلتا کہ اُن کے مرنے کے بعد یا اپنے مرنے کے بعد - بہرحال اُردو مین اس جملے کو یون ہونا چاہیے کہ "اُن کے مرنے کے بعد عزت سے یاد کرتے ہین"

پچیسوین صفحہ کی چوتھی سطر مین ہے "جب اُس کی (چنے کی) پتیان بہت نرم رہتی ہین تو لوگ نوچ نوچ کے کھاتے ہین" اہل زبان اُردو اس مقام پر "نرم رہتی" ہرگز نہ کہین گے بلکہ "نرم ہوتی" کہین گے -

انھین چند محاورات پر موقوف نہین اس کتاب کو اول سے آخر تک پورے پڑھا جایئے تو ہر صفحے پر ایسی ہی فاش غلطیان ملین گی - پڑھانے والے اگر دیہاتی مدرس ہین یا بہت ہی معمولی استعداد کے اُردو دان جو سمجھ جاتے ہین کہ یہی فصیح و صحیح زبان ہے -

کیا یہ عبرت کی بات نہین کہ لکھنؤ کے مدرسون مین یہ اُردو پڑھائی جاتی ہے جہان زبان اُردو نے نشو و نما پایا ہے - جہان کے شرفا و فصحا کی زبان سند اور معیار فصاحت مانی جاتی ہے - جہان ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کی تحقیق و تنقید مین خدا جانے کیسی کیسی بحثین پیش آتی رہتی ہین - اور جہان کی خاک مین میر - سودا - انشا - مصحفی - جرأت - ناسخ - آتش - انیس - دبیر اور اسی طرح کے صدہا اساتذۂ سخن آرام کر رہے ہین - لکھنؤ کے پاس اب زبان اُردو کے سوا کچھ نہین رہ گیا ہے - وضع قطع - صحبت و معاشرت سب چیزین تو چھن گئین - لے دے کے ایک زبان رہ گئی ہے اور افسوس کہ اب وہ بھی سررشتۂ تعلیم کے خنجر جہالت سے ذبح ہو رہی ہے -

ہمین اُن بزرگون کے معزز نامون کے معلوم ہونے کی ضرورت ہے جنھون نے

اس کورس کو پسند اور منظور فرمایا ہے - یہ کام بورڈ کے سپرد ہے - اور بورڈ مین جو بزرگوار ممبر منتخب ہوا کرتے ہین اُن مین ہماری بدقسمتی سے سارے کمالات جمع ہوتے ہین ایک وہ معری ہوتے ہین تو زبان دانی سے - اُن کے لیے گریجویٹ ہونا شرط ہے - انگریزی دانی لازمی ہے - اور اور بھی خدا جانے کن کن صفات کا موجود ہونا ضروری تصور کیا جاتا ہے - مگر اس کو کوئی نہین پوچھتا کہ وہ اُردو بھی جانتے ہین یا نہین -

سب سے زیادہ خرابی یہ ہے کہ سررشتۂ تعلیم کے عہدہ دارون نے کو اپنی تجارت کی منڈی بنا لیا ہے - وہ لوگ ادھر اُدھر سے جوڑ توڑ کے چند عبار جمع کرتے اور ایک کتاب بناتے ہین - اور منظور کرنے والے عہدہ دارون پر اثر ڈال کے اور سفارشین پہونچا کے منظور کرا لیتے ہین - آج تک کبھی اسکی کوشش نہین کی گئی کہ اُردو کا نصاب بنانے مین دہلی و لکھنؤ کے اُن لوگون سے بھی مدد لی جائے جو اُردو کے مسلم الثبوت اُستاد ہین -

سُنا جاتا ہے کہ اب یونیورسٹی آپ اپنا کورس تیار کرائے گی - اور کسی اُس سے تاجرانہ نفع اُٹھانے کا موقع نہ دیا جائے گا - مگر اس سے یہ اُمید فضول ہے کہ اساتذۂ زبان سے کوئی مدد لی جائے گی - اس لیے کہ یونیورسٹی کی دُنیا کے لال بجھکڑ وہی بزرگوار ہین جو سررشتۂ تعلیم مین بلحاظ عہدہ کوئی اثر اقتدار رکھتے ہین - کورس بنانے کو جب کہا جائے گا اُنھین سے کہا جا اور یہ پہلے تو منفعت کے شوق مین تھوڑی بہت کوشش بھی کرتے اور ادھر سے پوچھ کے کچھ کر بھی لیتے تھے اب بے پروائی کے باعث پہلے سے بھی بد مرتب کرین گے - اور اُردو کی اور مٹی خراب ہوگی -

بہرحال سررشتۂ تعلیم کے نصاب مین اصلاح کی کوئی اُمید نہین - اور اس کا سوا اس کے کوئی علاج نہین نظر آتا کہ ہم اور تمام وہ لوگ جو اپنے بچون کی زبان بگڑنے کو نہ برداشت کر سکتے ہون اُنھین مدارس سرکاری سے اُٹھا لین - اور اُن کی تعلیم کا کوئی اور انتظام کرین -

کیا واقعی انسان سب سے افضل ہے؟

گو اپنے مُنہ میان مٹھو بننا اچھا نہین معلوم ہوتا - مگر انسان کو اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ ہے - اور اپنے اس دعوے کی سچائی کا اُسے اس قدر یقین ہے کہ اس مین شک و شبہہ کی ذرا بھی گنجایش نہین - یہان تک کہ اُسکے خلاف کوئی بحث چھیڑی جائے تو اُس کے سننے کی بھی وہ تاب نہین لا سکتا - اس دعوے کی اصلی محرک تو انسان کی خود پرستی ہے جو اُس کی سرشت مین داخل ہے - اور وہ رہ رہ کے اُس کی زبان سے کہلا دیا کرتی ہے کہ "ہمچو من دیگرے نیست" مگر اُسے زیادہ قوت اس سے مل گئی کہ وہ تمام مذاہب جن سے اُمم عالم کے تمدن بنے ہین اُن سب نے بھی انسان کے اس دعوے کی تصدیق و تائید کر دی - چنانچہ اب یہ یقین ہمارے عقائد مین داخل ہو گیا ہے کہ "ہم اشرف المخلوقات ہین"

ہمارے راویان کہن کہتے ہین کہ اگلے دنون یہ مسئلہ اور دعویٰ ایک باضابطہ مقدمے کی شان سے بعض قدیم مستند دربارون مین پیش ہو کے طے ہو چکا ہے - چنانچہ پارسیون کے صحف آسمانی مین جو دساتیر کے مجموعے مین مرتب و مدون ہین بتایا گیا ہے کہ مجوس کے "آدم گل شاہ" کے دربار مین جانورون نے آ کے شکایت کی کہ انسان اپنے آپ کو ہم سب سے افضل و اعلیٰ بتاتا - پھر اُسکی بنا پر ہماری آزادی مین فرق ڈالتا - اور حکومت کے بہانے ہم پر طرح طرح کے ظلم و جور کرتا ہے - اُن کی بحث سُنی گئی - انسان کو جواب دہی کرنا پڑی - اور گو کہ عدالت کے تیورون سے جنبہ داری کا شائبہ نہ تھا مگر انسان ہی کے حق مین فیصلہ ہوا - اور اُسے اُن بے اعتدالیون کی اور جرأت دلائی گئی -

اس کے بعد رسائل اخوان الصفا مین سے ایک رسالہ غالباً پارسیون ہی کے مذکورہ بالا خیال سے لے کے زیادہ لطف و وضاحت کے ساتھ اسی دعوے کی تائید مین لکھا گیا - اُس مین یہ طے شدہ مقدمہ پھر نمبر پر لیا گیا ہے - اور حاکم انسان نہین ایک تاجدار جن ہے - اس رسالے مین یہ قضیہ جنون کے ایک

محترم دربار میں پیش ہوا ہے۔ تمام جانوروں نے باری باری آکے اپنے کمالات
اور ہنر بیان کیے۔ انسان کو نہایت بے اعتدالی کا الزام دیا اور اُس کے جور
وستم سے پناہ مانگی۔ انسان نے اپنے فضائل و محامد بیان کیے۔ اور زور دے
کے ثابت کیا کہ ہم سب سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ اور خدا نے ہمیں ایسی قوت عطا کی
ہے کہ سارے حیوانات پر تصرف کرتے اور جس سے جو کام چاہتے ہیں لیتے ہیں
آخر اُس جنّی دربار نے بھی انسان ہی کی طرفداری کی۔ اور جانوروں کا دعویٰ
خارج کرکے انسان کو حق دیدیا کہ بے زبان جانوروں کے ساتھ جو سلوک
چاہے کرے۔

لیکن اصل یہ ہے کہ یہ دونوں فیصلے خود انسان نے اپنے مقاصد و اغراض
کے مطابق بنا لیے ہیں۔ اور اگر کوئی غیر جانبدار عدالت موجود ہوتی تو اس جعل
بنانے پر انسان کو بڑی بھاری سنگین سزا ملتی۔ دراصل انسان نے اپنی کامیابی
کے زعم اور غلبے کے نشہ میں جہاں جانوروں پر ظلم و جور کیے وہاں اپنی آ
میں یہ مقدمے اور فیصلے بھی بنا لیے۔ اُسے اپنی چالاکی اور قوت تدبر پر گھمنڈ اور
ناز ہے۔ اور اُنھیں چیزوں کو بمصداق "مائٹ از رائٹ" (قوت ہی استحقاق ہے)
اپنی عظمت کی دلیل تصور کرلیا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ہمارا جانوروں پر غالب آجانا
اور اُن میں ہر قسم کا تصرف کر سکنا ہی ہماری فضیلت و فوقیت کی دلیل ہے

جن لوگوں نے مسئلہ تخلیق عالم پر غور کیا ہے اب اُن کی یہ رائے قرار پائی
ہے کہ انسان کی تخلیق سے پہلے کرۂ ارض جنگلوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور اُس میں
ایسے ایسے عجیب و غریب حیوانات۔ اور عجیب الخلقت و عظیم الجثہ جانور پیدا
ہوے تھے کہ اُن کے سامنے انسان ضعیف البنیان کی کچھ ہستی نہ تھی۔ اُنھیں
وحشی موذیوں اور خونخوار دشمنوں کے آغوش میں انسان پیدا ہوا۔ جس نے
آفرینش کے ساتھ ہی اپنی ذاتی حفاظت کا سامان شروع کیا۔ انسان کی صورت
دیکھتے ہی وہ سب اُس کی ہلاکت کے درپے ہوگئے۔ پہلے تو انسان نے
کے پہاڑوں کی کھوہوں۔ درختوں کے جھنڈوں۔ اور تنگ و تاریک غاروں میں
پناہ لی۔ پھر اپنی چالاکی و مکاری سے اُن موذیوں کو زیر کرنے لگا۔ اسکے بعد

اُس نے جنگل کاٹ کے میدان نکالے۔ اپنے رہنے اور وحشی درندوں سے بچنے کے
لیے مکان بنائے۔ آپس میں اتفاق کیا۔ اور آخر میں شہر اور گاؤں آباد ہونے لگے
ترقی کے اس درجے تک پہونچتے پہونچتے اُس نے بہت سے بڑے بڑے وحشتناک
جانوروں کی نسلیں فنا کردیں۔ بہتوں کو اپنا مطیع بنا لیا۔ جن میں سے بعض کو کھاتا
بعض پر سواری لیتا۔ بعض کو تفنن طبع کے لیے پالتا ہے۔ اور جو قابو میں نہیں
آتے اُن کا شکار کرتا ہے۔

وحشی جانوروں کو حریف پر غالب آنے اور اپنے بچانے کے لیے خدا نے
طرح طرح کے خوفناک اسلحہ دیے تھے۔ اُن کے مقابل میں انسان نے اپنی
طباعی سے ایسے ایسے مصنوعی اسلحہ ایجاد کیے جنھوں نے حیوانات کے قدرتی
اسلحہ کو بیکار کردیا۔ اور ان آلات اور حربوں سے اُس نے جانوروں کو فنا
کرنا شروع کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی نسل روز بروز بڑھنے لگی۔ اور ان
قوی ہیکل و وحشی جانوروں کی مقدار یوماً فیوماً گھٹتی گئی۔ اُن کی بہت سی نسلیں
کلیۃً فنا ہوگئیں۔ جو رہ گئیں اُنھوں نے انسان کے شر سے بچنے کے لیے اُن کی
بستیوں کو چھوڑ چھوڑ کے کوہ و صحرا اور دشت و بیابان کی راہ لی۔ اور انسان
کو اپنی عام فتح کے زعم باطل اور اپنے غلبے کے نشے میں یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ ہم
ہی سب سے افضل و اعلیٰ ہیں۔

آخر اسی غلبے اور حکومت کو اُس نے اپنی فوقیت و افضلیت کی دلیل
قرار دیدیا۔ جس طرح کہ انسانوں کی کامیاب و حکمران قومیں حکمرانی اور اپنے
غلبے کو دوسری قوموں کے مقابلے میں اپنے اشرف و اعلیٰ ہونے کی دلیل خیال
کیا کرتی ہیں۔ چنانچہ اسی دلیل کے گھمنڈ پر اُنھوں نے اپنے خیالی مقدمے بنائے۔
اپنے خیال سے اُن مقدموں کی روداد میں قلمبند کیں اور اس حجت پر اس قدر ناز تھا
کہ جعلی فیصلے شایع کرکے خود ہی ڈگری لے لی۔

مگر اب دنیا کا تمدن بہت آگے بڑھ آیا ہے۔ تحقیق و تنقید نے انسان کے
اگلے تمام دعوے توڑ دیے ہیں۔ اور واقعات کی صورت ہی اور سے اور ہوگئی
ہے۔ گاؤزوریوں اور جسمانی قوت سے حکومت کا حق مل جانا اگلے دنوں ایک

قطعی فیصلہ تھا۔ مگر اب انسان کو ایسے مصنوعی آلات و اسلحہ ہاتھ آگئے ہیں کہ تنومندی اور قوت کی کچھ اصل و حقیقت ہی نہیں رہی۔

علاوہ بریں اب یہ بھی ثابت ہوگیا ہے کہ غلبے اور حکومت کو فضیلت و شرافت سے بہت ہی کم تعلق ہے۔ بلکہ لڑائی اور جسمانی زور آزمائی انسان کے ادنیٰ ترین فضائل میں شمار کی جاتی ہیں۔ ممکن ہے کہ انصاف پسندی۔ دیانتداری۔ منفعت اور اسی طرح کے اور بہت سے صفات جانوروں میں زیادہ ہوں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ صفات جنگجوئی سے زیادہ افضل ہیں۔

دنیا کے وہ لوگ جو تمام مذہبوں میں واجب التعظیم اور اشرف و افضل سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک نیکی اور خوبی یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ فضیلت و شرافت صرف اس میں ہے کہ انسان دنیاوی جھگڑوں سے الگ رہے۔ دولتمندی کی ہوسوں سے بھاگے۔ خدا نے جو کچھ دیا ہے اُس پر قناعت کرے۔ اپنی نسل کی بقا کا انتظام رکھے۔ اور شب و روز خدا کو یاد کرے۔ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں میں یہ صفات بہ نسبت انسان کے زیادہ اکمل و اعلےٰ درجے تک پائے جاتے ہیں۔ وہ قانع ہیں۔ بے ضرورت بھیک نہیں مانگتے۔ اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوتے۔ دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔ اور جہاں تک بنتا ہے بے آزار زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیا ان صفات کا لحاظ کیجیے تو یہ جانور جن کو ہم نے حد سے زیادہ شمار کیا ہے ہم سے زیادہ شریف و افضل نہیں معلوم ہوتے؟

اس کو بھی چھوڑیے۔ جانوروں کی اس قطعی دلیل فضیلت کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ تمام صفات حسنہ اور کُل خوبیوں کا ایک ذات میں جمع ہو جانا اور کُل بُرائیوں۔ خرابیوں اور ذلیل حرکتوں سے اُس کا مصئون و معصوم ہونا محال ہے۔ اس لیے کہ مستجمع جمیع کمالات ہونا صرف اُس رب العزت کے ساتھ مخصوص ہے جو ہم سب کا خالقِ بے ہمتا ہے۔ ایسی حالت میں جانوروں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کسی ایک صفت کو اپنے ساتھ مخصوص کر لیا ہے۔

بخلاف اس کے انسان کی یہ حالت ہے کہ طلب الکل فوت الکل۔ وہ چاہتا ہے

کہ ساری خوبیاں اُس میں جمع ہو جائیں۔ مگر اصل میں دیکھیے تو سب ناقص درجے تک ہیں۔ اور اس قدر ناتمام اور غیر مکمل ہیں کہ اُن خوبیوں کا ہونا بجائے کوئی خوبی ہونے کے عیب ہوگیا ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ ان تمام ناقص صفات پر انسان کو تو یہ غرّہ ہے کہ اشرف المخلوقات ہونے کا دعوٰی کر رہا ہے۔ اور جانوروں کی یہ حالت ہے کہ اپنی اپنی صفتوں میں اس درجہ کمال رکھنے پر بھی اس طرح خاموش ہیں کہ گویا کچھ جانتے ہی نہیں۔

انسان کو سب سے بڑا دعوٰی اپنے ہُنروں اور اپنی صنعتوں پر ہے۔ اصلی یہی ترقی ایسی نمایاں ہے جس نے دنیا میں اس قدر ترمیم کر دی۔ اول تو اسی میں شک ہے کہ اسے ترقی کہنا چاہیے یا ہوس پرستیوں کا کرشمہ۔ لیکن اگر بالفرض یہ ترقی بھی ہے تو اگر غور کیجیے تو انسان نے تمام صفتیں جانوروں ہی سے سیکھی ہیں۔ وہ موجد بنتا ہے۔ مگر انصاف سے پتہ لگائیے تو اُس میں سوا دوسروں کی نقل کرنے کے ایجاد کا مطلق مادہ نہیں ہے۔ انسانی ہُنرمندیوں کے جتنے مبادی ہیں سب دوسروں سے سیکھے اور چُرائے ہوئے ہیں۔ اُس نے جانوروں کے اون اور پَر دیکھ کے اپنے جسم کے لیے کپڑے بنائے۔ جانوروں کی غذاؤں سے منتخب کرکے اور اُن کو باہم ترتیب دے کے اپنے لیے قسم قسم کی غذائیں منتخب کیں۔ مختلف جانوروں کے مسکن اور آشیانے دیکھ کے اپنے رہنے کو گھر بنائے۔ شب کے بھو نجھ میں جگنو چمکتے دیکھ کر اپنے مکان میں چراغ روشن کیا۔ شہد کی مکھیوں کا نظام دیکھ کے اپنا نظام تمدنی قائم کیا۔ اسی طرح جتنی چیزوں کو خیال کیجیے کوئی خاص انسان کی ایجاد کی ہوئی نہ ملے گی۔

اس میں شک نہیں کہ انسان کو ایک بیقرار و غیر قانع طبیعت ملی ہے۔ جو اُسے کسی حال پر قرار نہیں لینے دیتی۔ اور اُس کی ہوس کسی طرح پوری ہونے کو نہیں آتی۔ جس کے نتیجے میں اُس نے کیا دی۔ مکاری۔ اور خونخواری و مردم رسانی میں سب سے زیادہ ترقی کر لی ہے۔ جبکہ ساری مخلوق کا یہ طریقہ ہے کہ بے وجہ دوسروں کی آزادی معاشرت میں کوئی فرق نہیں ڈالتا۔ انسان بجائے اس کے کہ اپنی حالت درست کرے خواہ مخواہ اوروں کے معاملات میں دخل دیتا

اُن کو ستاتا - اُن کی زندگی تلخ کرتا - اور اپنے ذلیل نفع کے لیے اُن کی جان لیتا ہے -

اگرچہ ساری مخلوق مین خدا نے یہ شان پیدا کر دی ہے کہ ایک ایک کو کھائے جاتا ہے - خلاق عالم نے ہر ایک کو غذا حاصل کرنے پر مجبور کر دیا ہے - اور اسی بہانے خداوند جل وعلا نے ایک مخلوق کو دوسرے کے فنا کرنے کا آلہ بنا دیا ہے - فنا کرنے کا یہ قانون حجر و شجر تک مین جاری ہے - اس مین خدا کی بڑی بھاری مصلحت ہے - کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو قدرت کے اکھاڑے مین جو بازیگر آتے سامنے سے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتے - اور دوسرون کے لیے جگہ خالی نہ ہوتی - لہذا پیٹ بھرنے کے لیے اگر انسان بھی قدرت کے اس عام باورچی خانے سے اپنا نکمی وظیفہ حاصل کر لیتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا - مگر وہ اس حد سے تجاوز کر کے محض شوق و تفنن کے لیے ہر مخلوق کے ذوعی عالم مین دخل دیتا اور بے ضرورت مخلوقات پر ظلم کرتا ہے - وہ اپنے پاؤن بیکار کر کے جانورون سے سواری لیتا ہے - اپنا بدن ڈھانکنے کے لیے جانورون کا اون کاٹتا - اُن کے پر نوچتا - اور اُن کی کھال کھینچتا ہے -

ان چیزون کو اگر ترقی کہا جائے تو ترقی مین چاہے اعلیٰ درجے کی نفس پروری ہوتی ہو مگر وہ نہایت ہی شرمناک چیز ہے - خود انسانون مین جو اعلیٰ درجے کے واجب الاحترام بزرگ ہین وہ بھی انسان کی ان حرکتون اور اُس کی اس دست بُرد کو بُرا سمجھتے ہین -

اُن کے نزدیک فضیلت و شرافت یہ ہے کہ انسان ایک بے ضرر وبے آزار زندگی بسر کرے - اُس کے ہاتھ سے کسی کو نقصان نہ پہونچے - بجاے دوسرون کے معاملات مین پڑنے کے وہ اپنی فکر رکھے - اپنے اخلاق درست کرے - اور خدا کو نہ بھولے - جب خود انسان کے مدوّنہ علم اخلاق کا یہی اصول باعثِ شرافتِ نفس و فضیلت ہے تو سچ یہ ہے کہ شرافت مین انسان من حیث المجموع سب سے بدتر ہے - اور جانور قطعاً اُس سے زیادہ شریف و افضل ہین

چلتے پھرتے باغ و مکان

ستمبر ۱۹۱۷ء

خدا کی عجیب و غریب قدرت کا ایک یہ بھی نمونہ ہے جو ہمارے لیے حد سے زیادہ حیرت انگیز ہو سکتا ہے کہ دریاؤن اور جھیلون مین پانی کی سطح پر تیرتے اور بہتے قطعات زمین بن جاتے ہین - اور وہ اس قابل ہوتے ہین کہ اُن پر باغ لگائے جائین - کھیت بوئے جائین - اور شاداب تر کاریان پیدا کی جائین -

ہمارے ہندوستان مین جا بجا گنگا مین زمین کے بڑے بڑے تختے سطح آب پر پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتے ہوئے دیکھے جاتے ہین - مگر یہ عموماً انسانون کے بنائے ہوئے نہین بلکہ خود قدرت الٰہی کی صنعت ہوتے ہین - یہ تختے درختون کی جڑون - لکڑی کے ٹکڑون - اور سوار وغیرہ کے باہم مل اور جڑ جانے سے بن جاتے ہین - اور جب تیار ہو چکتے ہین تو سیلاب مین پانی کا زور اُنھین کنارے سے بہا کے بہا لاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ دریا کے آغوش مین ایک شاداب اور فرحت بخش مرغزار بہتا چلا جاتا ہے - ان مین سے بعض پر اکثر بڑے بڑے پیڑ بھی دیکھے جاتے ہین - اور اُن کو چلتے پھرتے دیکھ کے عقل انسانی چکر مین آ جاتی ہے -

انگلستان کی جھیلون مین بھی دو ایک جھیلین ایسی ہین جن کی سطح پر اسی قسم کے قطعاے زمین پانی مین سدا بہار باغ لگانے کے لیے پیدا ہو گئے ہین - اور اس سے بھی زیادہ لطف و حیرت کی یہ بات ہے کہ وہان کی جھیل "ڈرونٹ واٹر" مین جو ایسا ہی ایک مصنوعی تختہ زمین ہے اُس کے آغوش مین ایک اور جزیرہ بھی پیدا ہو گیا ہے -

مملکت پروشیا (جرمنی) مین ایک "جھیل باغ" ہے - اُس کی سطح آب پر بہت سے بڑے تیرنے والے اور چلتے پھرتے جزیرے ہین - اور ایسی ہی ایک جھیل مین ایسے مضبوط قطعات زمین بن گئے ہین جن پر اچھے اور نفیس جھاڑ اور درخت لگائے جاتے ہین - اسپین والون نے جب امریکہ کو فتح کیا ہے تو

میکسیکو کی جھیل میں بھی تیرتے اور چلتے پھرتے باغ دیکھے تھے۔

شمالی و مغربی ہند یعنی کشمیر میں اور تبت و ایران کی سرحد پر لوگ اپنی جھیلوں میں خود ہی ایسے جزیرے اور قطعات زمین بنا لیا کرتے ہیں جن پر وہ باغ لگاتے ہیں۔ اور تربوزوں۔ اور خربوزوں۔ کھیروں۔ ککڑیوں اور دیگر بقولات کے جو مرطوب زمین چاہتے ہوں بڑے بڑے کھیت تیار کرتے ہیں۔ جن کی نسبت اختیار رہتا ہے کہ جب تک چاہیں کسی جگہ قائم رکھیں اور جب چاہیں کسی اور مقام پر ہٹا لے جائیں۔ یہاں کوئی کسی سے کہے کہ فلاں شخص کے کھیت کو چور چرا لے گئے تو تم اُسے مجنون و فاتر العقل کہو گے۔ مگر وہاں یہی تمہارے خیال کے خلاف فطرت واقعات روز پیش آیا کرتے ہیں۔ اور اکثر کھیتوں کی چوریاں ہوتی رہتی ہیں۔ یعنی مالک کو غافل پا کے لوگ اُس کے کھیت کھین اور کھینچ لے جاتے ہیں یا اپنے کھیت میں ملا لیتے ہیں۔ کشمیر میں اس قسم کے تختوں پر جہاں باغ ہو گیا ہے اور پھول کھلے ہیں وہاں کی بہار سارے مناظر قدرت کو مات کر دیتی ہے۔

یہ تختہ ہائے زمین بہت پتلے۔ سُبک اور نازک ہوتے ہیں۔ اور اُن کا دَل کہیں شاذ و نادر ہی ایک فٹ سے زیادہ ہوتا ہے۔ اصلی چیز جس پر اُن تختوں کی بنیاد قائم کی جاتی ہے۔ درختوں کی ٹہنیاں۔ لکڑی کے ٹکڑے ہیں جن کو ہموار بُن کے جوڑ دیتے ہیں۔ پھر اُس پر چٹائیاں بچھا کے تھوڑی تھوڑی مٹی ڈال دی جاتی ہے۔ اور اُس میں تخم پاشی ہوتی ہے۔

مگر ان سب چیزوں سے زیادہ حیرتناک ملک سیام کے چلتے پھرتے گاؤں ہیں۔ جن کے بنانے میں دار السلطنت سیام بنکوک کے لوگ ساری دنیا سے سبقت لے گئے ہیں۔ وہ لوگ سیلاب سے بچنے اور پانی کے ضرر سے محفوظ رہ کے آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لیے ایسے مکان بناتے ہیں جو پانی پر تیرتے اور چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ ان مکانوں کو برابر برابر جما کے اور لنگروں کے ذریعے سے ایک جگہ قائم کر کے وہ بڑی بڑی بستیاں بنا لیتے ہیں جن کے بیچ میں پانی کی کشادہ سڑکیں ہوتی ہیں۔ اور پانی اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اُن آبی سڑکوں میں

بڑے بڑے سو ٹن کا بوجھ لیجانے والے جہاز گذرتے رہتے ہیں۔ ان بستیوں کی وضع و قطع بدلنے کا اُنھیں اختیار رہتا ہے۔ مکان کا رُخ جدھر چاہیں پھیر سکتے ہیں اور یہ اُن کے بس کی بات ہے کہ جب چاہیں اپنے اس بحری گاؤں کی وضع و صورت بدل دیں۔ اُن کے یہ مکان علی العموم بانس کی کھپاچوں۔ ٹہنیوں۔ اور کھجور کے درختوں سے بنتے ہیں اور نہایت ہی سُبک اور خوشنما ہوتے ہیں۔ جن میں سامنے کے رُخ پر عموماً ایک برآمدہ ہوتا ہے۔ جس سے کشتیاں اور جہاز آ کے لگ جاتے ہیں اور اُن کے ذریعہ سے بآسانی ہر حصۂ آبادی اور ہر سڑک کی سیر ہو سکتی ہے۔ اور وہی ذریعۂ آمد و رفت ہوا کرتے ہیں۔

اٹلی میں شہر وینس کی بڑی تعریف کی جاتی ہے کہ سمندر کو شہر کے اندر کاٹ لائے ہیں۔ اور پانی کی نہریں سڑکوں کا کام دیتی ہیں جن میں کشتیوں کے ذریعے سے آمد و رفت ہوتی ہے۔ مگر جو خوبی سیام کی اِن چلتی پھرتی بستیوں میں ہے وینس کو بھلا کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ وینس کی جو وضع ہے نہیں بدل سکتی۔ اس لیے کہ پانی کی سڑکوں کے کنارے دونوں جانب پختہ عمارتیں ہیں۔ بخلاف اس کے سیام کی بستیوں میں یہ صفت ہے کہ جس گاؤں کو جہاں اور جتنی دور چاہیں لے جا کے قائم کر دیں۔ اور جب ایک وضع کی آبادی سے دل اُکتائے بدل کے دوسری وضع کر دیں۔ جس کسی کا جب تک جی چاہے ایک جگہ رہے اور جب چاہے مکان کے دوسرے محلے اور دوسرے احباب کے جوار میں چلا جائے۔

ایشیا۔ تجھ میں سب طرح کے کمال ہیں۔ سارے مذہب۔ سارے تمدن۔ اور ساری صنعتیں تجھ سے نکلی ہیں۔ مگر یورپ کی زبردستیوں نے ترے سارے کمالات پر خاک ڈال دی۔ اور اسی ناقدری کا نتیجہ ہوم رول کی تمنا و آرزو ہے۔

حمام کی تاریخ

انگریزی میں حمام کو "باتھ" کہتے ہیں جسکے لغوی معنی غسل یا نہانے کے ہیں اس وجہ سے وہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ جسم انسان کے گرد و پیش معمولی اوقات کے بعد اب گرمی یا سردی ہوا کی ہو اسکے خلاف کسی جگہ زیادہ سبب کی گرمی یا تری اُسکے جسم پر اثر ڈالنے کیلیے پیدا کیجائے

تو وہ مقام "حمام" ہے۔ گر ہمارے یہاں صرف اُسی مقام کو حمام کہنا چاہیے جہاں کی فضا معمول سے زیادہ گرم کر دی گئی ہو۔ اگرچہ اُسی مکان میں گرمیوں کے موسم میں کبھی لوگ ٹھنڈے پانی سے بھی نہا لیا کرتے ہوں۔

دراصل حمام اُس عمارت کا نام ہے جس میں پانی کے حوض کے نیچے آگ جلا کے حوض کا پانی خوب گرم کیا جائے۔ پھر اُس پانی سے جو بخارات اُٹھیں اُن کو دروازے اور باہر کے منافذ بند کر کے محفوظ کیا جائے۔ اور مکان کی فضا ادھر جس درجے تک ضرورت ہو گرم کر دی جائے۔ اُس میں ایک ٹھنڈا حوض رکھنا بھی لازم ہے تاکہ جب پانی بہت زیادہ گرم ہو جائے تو اُس کو جس درجے تک مناسب ہو سمو کے معتدل کر دیا جائے۔

اس میں نہانے کے طریقے بھی مختلف ہیں۔ کہیں لوگ حوض میں اتر کے غوطہ لگاتے ہیں۔ کہیں حوض سے لوٹے میں پانی لے کے بدن پر ڈالتے ہیں۔ اور بعض جگہ چھت پر لگے ہوئے فواروں اور ہزاروں سے مینہ کی طرح اپنے اوپر پانی برساتے ہیں۔

نہانے کا آغاز تو اُسی وقت سے دنیا میں ہو گیا ہو گا جب انسان پیدا ہوا اور اُسے صفائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن مذکورۂ بالا خاص شان کے گرم حماموں کا آغاز غالباً بابل اور مصر میں ہی ہوا ہو گا جہاں تمدن انسانی سب سے پہلے ترقی کر گیا تھا۔ مگر یورپ میں یونان کے پہلے شاعر ہومر کے زمانے تک گرم حماموں کا پتہ لگتا ہے۔ جو حضرت سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ۱۴۲۷ سال پیشتر کا زمانہ تھا۔

اُس کے بعد یونانیوں میں ایسے گرم حمام کثرت سے بن گئے جو یا تو امرا کے گھروں میں تھے اور خاص اُن اور اُن کے احباب کے غسل کرنے کے لیے مخصوص تھے۔ اور یا عام لوگوں کے نہانے کی غرض سے تھے۔ لیکن اس کا پتہ لگانا دشوار ہے کہ یونانیوں کے وہ حمام کس وضع قطع کے تھے۔ اُن میں گرمی کس درجے تک بڑھائی جا سکتی تھی اور کیونکر بڑھائی جاتی تھی۔ اور نہانے کے کیا کیا مدارج اور طریقے تھے۔ زیادہ تفتیش سے اُنکے حماموں کے متعلق فقط

اس قدر معلوم ہو سکا ہے کہ اُن کے جو حمام عوام کے لیے تھے وہ علی العموم "جمنے شیہ" یعنی ورزش خانوں اور اکھاڑوں سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ اور ورزش کرنے کے بعد فوراً اُن میں جا کے وہ لوگ گرم پانی سے نہایا کرتے تھے۔

یونانیوں کے بعد رومیوں کا زمانہ شروع ہوا تو ابتداءً اُنھوں نے وہی یونانیوں کی وضع کے حمام اپنے وہاں بنوائے۔ پہلے پہل رومیوں میں حماموں کو زیادہ اہمیت نہ تھی۔ یہاں تک کہ آگسٹس قیصر کا زمانہ آیا۔ اور اُس کے شوق نے حماموں کو غیر معمولی اہمیت دے کے اُن میں شاہانہ شوکت و رونق پیدا کر دی۔ رومی حماموں کو "تھرمہ" کہتے تھے۔ جس کے معنے گرم غسل خانے کے ہیں۔ اور اُس کا صحیح ترجمہ ہمارا عربی لفظ "حمام" ہے گو کہ رومیوں میں ہمارے یہاں کی طرح ٹھنڈے حمام بھی تھے۔

رومی امرا اور قیصروں کی شوقینی کا آخر یہ انجام ہوا کہ دولتہ الکبریٰ کے تمام محلوں میں کثرت سے عالیشان حمام تیار ہو گئے۔ مختلف مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اکیلے شہر روما میں آٹھ سو سے زیادہ ہی حمام تھے۔ جن میں زیادہ مشہور و معروف حمام اگریپا۔ حمام انطونیوس۔ حمام قراقلا۔ حمام دیوقلی طین۔ حمام نیرو۔ اور حمام طیطوس تھے۔ دیوقلیطین میں کہتے ہیں کہ ۱۰۰۰ آدمیوں کے نہانے کے چبوترے تھے۔ اور اُن کی عظمت و رونق اور آراستگی و زیبایش کے جو افسانے بیان کیے جاتے ہیں حیرت انگیز ہیں۔ جن رومی حماموں کے منہدم آثار آج باقی ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ عمارتیں جب اپنی اصلی حالت پر قائم ہوں گی تو کیسی شاندار ہوں گی۔ اور یقین آ جاتا ہے کہ اُنکی نسبت جو کچھ کہا جاتا ہے بالکل سچ ہے۔

رومیوں میں حمام کرنے کا وقت علی العموم گرمیوں میں دن کو دو بجے اور جاڑوں میں تین بجے تھا۔ اور اُن میں نہانے کا طریقہ تھا کہ حمام میں داخل ہونے کے بعد کپڑے اُتار رکھتے ہی کوئی عام قسم کا گاڑھا اور سستا تیل سارے بدن میں لگا دیا جاتا۔ اس کے بعد وہ افارسٹوئیم میں داخل ہوتے۔ افارسٹوئیم ایک بڑے ہال کا نام تھا جس میں ہر طرح کی ورزشوں کا سامان موجود رہتا۔ وہاں

وہ خوب ورزش کرتے یہان تک کہ خوب پسینہ آجاتا۔ جو ورزش زیادہ عام تھی یہ تھی کہ بھاری فولادی گولون کو اُٹھاتا اور مختلف طریقون سے گھمایا جاتا تھا۔

جی بھر کے ورزش کرنے کے بعد وہ ایک دوسرے گرم کمرے مین جاتے جو کالڈیریم کہلاتا۔ اور اُس مین خوب تیز گرمی ہوتی۔ یہان بینگ اور دھات کے جھانوؤن سے خوب رگڑ رگڑ کے بدن دھویا جاتا۔ خوب نہا دھو لینے کے بعد یہان اُنکے پنڈے مین ایک لطیف خوشبودار تیل لگایا جاتا۔ جس کے بعد وہ ٹیپی ڈوریم مین داخل ہوتے۔ یہ وہ کمرہ تھا جس مین نہانے کے کمرے کے مقابل خفیف درجے کی گرمی ہوتی۔ تھوڑی دیر وہان توقف کرکے وہ فرجی ڈاریم مین جاتے جو ٹھنڈا کمرہ ہوتا تھا۔ اور اُس ٹھنڈے کمرے مین آنے کی ضرورت یہ ہوتی کہ کالڈیریم کی سخت گرمی کے بعد ایک ٹھنڈے مقام مین ٹھہر کے جسم مین کھلی فضا اور باہر کی ہوا مین آنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

یہ تھا رومی حمام جس کا رومیون کو اس قدر شوق تھا کہ جس سرزمین پر جاتے انھون نے قیام کیا اسی قسم کے پبلک حمام بھی وہان اُنھون نے تعمیر کرلیے۔ گرم چشمون سے فائدہ اُٹھایا اور اُنکے پانی کو حمام مین پہونچایا۔ چنانچہ مغربی انگلستان مین شہر باتھ (حمام) رومیون کے اس مذاق کی یادگار آج تک موجود ہے۔

رومیون کے زوال کے بعد قرون وسطیٰ مین یورپ پر مسیحی مقتداؤن کا اثر تھا اور اُنھین طہارت اور نہانے اور دھونے سے اس قدر نفرت تھی کہ رومیون کے بنائے ہوے تمام حمام منہدم ہوگئے۔ اور جن لوگون کو اُس پر فخر و ناز ہو کہ ہمارے پنڈے مین عمر بھر پانی نہین لگا اُن کے زمانے مین اگلے حمامون کے باقی رہنے اور کسی نئے حمام کے تعمیر ہونے کی کیا اُمید ہوسکتی تھی؟ چند ہی روز مین اہل ملک حمام اور اُس کے لطف کو بھول گئے۔ اور اُسکے ساتھ ہی طہارت و نجاست کا امتیاز بھی اُٹھ گیا۔ اور یورپ کی پبلک مین وہ تمام عیوب پیدا ہوگئے جو صفائی اور طہارت کا خیال نہ ہونے کے لازمی نتائج ہین۔ حتیٰ کہ پیشاب پاخانے کے بعد بھی دھونے کی ضرورت نہ باقی رہی۔ اگرچہ اب بہت سے ہندوستانی نجس رہنے مین یورپ کی تقلید کرنے لگے ہیں مگر وہ ننگ وطن ہین۔ اور اس نجس رہنے پر

انھین تو شرم نہین آتی مگر ہم بجائے خود اُن کے عوض شرما لیا کرتے ہین۔

رومیون کے بعد سرزمین عرب سے نیّر اسلام طلوع ہوا۔ اور عرب عَلمِ توحید کندھے پر رکھ کے افریقہ سے ہوتے ہوے یورپ پہونچے۔ ان موحدون کے نزدیک نہانا اور وضو کرنا خدا کی عبادت کے لیے لازمی تھا۔ اسی قدر نہین جنابت کی حالت مین اُنھین بغیر نہائے ایک گھڑی بسر کرنا بھی دشوار تھا۔ اُن کو غسل و وضو کرتے اور گھڑی بھر کے لیے بھی نجاست کو نہ برداشت کرسکتے دیکھ کر تعصب نے مسیحیون کو یقین دلایا کہ نہانا دھونا اور بدن کو پانی مین بھگونا ایمانداری کے خلاف اور کافرون (مسلمانون) کا کام ہے۔ دیندار مسیحیون کو ان باتون سے کیا غرض؟ بہرحال مسیحیون کو طہارت کرنے اور نجاست دُور کرنے سے روز بروز نفرت و مخالفت ہوتی گئی۔ اور نہانے دھونے کا جو کچھ سامان اگلے رومیون کا مہیا کیا ہوا باقی تھا سب ان کے ہاتھون فنا ہوگیا۔ جس کا عجیب نتیجہ آج یہ نظر آرہا ہے کہ اسی سرزمین (یورپ) مین جہان رومیون نے گاؤن گاؤن مین حمام بنائے تھے آج اگر ایک آدھ حمام عجائبات قدرت کے نمونے کے طور پر بنا بھی لیا گیا ہے تو اپنی چیز نہین بلکہ "ٹرکش حمام" یعنی ترکون اور مسلمانون کی چیز کہا جاتا ہے۔

مسلمانون کو تمدن و دولت حاصل کرتے ہی اپنی طہارت اور صفائی کی ضرورتون کے لحاظ سے حمام ایک نعمت غیر مترقبہ نظر آیا۔ اُنھون نے فوراً اُسے اختیار کرلیا۔ اور جہان جہان عرب جاکے آباد ہوے یا دین اسلام پہونچا ہزارون حمام تعمیر ہوگئے۔ اسی قدر نہین اُنھون نے اپنے حمامون مین رومی حمام سے بھی زیادہ ترقی کی۔ چنانچہ فی الحال دنیا کے تمام باعظمت و شاندار حمام مسلمانون کے بنائے ہوے ہین۔

اہل اسلام کے حمامون مین سے وہ ورزش خانہ نکل گیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ سپہگری کے فنون اور اسلحۂ جنگ کی ورزشون کا جداگانہ مستقل انتظام ہوگیا۔ اور یہ چیزین کبھی کبھی کے لیے نہین بلکہ روزانہ تعلیم مین داخل ہوگئین۔ ان اسلامی حمامون مین پہلے انسان ایک کمرے مین داخل ہوتا ہے جس کی گرمی اس قدر معتدل

ہوتی ہے کہ ناگوار نہین گزرتی - اور کوئی مضر اثر نہین ڈال سکتی - وہان کپڑے اُتار
کے اور ایک مناسب زمانے تک ٹھہر کے انسان ایک اور کمرے مین جاتا ہے جو
پہلے کمرے سے زیادہ اور نہانے کے کمرے سے کم گرم ہوتا ہے - یہان بھی تھوڑی
دیر ٹھہر کے وہ اُس کمرے مین جاتا ہے جہان نہاتا ہے - جہان تک پہونچتے پہونچتے
خوب پسینہ آجاتا ہے - میل چھوٹنے کے لیے خوب پھول جاتی ہے - اب حمامی ایک
چوکی پر بٹھا کے تمام جسم پر تیز گرم پانی ڈال دیتا ہے - پھر کیسے سے خوب مل مل کے
میل چھڑاتا ہے اور بدن کو صاف کرتا ہے - بالون کو بیسن یا کھلی یا کسی اور چیز
سے مل کے دھوتا ہے - اسکے بعد وہ مختلف پیچون اور طریقون سے ہڈیون کے
جوڑون کو کھینچتا ہے اور ایسی اچھی دلک کرتا ہے کہ نہایت آرام ملتا ہے - اور معلوم
ہوتا ہے کہ سارے اعضا نرم پڑگئے - تھکن اور سستی دور ہوگئی اور ہاتھ پاؤن کھل
گئے - اس کے بعد جسم پر خوب پانی بہاکے اور بخوبی طہارت کرکے انسان لنگی بدل
کے حسب ترتیب اُنھین کمرون سے گزرتا ہے جن مین سے ہوکے گیا تھا - اور آخری
کمرے مین دم بھر ٹھہر کے اور کپڑے پہن کے اپنے گھر چلا آتا ہے -

تدریجی کمرون کی وجہ سے انسان آخری کمرے مین اُس درجے تک کی
حرارت کو برداشت کر لیتا ہے کہ اگر براہ راست نہانے کے کمرے مین چلا جائے تو
وہان کی حرارت اُس کے لیے اس قدر ناقابل برداشت ہو کہ ضرر پہونچا دے -
ترکی حمامون مین پتھرون پر گرم پانی چھڑک چھڑک کے نہانے کی کمرے کی حرارت
۱۴۰ درجے تک پہونچا دی جاتی ہے -

حمام اگرچہ سرد ممالک اور ہمارے یہان بھی جاڑون مین نہایت لطف کی
چیز ہے اور اُن سے اطبا نے اپنے فن مین بھی بہت فائدہ اُٹھایا ہے مگر اُسکے
ساتھ نہایت ہی خطرناک چیز بھی ہین - اگر حرارت اعتدال سے تجاوز کرجائے
تو جان کا خطرہ ہے - چنانچہ اگلی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد بادشاہون
اور بہت سے امیرون کی جانین حمامیون سے سازش کرکے حمام ہی کے ذریعے
سے لی گئی ہین -

———— ⁂ ————

رقص موریق

یورپ کا ایک خاص قسم کا ناچ ہے جس مین ناچتے وقت پاؤن مین گھنگرو
باندھ لیے جاتے ہین - ہندوستان مین ناچ مین علی العموم گھنگرو باندھنے کا رواج
ہے - یہان ناچ مین گھنگرو باندھنا لازمی ہے - مگر [illegible] ایسا نہین کرتے - بلکہ اُنکے
وہان جس ناچ مین گھونگھرو باندھے جائین وہ ناچ رقص موریق کہلاتا ہے - اور
اُن کا خیال ہے کہ اسکے موجد خاص عرب ہین جن کی صحبت سے پہلے اسپین والون
نے سیکھا - اور اُن سے سارے یورپ نے تعلیم پائی -

اس رقص مین خصوصیت یہ ہے کہ گھونگھرو کی آواز تال سُر کے موافق رہتی ہے
اور اُنکے نغمے کی دلکشی اور اُنکے بجنے کی مناسب ترتیب حاضرین محفل کو لطف
دیتی ہے - اگرچہ ممالک یورپ مین تو اب اس رقص کا رواج بہت کم ہوگیا ہے
مگر اسپین مین آج تک باقی ہے اور "فنڈانگو" کہلاتا ہے -

غور طلب یہ امر ہے کہ محققین یورپ پاؤن مین گھونگھرو باندھ کے ناچنے کو
مسلمانون کی ایجاد بتاتے ہین - مگر ہمین اس کا رواج ایشیا بلکہ تمام مشرقی ممالک
مین اس کثرت سے نظر آتا ہے خصوصاً ہندوستان کے قدیم فن رقص مین اس قدر
ضروری مانا جاتا ہے کہ اسکی ایجاد کو عربون سے منسوب کرنا بعید از قیاس معلوم
معلوم ہوتا ہے - ہندوستان کی روایتین بتا رہی ہین کہ رقص خاص دیوتاؤن
سے اور دیوتاؤن کی پرستش سے شروع ہوا - اور اُس قدیم ترین زمانہ سے
آج تک اُسی حال پر چلا آتا ہے - جس مین غالباً گھونگھرو باندھ لینا اسی زمانے
سے ہی ہوگا -

ہندوستان کی موسیقی کی نسبت بھی پہلے سے ہمارا یہی خیال تھا کہ موجودہ
موسیقی وہی ہے جو ہندوون کے قدیم عہد مین موجود تھی - مگر بعد کی تحقیقات سے
ثابت ہوا کہ ہندی موسیقی خالص ہندو موسیقی نہین ہے بلکہ اُس مین بہت بڑا
حصہ عربون کی موسیقی کا مل گیا ہے - اسی طرح ممکن ہے کہ رقص مین بھی گھونگھرو
باندھنے کا رواج مسلمانون کے آنے سے پہلے نہ ہو - اور اس جزو کو یہان کے

ناچ مین مسلمانون ہی نے اضافہ کیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مسلمانون سے ہندون
نے سیکھا ہو۔

دنیا مین ناول نویسی کی ابتدا

ناولون اور ناول نویسی کو فی الحال ہم نے اہل یورپ سے لیا ہے۔
مگر تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ہماری قدیم امانت ہے جس کو ہم ان امانت داران مغرب
سے واپس لے رہے ہین۔ ناول کا آغاز خیالی اور طبعزاد قصوں سے ہے
جو ابتداءً محض داستان گوئی کی شان سے قلمبند کر لیے گئے۔ اسکے بعد یہ ترقی
ہوئی کہ محض خیال آفرینی چھوڑ کے تاریخی واقعات مین رنگ آمیزی کر کے
دلچسپ داستانون کی شان پیدا کی گئی۔ اسکے بعد ناول کی ترقی کا تیسرا درجہ
یہ تھا کہ انسانی زندگی کے واقعات نئے نئے اسلوب سے دکھائے جائین اور
اُنکے ذریعے سے معاشرت و اصلاحِ زندگی کا سبق دیا جائے۔

مشرق مین سب سے پہلا متمدن ملک مصر ہے۔ اور مصر والون ہی سے
قصہ نویسی کا آغاز بھی ثابت ہوتا ہے۔ فراعنۂ مصر کے قدیم عہد کا لکھا ہوا ایک
قصہ جو آج سے کچھ اوپر تین ہزار سال پیشتر لکھا گیا تھا ایک پاپائرس (مصرون کا
پُرانا مکتوب نما کاغذ جو ایک درخت کی لکڑی کے ورق اُتار کے بنایا جاتا تھا)
پر لکھا ہے لندن کے عجائب خانہ "برٹش میوزیم" مین موجود ہے۔ اسکے مختلف اجزا
الگ الگ لیے گئے تھے۔ مگر اُسکا مکمل ترجمہ سب سے پہلے مشہور جرمنی محقق علوم
مصریہ ڈاکٹر بروغش نے جرمنی زبان میں کیا۔ جو ۱۸۶۳ء مین شایع ہوا تھا۔ اس
قصے کو دربار شاہی مصر کے ایک وقائع نگار نے فرعون مصر "رامیس ثانی" کے فرزند
اور ولیعہد "ستی منی فاتہ" کے تفنن طبع کے لیے لکھا تھا۔

اس قصے کے رنگ عبارت اور اُسکے مذاق ادبی کی نسبت جرمنی مصنف
"مسٹر ایا نوئیل دیوخ" لکھتے ہین کہ عبارت سادی اور صاف ہے۔ اور گو کہ شاعرانہ
تخئیل سے خالی نہین مگر اس پر بھی سادی اور سلجھی ہوئی ہے۔ اس کی عبارت بھی
اُسی رنگ کا نمونہ ہے جو قدیم الہامی کتابون خصوصاً توراۃ مین پایا جاتا ہے۔ اس

بےحد صفائی اور سادگی ہے:

اس قدیم مصری قصے کا خاکہ یہ ہے کہ دو بھائی ہین۔ بڑے بھائی کی جورو
چھوٹے کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو پوطیفار (عزیز مصر) کی بیوی زلیخا نے
حضرت یوسف کے ساتھ کیا تھا۔ چنانچہ وہ اُسے اپنے شوہر کی نظر مین ملزم و مجرم
ثابت کر دیتی ہے۔ آخر چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے خوف سے گھر چھوڑ کے بھاگتا
اور سورج دیوتا کی مدد سے انسانی پیکر چھوڑ کے ایک عجیب قسم کے نئے پیکر کو اختیار
کر لیتا ہے۔ اب اصلی واقعہ بڑے بھائی پر کھلتا ہے۔ اُس کی مکار جورو اپنے
کیفر کردار کو پہونچتی ہے۔ جس کے بعد چھوٹا بھائی پھر انسانی صورت اختیار
کرتا ہے۔ اور دونون بھائی الفت و محبت سے ملتے ہین۔ بڑا بھائی چھوٹے کی
قدر اور چھوٹا بڑے کا احترام کرتا ہے۔ اور انجام یہ ہوا کہ بڑا بھائی ترقی کر کے
عزیز مصر ہو گیا۔

اس مصری قصے کے سوا یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ ایران و عرب اور دیگر
ممالک مشرق مین بہت قدیم زمانے سے خیالی اور طبعزاد قصون کا عام رواج
چلا آتا تھا۔ اُنھین سے یونانیون نے قصہ خوانی و قصہ نویسی سیکھی۔ پھر یونانیون
سے اس مذاق کو اہل روم نے حاصل کیا۔ چنانچہ سب سے پہلے لاطینی مین
رومیون نے یونان کی داستان ہاے "ارسٹائڈیز" کا ترجمہ نہایت اہتمام سے
کیا۔ اور یہ ترجمہ اُس عہد مین ہوا جب رومیون مین عنان حکومت ہاتھ مین لینے
کے لیے باہمی خونریزی ہو رہی تھی۔ اور ماریوس اور سیلا ایک دوسرے کے
خون کے پیاسے تھے۔ رومیون نے اس قصے کو بہت پسند کیا۔ اور ان مین
ہی افسانہ نویسی و قصہ خوانی کا رواج ترقی کرنے لگا۔

مسلمانون نے اپنے عہد مین افسانہ نویسی کو کسی اور قوم سے نہین لیا۔ اس
لیے کہ خود ان مین داستان گوئی کا حد سے زیادہ رواج تھا۔ اور عہد جاہلیت
سے اُن مین داستان گوئی کی محفلین مرتب ہوا کرتی تھین۔ عرب کے اکثر قصون
کا مجموعہ "الف لیلہ" ہے جو دنیا کے سارے افسانون سے زیادہ پسندیدہ اور
تمام ملک مین رواج پا چکی ہے۔ الف لیلہ کے اصلی مصنف یا مولف کا

نام کسی کو نہیں معلوم۔ مگر کہا جاتا ہے کہ فارسی کے قصہ "ہزار افسانہ" سے ماخوذ ہے
جو ساسانیوں کے عہد میں ایران میں مروج اور اہل عجم کو بہت پسند تھا۔ لیکن
اگر یہ صحیح بھی ہے تو عربوں نے اُسے اس خوبی کے ساتھ لیا کہ اُس میں عجمی معاشرت
کا نام بھی نہیں خالص عربی معاشرت اور خلفائے عباسیۂ بغداد کی اعلیٰ ترین معاشرت
کا نمونہ ہے۔ مگر کمال یہ ہے کہ اسکے مختلف قصوں میں ایسے ایسے عجیب اور جدید
واقعات زندگی دکھائے گئے ہیں کہ باوجود عربی معاشرت ہونے کے ہر قوم او
ہر زبان میں جا کے تمام افسانوں سے زیادہ دلچسپ ثابت ہو جاتی ہے۔

انگریزی ناولوں کا آغاز رومیوں کے ترجموں سے ہوا۔ جن سے انگلستان
کے بہت سے قدیم ترین اور اعلیٰ ترین مصنفین ڈراما نے اپنی تصانیف کے لیے
مختلف قصوں کے خاکے لیے ہیں۔ مگر یہ عموماً رومیوں کی عام پسند۔ بامذاق او
مضحک کاڈیوں سے ماخوذ تھے۔

انھیں طبعزاد خیالی قصوں سے تاریخی ناولوں کا آغاز ہوا۔ کسی عشق یا
جنگ کے واقعہ کو گھٹا بڑھا کے ایسی رنگین عبارت میں لکھا جاتا کہ قصہ سے
زیادہ لطف تاریخ میں پیدا ہو جاتا۔

ملکہ الزبتھ کے عہد میں اسپین کے ناول ترجمہ ہوئے جن کا ماخذ عربی ق
تھا۔ ان کا پہلا مترجم "جان لیلیا" تھا۔ جس کی عبارت میں کسی قسم کی رنگینی
یا عبارت آرائی نہ تھی۔

سترہویں صدی کے وسط میں "مسز افرابین" نے یہ جدید طریقہ اختیار کیا
کہ افسانوں میں انسان کی معاشرت اور گھریلو زندگی کے نئے نئے نمونے دکھا
جائیں۔ اور اسی عہد میں "مسز مین لے" نام ایک انگلش خاتون نے ا
ناولوں کے ذریعے سے اُس دور کی مروجہ اور پسندیدہ بدکاریوں کے نمونے
دکھائے۔ اور سارے مصنف اُسی رنگ کے پیرو ہو گئے۔

دہلی اور لکھنؤ کی اُردو

مدت دراز سے یہ جھگڑا چلا جاتا ہے جو کسی طرح طے نہیں ہوتا۔

وہی پرانے اعتراضات و شکوک ہیں جن کا بار بار اعادہ کیا جاتا ہے۔ دہلی والے
کہتے ہیں کہ لکھنؤ والوں نے اُردو میں عربی الفاظ اور فارسی بندشوں کو بے
احتیاطی سے بھر دیا۔ رعایت لفظی جگت اور قافیہ پیمائی میں پڑ گئے۔ لکھنؤ والے
کہتے ہیں کہ دہلی والوں کی زبان میں پنجابی مل گئی۔ وہاں کے لفظوں۔ وہاں کے
لہجے۔ اور وہاں کی ترکیبوں میں ناگوار سختی اور کرختگی ہے۔ اور فارسی و ہندی
جن کی آمیزش سے زبان اُردو بنی ہے اُن کے امتزاج نے تکمیل کا درجہ حاصل
نہیں کیا تھا اور خامی باقی تھی کہ دہلی اُجڑ گئی۔

لیکن یہ سب باتیں غلط ہیں۔ دہلی والوں کا اعتراض اگر صحیح بھی ہو تو
فارسی و عربی کے الفاظ کا بھرتی ہونا کسی غیر مانوس و ناآشنا زبان سے متاثر ہونا نہ تھا
عربی ملی ہوئی فارسی ہی کے آغوش میں اُردو پلی تھی۔ اسی زبان سے سبق لے لے
کے اُس نے اپنی حیثیت کذائی حاصل کی تھی اور اُردو شعرائے متقدمین اُسی
رجحان و شوق سے فارسی و عربی کے الفاظ کو اختیار کرتے چلے آئے تھے جس طریقے
سے کہ لکھنؤ والوں نے لیا۔ علیٰ ہذا القیاس رعایت لفظی اور مناسبات صوری و
معنوی کا لحاظ بھی شعرائے فارس و عرب کو ویسا ہی تھا جیسا کہ لکھنؤ میں سب کو
یا بعض لوگوں کو ہو گیا

دہلی کی زبان پر پنجابی کا اثر پڑنے کے بھی کوئی معنی نہیں۔ اہل لکھنؤ کو دہلی
کے جو الفاظ یا بندشیں اپنی زبان پر غیر مانوس معلوم ہوتی ہیں اُن کی نسبت عموماً
کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ پنجابی کا اثر ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لہجے اور بعض محاورے
پنجاب کی زبان سے ملتے ہوں اس لیے کہ پنجاب دہلی سے قریب ہے۔ مگر اُنکی
نسبت یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ پنجابی زبان کے اثر سے دہلی میں پیدا
ہوئے۔ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ دہلی سے پنجابی میں پیدا ہوئے۔ بعینہٖ اسی طرح
اہل دہلی کہہ سکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لکھنؤ کی اُردو پر پوربی بھاشا کا اثر پڑ گیا۔
اُردو ہی پر منحصر نہیں دنیا کی جو دو زبانیں ایک دوسرے کے قریب بولی
جاتی ہوں گی اُن کا اثر ایک دوسرے پر ضرور پڑا کرتا ہے۔ مگر یہ کہنا کہ اُس
اثر سے زبان بگڑی یا بنی یا ایک غیر موجہ اور فرضی چیز ہے۔ اسی طرح یہ بھی لغو

ہے کہ دہلی مین اُردو و ہندی کی آمیزش عمدہ اور مکمل مزاج نہین پیدا کرنے پائی تھی- اس لیے کہ اصلی اُردو کا کوئی صحیح معیار نہین قرار دیا جا سکتا-

اور لطف یہ ہے کہ لکھنؤ اور اہل دہلی کی زبان مین جو اختلاف ہے اُسکو تعلق نہ فارسی الفاظ کے زیادہ داخل ہونے سے ہے نہ پاس پڑوس کی زبانون سے اثر پذیر ہونے سے- بلکہ اصلی اختلاف چند الفاظ کی تذکیر و تانیث- چند محاورون اور دونون مقامات کے لہجے اور طرز ادا مین ہے- یہ چیزین دونو مابہ البحث شہرون کے خصوصیات مین سے ہین- جن کا محاکمہ نہ کسی عقلی اصول یا کسی مسئلہ علم معانی و بیان سے ہو سکتا ہے- اور نہ کسی ادبی استدلال سے-

واقعہ یہ ہے کہ اُردو زبان آگرے اور دہلی میں پیدا ہوئی اور وہین نشو و نما پا کے اُس نے اپنی موجودہ صورت پیدا کر لی- شجاع الدولہ آصف الدولہ اور سعادت علی خان کے زمانون مین دربار دہلی کی کمزوری و بے استطاعتی اور لکھنؤ کے نوابی دربار کی دولتمندی و قدردانی کی وجہ سے قریب قریب دہلی کے تمام صاحبان کمال عام اس سے کہ کسی فن اور کسی طبقے کے ہون لکھنؤ میں پہنچ آئے- اور جو چند دہلی مین پڑے رہ گئے وہ بھی لکھنؤ کو حسرت کی نظر سے دیکھتے تھے اس لیے کہ وطن مین محفلہاے شعر و سخن کا چراغ گُل ہو گیا تھا-

یہ جمگھٹا لکھنؤ مین جمع ہو گیا تو جب تک وہ صاحبان کمال زندہ رہے جو بذات خود دہلی سے آئے تھے یہ سمجھتے رہے کہ وہی دہلی کی سبھا اودھ مین آکے جم گئی ہے- مگر اُنکے مرنے کے بعد اُنکی اولاد نے دہلی کی غلامی سے آزاد ہونے کا دعوے کیا- اپنے وطنی اساتذہ کی شاگردی پر ناز کرنے لگے- اور چونکہ لکھنؤ کے ادبی و علمی اسکول کا بھی اثر پڑنے لگا- جسکو سب سے زیادہ قوت یون ملی کہ صرف و نحو معانی بیان عربی منطق و فلسفہ اور فقہ و اصول فقہ کی منفرد درس گاہ لکھنؤ تھا- لکھنؤ ہی نہین لکھنؤ کے بہت سے قصبات مثلاً بلگرام- سندیلہ گوپامئو- امیٹھی- وغیرہ بھی علم و فضل کی مستقل درس گاہین تھے- جہان شائقین علم اقطاع ہند سے کھنچ کے آتے اور برسون رہ کے کمال پیدا کرتے- یہ لوگ عربی علم و فن کے علاوہ اُردو کا ادبی مذاق اور سخندانی کا ذوق بھی اپنے

ساتھ لے جاتے- اور سچ یہ ہے کہ اُردو زبان گو کہ دہلی مین پیدا ہوئی مگر سارے ہندوستان مین اُس کی اشاعت لکھنؤ کے ذریعے سے ہوئی-

لکھنؤ کی اس ادبی خود سری نے ادب اُردو کے دو جداگانہ اسکول قائم کر دیے- ایک دہلی کا اور ایک لکھنؤ کا- اور سارا ہندوستان اُردو دانی مین ان دونون اسکولون پر بنٹ گیا- ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہین کہ ان دونون اثرون کی تقسیم بلحاظ جغرافیہ کیا ہے- شمالی ہند مین پنجاب سے لے کے بریلی تک دہلی کا اسکول مرکز زبان مانا جاتا ہے- لہذا اہل لاہور- میرٹھ- علی گڈھ- مراد آباد- بدایون- اٹاوہ- اور بریلی خالص دہلی کی زبان کے پیرو ہیں- شاہجہان پور سے لیکر کلکتہ تک لکھنؤ کی زبان کا اثر مانا جاتا ہے- اور وہان کے شعرا و زباندان لکھنؤ کی زبان کے پیرو ہین- چنانچہ شاہجہانپور- کانپور- جون پور- فیض آباد گورکھپور- بنارس- اعظم گڈھ- غازیپور- پٹنہ- عظیم آباد- مرشد آباد- ڈھاکہ کلکتہ- ان سب مقامات کے لوگ لکھنؤ کی زبان کو دہلی پر ترجیح دیتے ہین-

رہا جنوبی ہند وہان کے لوگون کا کوئی عام مذاق یا رجحان نہین ہے بلکہ جس سوسائٹی مین جس شہر کا اُستاد اپنا سکہ جما لیتا ہے لوگون کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے- حیدر آباد میں اگرچہ زبان اُردو براہ راست دہلی سے گئی- بلکہ سچ یہ ہے کہ پہلے اُستادان اُردو دکن ہی مین پیدا ہوے اور زبان اُردو چاہے دہلی سے دکن مین گئی ہو- مگر اُردو شاعری دکن سے دہلی مین آئی- لیکن اخیر مین شعراے دہلی و لکھنؤ کا ایسا سکہ جما کہ سارے دکن کے شعرا کو اُنکے آگے سر جھکا دینا پڑا- اور ضروری ہو گیا کہ دہلی یا لکھنؤ مین سے کسی ایک شہر کی زبان کو اختیار کرین- رشید الدین خان نے اپنی تاریخ رشید الدین خانی مین زبانِ لکھنؤ کی خوبی کو بڑے زور سے تسلیم کیا ہے- اور چند روز پیشتر وہان کا عام رجحان زبان لکھنؤ کی طرف تھا- داغ مرحوم کے اثر نے بہت سے دلون پر دہلی کا سکہ جمایا- مگر اُنکے زمانے ہی مین امیر مرحوم کا بہت کچھ اثر موجود تھا- جس کو اب حضرت جلیل نے زندہ کر دیا- اور فی الحال حیدر آباد کی شاعری کا رجحان جس قدر حضرت جلیل- اختر مینائی- اور مولوی سید علی حیدر صاحب نظم

لکھنؤ ہی کے کلام اور اُنھی زبان کی طرف ہے دہلی کی زبان کی طرف نہیں یمین
السلطنۃ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر بھی جو بجائے خود ایک شاعر شیوا بیان اور
ادیب بے ہمتا ہین پنڈت رتن ناتھ سرشار اور دیگر اساتذۂ لکھنؤ کی دوستی
کی بدولت لکھنؤ کی زبان کے مربی ہین۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے اعلیٰحضرت
محی الملۃ والدین خسرو دکن خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کے کلام سے اُنکا رجحان
بھی لکھنؤ ہی کی طرف پایا جاتا ہے۔ لیکن وہین ہمارے مکرم دوست مولوی
عبدالحق صاحب بی اے اپنی وطنی اثر اور علیگڈھ کی تعلیم کی برکت سے
دہلی کے اسکول زبان کے دلدادہ ہین۔ اس مین کوئی مضائقہ نہین۔ مگر انکے
اس رجحان کا اگر یہ نتیجہ ہو کہ انجمن ترقی اُردو کی ہر کتاب کے دیباچے مین لکھنؤ
کی اُردو پر حملے کیے جائین تو ضرور افسوس کے قابل ہوگا۔ اس سے وہ اُردو
کو فائدہ نہین بلکہ نقصان پہونچائین گے۔

لکھنؤ اور دہلی کی زبانون کا محاکمہ کرنا اُن کا یا میرا یا کسی شخص کا کام
نہین ہے۔ یہ مسئلہ اب اس درجے سے گذر گیا کہ کسی فیصلہ کرنے سے فیصلہ
ہو جائے۔ یا جھگڑا چکے۔ غذا۔ خوشبو۔ نغمہ اور اس قسم کے صدہا ذوق ہین
جو "العادۃ کالطبیعۃ الثانیہ" کے اثر سے انسان کے دماغ مین بس جاتے ہین اور
پھر اُن سے وہ اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ کوئی فیصلہ اور کوئی فلسفہ اُنکے
اثر پر غالب نہین آسکتا۔ ایک غذا یورپ والون کو سب سے زیادہ لذیذ۔
ایک خوشبو اہل فرنگ کو سب سے بڑھ کے فرحت بخش اور ایک نغمہ اہل مغرب
کو لذیذ ترین غذائے روح معلوم ہوتا ہے مگر ہندوستان والون کو وہ تینون
نہایت ہی بدمزہ۔ دماغ سوز اور عذاب جان محسوس ہوتے ہین۔ کوئی صاحب
ہین جو اسکا فیصلہ کر دین یا اس جھگڑے کو مٹا دین؟

یہی حالت زبان کی ہے۔ ایک بچہ جس سرزمین مین پیدا ہوتا، جس
آغوش مین پلتا، جن بچون مین کھیلتا، جن دوستون سے ملتا جلتا ہے اُنکی
زبان اُسکے دل و دماغ میں جم کے بیٹھ جاتی ہے۔ اور وہی زبان اسکو دنیا
کی بہترین زبان نظر آنے لگتی ہے۔ جس طرح ایک بچہ مسلمان گھر مین پیدا ہو کے

بے دلیل خدا کو مانتا ہے اُسی طرح ایک لڑکا کسی زبان کو آغوش مادر مین سیکھ کے
بے دلیل اُسکی خوبیون کا قائل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس بات کی امید رکھنا
حماقت ہے کہ جو بچے دہلی و توابع دہلی مین پیدا ہوگے۔ وہان آغوش میں پل کے
اور وہان کی صحبتون میں اُٹھ بیٹھ کے بڑا ہوا ہے لکھنؤ کی زبان کو پسند کرے گا
اور اسی طرح اسکے برعکس یہ خیال کرنا جنون ہے کہ جو لوگ لکھنؤ اور توابع لکھنؤ مین
پیدا ہوے ہین اور وہین کی سوسائٹیون مین اُن کا نشو و نما ہوا ہے وہ دہلی کی
زبان کو کسی دلیل یا فیصلہ سے مان لین گے۔ مین ہون یا ہمارے دوست
مولوی عبدالحق صاحب دونون پر یہی اثر پڑا ہوا ہے۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہے کہ
ہم اپنی اپنی زبان کی خوبیون کے دلدادہ ہین۔ اور دوسرے اسکول کی زبان پر
اعتراض اور نکتہ چینیان کرتے ہین۔ جن سے سوا اپنا دل خوش کر لینے کے کوئی
نتیجہ نہین حاصل ہو سکتا۔ مولوی عبدالحق صاحب اطراف میرٹھ مین پیدا
ہوے۔ اور علیگڈھ مین تعلیم پائی۔ یہ دونون شہر زبان دہلی کے زیر اثر ہین۔
اس لیے اُنکے کانشنس سے بجز اسکے کہ لکھنؤ کی زبان کو پسند نہ کرین ہم اور کوئی
امید بھی نہین کر سکتے۔ بیشک زبان مین لکھنؤ والون کے تصرفات انکو ناگوار
گذرتے ہون گے مگر اس ناگواری کو اُنھین تھوڑی نفس کشی اختیار کر کے
برداشت کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس نزاع مین وہ قاضی نہین بلکہ فریق ہین۔

قابل لحاظ فقط اُن لوگون کا بیان ہو سکتا ہے جو ہون تو لکھنؤ کے
ساختہ و پرداختہ مگر زبان دہلی کی تعریف مین رطب اللسان ہون یا
برخلاف اسکے اُنھون نے دہلی مین نشو و نما پایا ہو اور زبان لکھنؤ کی مدح سرائی
کرتے ہون۔ مثلاً غالب مرحوم کہ اگرچہ دہلی کے اُستاد عدیم المثال اور شاعر
صاحب کمال تھے مگر لکھنؤ کی حد سے زیادہ مدح خوان تھے اور تسلیم کرتے تھے
دہلی کی زبان مٹ گئی۔

یا مرزا رجب علی بیگ صاحب سرور جو اکبرآباد آگرہ مین پیدا ہوے وہین
نشو و نما پایا۔ ناثر بے ہمتا بننے کے بعد لکھنؤ مین آئے۔ اور یہان کی معاشرت
زبان اس قدر پسند آئی کہ بآواز بلند مدح خوانی کرنے لگے۔ اور اس کا یہ

انعام ملا کہ وہ لکھنؤ والے خیال کرکے مورد سہام بن گئے۔ مولوی محمد حسین صاحب
آزاد مرحوم باوجودیکہ ثقہ آدمی تھے اور جانتے تھے کہ مرزا رجب علی بیگ
صاحب بھی ایک شریف آدمی ہیں اُن سے دست و گریبان ہو گئے اور
اُنھیں "لکھنؤ کا شہدا" کہدیا۔ اور آج تک اکثر آپے سے باہر ہو جانیوالے
دلدادگان زبان دہلی جب قلم اُٹھاتے ہیں اُنکی یہ سنت ادا کرنے کے لیے مرحوم
مرزا صاحب کو دو ایک گالیاں ضرور دے دیا کرتے ہیں۔ اور اس کا خیال
نہیں کرتے کہ وہ بیچارے تو خاص اکبرآباد کے رہنے والے اور دہلی کے اسکول
زبان کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ تلاش معاش میں لکھنؤ آئے۔ لوگوں نے قد
کی۔ دیگر صاحبان کمال کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُستاد بنا دیا۔ رہا اُنکا رنگ
عبارت تو اُنکے زمانہ تک لکھنؤ ہو یا دہلی سب جگہ کا وہی رنگ تھا جو فارسی ک
نثاری سے ماخوذ تھا۔ اُسی رنگ کو اُن دنوں تمام اہل علم لکھنؤ کے ہوں یا دہ
کے پسند کرتے تھے۔ اور اگر انگریزی تعلیم نے ترقی کرکے اُردو کے لیے ترقی ک
سڑک نہ بدل دی ہوتی تو آج بھی سب جگہ وہی رنگ ہوتا۔
اس رنگ کو لکھنؤ کا رنگ بتانا ہی غلطی ہے۔ اس لیے کہ وہی نثر ا
کا وہ قدیم رنگ تھا جو دہلی سے لکھنؤ میں آیا۔
بہرحال ان بحثوں میں پڑنے کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ اب سب جگہ اُردو
وہی رنگ ہے جس کا آغاز انگریزی اثر اور انگریزوں کی رہبری میں میرامن
ہوا تھا۔ غالب نے اُس میں اور سادگی پیدا کی۔ آزاد مرحوم نے مشرقی
رنگ کو ملا کے ایک نیا رنگ پیدا کیا۔ اور چند روز میں سارے ہندوستا
نثر ایک ہی وضع کی ہو کے ایک سطح پہ آ گئی۔

العادۃ کالطبیعۃ الثانیہ

(ماخوذ از ایڈیسن)

عوام و خواص سب میں ضرب المثل ہے کہ عادت فطرتِ ثانیہ ہے۔ یعنی
قدرت نے انسان کی سرشت و جبلت میں داخل کر دی ہیں انھیں کے مثل

بھی ہوتی ہیں جن کی عادت پڑ گئی ہو۔ اس کے صحیح ہونے میں تو کوئی شک وشبہ
نہیں۔ لیکن ہمیں اکثر یہ نظر آتا ہے کہ عادت سرشت پر بھی غالب آجاتی ہے اور
ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا وہی عادت اصلی فطرت و جبلت ہے۔ کہتے
ہیں کہ کوئی شخص ایک ایسے مقام پر رہا کرتا تھا جہاں ہر وقت گھنٹے کی آواز
سی جاتی تھی۔ اور اُس کا معمول تھا کہ جب گھنٹہ بجتا وہ بھی گھنٹے کی آواز کے
ساتھ باواز بلند کہتا جاتا ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ وغیرہ وغیرہ۔ چند روز بعد
اتفاقاً گھڑی بگڑ گئی۔ اُس کا بجنا موقوف ہو گیا۔ لیکن جہاں گھنٹہ بجنے کا وقت
آیا اُس کی زبان پر خود بخود الفاظ ایک۔ دو۔ تین۔ چار جاری ہو جاتے۔
اس واقعے کے تسلیم کرنے میں شاید بہت سے لوگوں کو عذر ہو۔ لیکن اس سے
وہ انکار نہیں کر سکتے کہ عادت کا انسان کی طبیعت پر اثر پڑتا ہے۔ اور اسکے
سے اُسکے اخلاق و عادات سب بدل جاتے ہیں۔
سچ یہ ہے کہ اگر ہم عادت کی قوت اور اُس کے اثروں سے فائدہ
انا چاہیں تو بہت سے بکار آمد نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ سب جانتے
یں کہ وہی چیزیں جو ہمیں پہلے ناگوار معلوم ہوتی تھیں عادت پڑ جانے کے
د نہایت خوشگوار ہو جاتی ہیں۔ اس میں اچھے یا بُرے کی تفریق نہیں۔ جو
ص جوے یا کسی بداخلاقی کے مشغلے میں منہمک ہوتا ہے ابتداءً اُسے ان
اُن میں اتنا لطف نہیں آتا تھا اور نہ اُن کی طرف ایسی رغبت تھی۔ مگر
صحبتوں میں پڑ کے اور بدکار لوگوں میں اُٹھ بیٹھ کے اُسے ان باتوں کی
ت پڑ گئی۔ اور اب اس قدر مزہ آنے لگا کہ بغیر اُنکے دم بھر نہیں رہا جاتا۔
اقارب بُرا کہتے ہیں۔ اپنے پرائے لعنت ملامت کرتے ہیں۔ مذہب عذاب
ت سے ڈراتا ہے۔ قانون دنیا ہی میں سزا دیتا ہے۔ مگر وہ اپنی حرکتوں سے
ہیں آتا۔ اُسے نظر آنے لگتا ہے کہ اُس کی زندگی کا مقصدِ اصلی یہی کام ہیں۔
موں کے لیے دنیا میں آیا ہے۔ اور اس قابل ہی نہیں رہا کہ دوسری
زندگی بسر کرے۔
نبا کو کھانے۔ حقہ پینے۔ ناس لینے۔ یا شراب پینے کی عادتیں بھی اسی طرح

طبیعت ثانیہ بنجاتی ہین - اور یہ حالت ہو جاتی ہے کہ بغیر اُنکے ایک گھڑی بھی چین نہین پڑتا - انھین چیزون پر موقوف نہین - تم اپنی غذاؤن - اپنے شربتون - اپنے کپڑون - اپنی خوشبوؤن - اپنی مسرتون - اپنے غمون - اپنی شاعری اپنی موسیقی ہر چیز پر عادت کو حاکم و متصرف پاؤگے - یہان تک کہ تمھارا معشوق اور تمھارا دوست بھی تمھاری عادات کا لباس پہنے ہوگا - اور انھیں اخلاق انھین کرشمون - انھین غمزون - اور حُسن و جمال کے انھین نمونون اور زیورون سے آراستہ نظر آئے گا جو تمھاری عادت کے بنائے اور تیار کیے ہوے ہین -

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ عادت کے ان تصرفات سے ہم فائدہ کیونکر اُٹھا سکتے ہین - جس طرح بُرے نشے - اور بدکاری کی عادت پڑتی ہے اُسی طرح اگر تم علوم و فنون یا کسی چیز کے مطالعے کا شوق کرو اور اُسکی عادت ڈالو تو کیا اُس کی عادت نہ پڑ جائے گی؟ ضرور پڑیگی - اسی پر منحصر نہین جس کام مین محنت کی جائے اور جس کی مزاولت کی جائے عادت پڑ ہی جاتی ہے - اور چند روز کے بعد اُسی مین لطف آنے اور مزہ ملنے لگتا ہے -

وہی کام جو پہلے بار معلوم ہوتا ہے اور اُسکے انجام دینے مین تکلیف ہوتی ہے عادت ڈالنے کے بعد خوشگوار اور پُرلطف ہو جاتا ہے - مغربی فیلسوف فرانسس بیکن اپنی کتاب فلسفۂ قدرت مین کہتا ہے "ہمین اُسی چیز مین زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے جو ابتداءً ہمارے لیے بار اور دشوار تھی اور ہم اُس سے نفرت کرتے تھے" اس کی مثال وہ دیتا ہے کہ شراب - کافی - چاء - پہلے ہمین بدمزہ معلوم ہوتی تھین - مگر عادت پڑ جانے کے بعد یہ حالت ہو جاتی ہے کہ بغیر اُنکے قرار نہین آتا - اور زندگی بھر نہین چھوٹ سکتی ہین -

ہمارے دل و دماغ کی یہی حالت ہے کہ کسی خاص کام یا محنت کی عادت ڈالنے سے اسی قدر نہین ہوتا کہ اُسکی دشواری کم ہو جاتی ہو بلکہ اُس کی جانب ایک طرح کی رغبت پیدا ہو جاتی ہے اور دل مین شوق نمایان ہوتا ہے - ایک بڑے عالم بے ہمتا اور فاضل گران پایہ کا مقولہ تھا کہ پہلے مجھے مصنفین سلف کی کی کتابون مین کسی قسم کا لطف نہ حاصل ہوتا تھا مگر ایک مجبوری اور ضرورت سے

چند روز تک مجھے یہ دشوار و ناگوار کام کرنا پڑا - اب نہایت حیرت سے دیکھتا ہون کہ ان کتابون مین مجھے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے - اور جب تک اُنکا مطالعہ نہین کر لیتا ہون دل کو قرار نہین آتا - ہر حال ان باتون سے یہ نتیجہ ضرور حاصل ہوتا ہے کہ عادت ڈالنے سے ناگوار اور بے مزہ کام ہم پر آسان ہی نہین ہو جاتے بلکہ خوشگوار اور بامزہ معلوم ہونے لگتے ہین -

انسانی فطرت کی اس خصوصیت پر اگر ہم زیادہ غور کرین تو اس سے بڑے بڑے فائدے اُٹھا سکتے ہین اور بہت سے اچھے اور نتیجہ بخش اصول ہاتھ آ سکتے ہین - اس سے اخذ کیا ہوا سب سے پہلا اور نہایت ہی اہم اصول یہ ہے کہ "جو کوئی جس کام مین مصروف ہوگا اور محنت کریگا اُس مین محروم و ناکام نہین رہ سکتا" ممکن ہے کہ ابتدا مین وہ اُسے بہت دشوار - نامناسب اور اپنے مذاق و رجحان کے خلاف نظر آتا ہو لیکن چند روز کی محنت و مصروفیت مین مذاق کے موافق ہی نہین نظر آنے لگے گا بلکہ اچھا اور خوشگوار معلوم ہوگا -

دوسرے عادت کے ان معجز نما اثرون سے فائدہ اُٹھا کے مین ہر شخص کو وہی نصیحت کرنا چاہتا ہون جو فیثا غورس نے اپنے شاگردون کو کی تھی - اس نے اُن سے کہا :" ہمیشہ وہ پیشہ اختیار کرو جو عمدہ اور اعلیٰ نظر آتا ہو - عادت ڈالنے سے اگر مشکل بھی ہوگا تو آسان ہو جائے گا - اور آخر مین تم خود اُسے پسند کرنے لگو گے - جن لوگون کو اس بات کا موقع حاصل ہے کہ اپنے لیے سوچ سمجھ کے کوئی پیشہ اختیار کرین وہ اگر کوئی سودمند اور پسندیدۂ عام مشغلۂ معاش نہ اختیار کرین تو ہرگز قابل معافی نہین ہین - انتخاب صورت کسب معاش کے وقت ہمین سب سے زیادہ اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ کس کام مین ہم زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے ہین - ابتدائی حالت مین دلی رجحان کے ہونے یا نہ ہونے کی مطلق پروا نہ کرنی چاہیے - کیونکہ عادت پڑ جانے کے بعد خود بخود طبیعت عادی ہو جانے گی اور آخر کار اس مین لذت ملنے لگے گی -

تیسری بہت بڑی بات معاد اور زندگی مابعد الموت کا خیال ہے - سخت سے سخت دنیا پرست جو مذہب کی دشواریون اور قیدون کو نہ برداشت کر سکتا ہو

اور بالکل بندۂ ہوا و ہوس ہو اُسے بھی عالم آخرت کا کچھ نہ کچھ خیال ضرور ہوتا ہے۔ اور نیکو کارون کی طرح وہ بھی باوجود اپنی بدکاریون کے اسی بات کا آرزومند ہوتا ہے کہ اُس عالم ابدی و سرمدی مین فلاح حاصل ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے گناہگار کو بھی اُن فرائض کے ادا کرنے مین جو مذہب کے بتائے ہوے ہین مسرت ہوتی ہے اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ مگر باوجود اسکے اُن لوگون کو مذہب کے بتائے ہوے اخلاق حسنہ خدا پرستی کے فرائض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس قدر بار و دشوار معلوم ہوتے ہین کہ پابندی نہین کر سکتے۔ اس کی وجہ فقط یہ ہے کہ انھون نے اُن دینی باتون کی عادت نہین ڈالی۔ لیکن اگر ہم ان باتون کی عادت ڈالین اور چند روز کی محنت مین اُنکو گوارا بنا لین تو پھر ہمین عبادت و ریاضت او زہد و تقویٰ مین لذت حاصل ہونے لگے۔ اور وہ اطمینان قلب اور فلاح دارین حاصل ہو جو خدا ہر دیندار کو نصیب کرے۔

چوتھے اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ ہم نے جب ایک اسلوب زندگی اختیار کر لیا تو پھر ہمین اس پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ دلچسپی اور تفریح و تفرج کے لیے ہم جن باتون کو اختیار کرین وہ نہایت ہی لطیف۔ پاکیزہ۔ بے عیب اور دل کو ظلمتِ گناہ سے صاف کرنے والی ہون۔ اگر اسکی احتیاط نہ کی گئی اور جو بُری باتین ہماری دلچسپیون مین داخل ہو گئین تو اُن کے اثر سے رفتہ رفتہ آئینۂ دل زنگ آلود ہو جائے گا۔ صفائی و پاکیزگی مٹ جائے گی۔ سچی مسرت سے دل خالی ہو گا۔ اور ادنیٰ درجے کے ذلیل و مضر۔ اور بُرے کامون مین لطف آنے لگے گا۔

آخر مین مین اس نتیجے کو پہونچتا ہون کہ انسان چند روز تک جو کام کرتا رہے عام ازین کہ وہ بُرا ہو یا بھلا اُس مین اسکو ایک گونہ خوشی ضرور حاصل ہونے لگتی ہے۔ لہذا ہر معمولی مسرت کو دیکھ کے اُسے نفس پروری کے پھندے مین نہ پڑ جانا چاہیے۔ دین و دنیا کی سعادت حاصل کرنے کی غرض سے اُس کے لیے ضروری ہے کہ اس چند روزہ زندگی مین ایسی پاکیزہ اور نیک عادتین اختیار کرے جو اُس عالم مین بھی اُسے فائدہ پہونچائین اور زندگی اُخروی میں بھی کام آئین۔

جنۃ الفردوس اصل پوچھو تو کامل اور دائمی مسرت کا نام ہے جو ہمین اپنے مذاق کے مطابق دنیوی شکلون مین دکھائی اور بتائی گئی ہین۔ ان مسرتون کے مستحق ہم اُسی وقت ہو سکتے ہین اور اُسی وقت وہ ہمارے لیے موزون و مناسب ہو سکتی ہین جب ہم اپنے آپ کو اُنکے قابل بنائین۔ اس عالم مین تم سچائی اور نیکو کاری کے عادی ہو اور اپنی زندگی اُس اعلیٰ مقصد کے حاصل کرنے مین صرف کرو۔ دوسرے عالم مین بھی اچھے رہو گے۔ اور وہان کی سچی اور پاکیزہ لذتون کے اہل ہو جاؤ گے۔ اصل یہ ہے کہ اُس ابدی روحانی مسرت کا بیج اس امتحان گاہ فانی کی زمین مین بویا جاتا ہے۔ اور گو تخم ریزی یہان ہوتی ہے مگر اکھوا اُس دوسرے عالم مین نکلتا اور ایک خوشنما فرحت بخش پودھا بن کے پھولتا پھلتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جنت کی نسبت یہ کہنا کہ ہمین اپنے اعمال نیک کے صلے مین ملتی ہے فقط کہنے کی بات ہے۔ اصل مین پاکبازی اور شریفانہ زندگی کا قدرتی نتیجہ جنت ہے۔

برخلاف اسکے وہ طبیعتین جو شہوت پرستی۔ خواہشات نفسانی۔ جھوٹھ۔ کینہ پروری اور عداوت و خصومت اور اسی طرح کی اور بہت سی باتون کی عادی ہو گئی ہین اُنھین یقینی طور پر رنج و الم اور ندامت و افسوس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اُن کی یہ تکلیف دنیا ہی سے شروع ہو جاتی ہے اور اُس کے بعد جب اُنکی روحین اس جسم خاکی فانی سے علحدہ ہو جاتی ہین تو اُس وقت بھی اُنھین مسرت نہین نصیب ہو سکتی۔ اور گو وہ اُس عالم مین نہ ہون گے جہان اُنھون نے بد اخلاقی سے اپنی زندگی خراب کی اور معاصی و جرائم کے مرتکب رہے تھے مگر اُسی دوسرے عالم مین اُنکے اعمال و افعال کا صدمہ و الم ہر وقت پیش نظر رہے گا۔ اور ان باتون سے اُنکو اس قدر تکلیف ہو گی اور ایسے پریشان رہین گے کہ اُن کا وہ عالم آخرت اشد ترین دوزخ اور عذاب الٰہی کا مرکز ہو گا۔

یہ اہل مذہب کے مذاق پر نہین کہا جاتا جو جنت و دوزخ کو مستقل مقاماتِ ثواب و عقاب مانتے ہین۔ مگر وہ لوگ جو اس کے قائل نہین وہ بھی اس دوسرے عالم کو اسی حیثیت سے مزرعۃ الآخرۃ تسلیم کرتے ہین کہ وہان اپنے دنیوی افعال

خیر کی بے اندازہ مسرت اور بدکاری کی ناقابل برداشت تکلیف ہوگی - اور اسی کو دنیا والون کے جنت و دوزخ بتاتے ہین - اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ جنت و دوزخ کا خیال فطرت کے مطابق ہے - اور بڑے بڑے محققون اور مبصرون نے بخوبی غور کرکے ان دونون عالمون کا پتہ لگا لیا ہے - چنانچہ اُن کا دعوے ہے کہ ہماری عادتین اور خصلتین ہی ہمارے لیے جنت و دوزخ کو پیدا کر دیا کرتی ہین -

خط پیکانی

اس دور کی ترقیون مین سب سے زیادہ حیرت انگیز اُن قدیم کتبون کو پڑھ لینا ہے جو آج تک نہین پڑھے جا سکے تھے - اور پھر اُن کے ذریعے سے اہم حصۂ تاریخ کا پتہ لگا لینا ہے - یہ تھوڑی حیرت کی بات نہین ہے کہ مسلمان ایران و عراق اور شام مصر پر تیرہ صدیون تک حکمران رہے مگر اس جانب توجہ نہ کی کہ اگلی دنیا کے کتبون پر غور کرتے اور پتہ لگاتے کہ اُن مین کیا لکھا ہے - اور جس قدر زیادہ زمانہ گذرتا جاتا تھا اُسی قدر انکا پڑھنا دشوار ہوتا جاتا تھا - یہان تک کہ کمال مایوسی کے ساتھ یقین کر لیا گیا کہ مردہ اور فنا شدہ زبانون کی ان مجہول و نامعلوم تحریرون کا مطلب سمجھنا غیر ممکن ہے -

مگر نہایت ہی صحیح ہے کہ "من طلب وجد" جس نے ڈھونڈھا پایا - اور حضرت مسیح نے بجا ارشاد فرمایا تھا کہ "جو دروازہ کھٹکھٹائے گا اُسکے لیے دروازہ کھلجائیگا" آج کل کے محققون نے اس بارہ خاص مین کوشش کی - ان قدیم کتبون پر غور و خوض کرنے مین عمرین صرف کین اور آخر اس طلسم کو توڑ ہی کے دم لیا جو کسی کے توڑے نہ ٹوٹ سکا تھا - بلکہ کسی کو اُسکی طرف توجہ کرنے کی جرأت ہی نہ ہوئی تھی -

قدیم نامعلوم خطون مین سب سے زیادہ اہم تو اہل مصر کا "خط تصویر" ہے جس کا حال ہم آیندہ لکھین گے - مگر اسکے بعد سب سے زیادہ اہمیت ایران و عراق کے "خط پیکانی" کو ہے جسکے بہت سے کتبے جا بجا اشوریا - بابل اور فارس کی اگلی نامور شاہنشاہیون کی یادگار عمارتون پر کندہ ہین - اُسکے حروف علی العموم میخون یا تیر کے پھلون (پیکانون) کی قطع کے ہوتے ہین - اسی وجہ سے حال کی دنیا نے اس خط کا نام "خط پیکانی" رکھ دیا ہے -

اس خط کے اکثر کتبے بڑی بڑی چٹانون اور عہد قدیم کی مورتون پر کھدے ہوے ہین - یا اینٹون اور کھپرون پر ٹھپے کے طریقے سے بنا دیے گئے ہین - یہ کتبے دولت عجم کے قدیم دار السلطنت پرسی پولی (اصطخر) کی پُرانی یادگارون پر - جا بجا ساسانی سلطنت کے اور بہت سے شہرون مین - بابل اور نینوا کے کھنڈرون مین اور نیز مصر کے بعض آثار منہدمہ مین بھی نظر آتے ہین - بظاہر اسباب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل اس خط پیکانی سے اشوریا اور میڈیا مین کام لیا گیا - بعد ازان یہ تحریر پورے عجم اور دولت فارس کی ساری قلمرو مین پھیل گیا -

اس کے خط کے حروف تین جداگانہ شانون کے برآمد ہوے ہین - اور اکثر مقامات مین اس خط کی تینون شانین ایک ہی جگہ یون دکھا دی گئی ہین کہ تینون مضمون کے حروف تین متوازی کالمون مین برابر برابر منقوش ہین - اور ایک ہی مطلب یا ایک ہی الفاظ تینون خطون مین کندہ کر دیے گئے ہین تاکہ ان مین سے جس کسی کو کوئی پڑھ سکتا ہو پڑھ کے دوسرون کا بھی مطلب سمجھ جائے - ان مین شانون مین سب سے قدیم اشوریا والون کے خط پیکانی کی شان ہے - اس مین تقریباً ۴۰۰ متمائز اور جداگانہ حروف ہین - دوسری شان میڈیا والون کی ہے جو در اصل پہلے ہی خط کی اصلاح و تہذیب ہے - اور اُس مین گھٹا کر ۱۰۰ حرف رکھ لیے گئے ہین - تیسری اور سب سے پچھلی شان فارسیون کے خط کی ہے جس مین فقط ۳۹ سے لے کے ۴۴ تک حروف تہجی باقی رہ گئے ہین - اور یہی خط پیکانی سب سے زیادہ مکمل اور اصلاح شدہ ہے - سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے حرفون مین باہمی تشابہ و التباس نہین باقی رہا ہے کہ ایک حرف پر دوسرے کا شبہہ ہو سکے - اُسکے حروف نہایت ہی واضح و ممتاز بھی ہین - اور اُن کے پڑھنے مین بہت کم دشواری یا غلطی ہو سکتی ہے - علاوہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ الفاظ ایک ترچھی لکیر کے ذریعے سے جدا جدا کر دیے گئے ہین:

کر دیے جاتے ہین - جو فارسی زبان اس خط مین لکھی ہوئی ہے اُسکی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ موجودہ فارسی کی ماں یہی ہے - اور حیرت کی بات ہے کہ موجودہ حالت سے الگ ہو کر وہ سنسکرت سے بہت قریب ہو گئی ہے - جس سے یہ خیال قائم ہو گیا ہے کہ فارسی اور سنسکرت زبانین اصل مین کبھی ایک ہی تھین -

اشوریا والون کے کتبون مین مختلف پیکانی قطع کے حروف ابتدائی خیالات ظاہر کرتے تھے - لیکن بیرونی ممالک کے لوگ یا جو لوگ دوسری زبان بولتے تھے اُنکی تحریر مین اُنھین الفاظ کی شکلین جو اُسی خیال کو ظاہر کرتین اشوریا والون کی لفظون کی شکلون سے جدا گانہ تھین - اس خط مین بہ تعمق غور کرنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ حروف جن سے ایک لفظ مرکب ہوتا وہ بلحاظ اپنی شکلون کے ایک خاص خیال کو ظاہر کرتے - نتیجہ یہ تھا کہ ایک جملے کے سمجھنے مین یہ بڑی دشواری پیش آجاتی کہ آیا یہ جملہ خیالات کی شکلون کے لحاظ سے لکھا گیا ہے یا آوازون کی شکلون کے لحاظ سے - پھر اس سے بھی زیادہ مشکل یہ بات تھی کہ بعض حروف مختلف خیالات کی جگہ پر استعمال کیے جاتے - اور اس کا پتہ لگانا کہ یہان کون سا خیال مقصود ہے نہایت ہی دشوار تھا - لیکن خزف پارون پر بعض کھڑی سطرین لکھی ملین جن سے بڑی مدد ملی - ان مین پہلے تو یہ بتا دیا گیا تھا کہ کون کون حروف خیالات کے ادا کرنے کے لیے مخصوص ہین - اور اُنکے مقابل وہ تمام حروف کندہ تھے جو آوازون کو ادا کرتے ہین یا خاص خاص آوازون کے لیے قائم کیے گئے ہین - چند ایسے خزف پارے ملے جن مین الفاظ کے مقابل اشوریا کی زبان مین اُن کا مطلب بھی بیان کر دیا گیا تھا -

یہ پیکانی وضع کے حروف اصطخر کے کھنڈرون مین پہلے پہل ۱۰۳۰ سنہ محمدی (۱۶۲۱ء) مین نظر آئے - لیکن اُسوقت نہ اُن کا کچھ مطلب سمجھا جا سکتا تھا اور نہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ کیا ہے - ۱۰۸۳ سنہ محمدی (۱۶۷۴ء) مین ایم چارڈون نام ایک شخص نے اُن مین سے بعض کتبون کی نقلین لے لین - اور اُن پر غور ہونے لگا - یہان تک کہ ۱۲۱۳ سنہ محمدی (۱۸۰۲ء) مین ایک مستشرق عالم یورپ ٹامس ہائڈ نے اُس پر بے انتہا فکر کی - اور بڑے غور و پرداخت کے بعد اُس نے جو رائے قائم

کی یہ تھی کہ یہ کوئی تحریر نہین - فقط خیالی شکلین ہین جو اس غرض سے بنا دی گئی ہین کہ طرح طرح کے پیکانی نقش و نگار بنا کے خوشنمائی پیدا کی جائے - بعض لوگون کا خیال اس جانب گیا کہ سمارون نے محض اتفاقی طور پر یہ نقش بنا دیے ہین - ورنہ ان سے کوئی خاص غرض نہین مقصود ہے - ایک جرمنی بزرگ نے یہ فرمایا کہ یہ نقش کیڑون اور حشرات الارض نے بنا دیے ہین - مگر باوجود ایسے خیالات کے ظاہر کیے جانے کے لوگون کو اطمینان نہ ہوتا تھا - چنانچہ ٹیچر نام ایک محقق نے اس بات پر اپنا یقین ظاہر کیا کہ یہ نقوش بے وجہ نہین - اور بجز اسکے اور کوئی بات نہین کہ یہ نقوش کسی اگلے رسم خط کے حروف ہین - چند روز مین دیگر مبصرین بھی ٹیچر کے ہم خیال ہو گئے - مگر ابھی کوئی تدبیر کسی کے ذہن مین نہ آتی تھی کہ ان تحریرون کا مطلب سمجھا جا سکے - ۱۲۱۷ سنہ محمدی (۱۸۰۲ء) مین ہنوور کے ایک مشہور عالم السنہ گروٹ فنڈ نے اعلان کیا کہ مین نے اس خط پیکانی کے تمام حروف بھی پڑھ لیے اور پتہ لگا لیا کہ یہ کتبے کیونکر پڑھے جا سکتے ہین -

اس کے بعد ۳۳ سال تک خاموشی رہی - یہان تک کہ ۱۲۵۱ سنہ محمدی (۱۸۳۵ء) مین سر ہنری رالنسن نے ایران کا سفر کیا - کوہ بے ستون کے مشہور و معروف کتبے کو خود جا کے دیکھا - اور اُسکی نقل اُتار لی - ایک بلند پہاڑ کے ایک پہلو پر جس جانب سر بفلک چٹان سیدھی بخط مستقیم کاٹ کے سطح کر دی گئی ہے دامن کوہ سے ۳۰۰ فٹ کی بلندی پر یہ کتبہ کھدا ہوا ہے - جہان تک بمشکل انسان کی رسائی ہو سکتی ہے - یہان پہاڑ کے اُس سطح پہلو پر خط پیکانی مین تین تحریرین ہین اور شان و رسم خط مین تینون ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز ہین - باوجود اسکے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اگرچہ تینون خطون کی شان بدلی ہوئی ہے مگر اصل مین ہے ایک ہی خط -

یہ نقل لانے کے بعد سر ہنری رالنسن نے اُسپر غور کرنا شروع کیا - اور آخر محنت و جستجو کے بعد اُنھین پوری کامیابی ہوئی - فارسی زبان سے وہ بخوبی ماہر تھے - پُرانی فارسی کا بھی مطالعہ کیا تھا - اسی فارسی دانی کی مدد سے اُنھون نے یہ کتبے پڑھ لیے - اُن کا ترجمہ کیا - اُنکو اس تحریر مین ہر زبان اور

ہر لفظ کی آواز معلوم ہوگئی اور ربطِ عبارت کا سلسلہ بھی معلوم ہوگیا۔

اسکے بعد انگلستان اور دیگر ممالک یورپ کے علما نے اس جانب بے انتہا توجہ کی۔ اور اُن تمام کتبون اور تحریرون کو جو پُرانی عمارتون کے درودیوار پر پہاڑون کے پہلوون میں، اور ظروف یا کھمبون کے خزف پارون پر ملین سب پڑھ لی گئین۔ اور اس ذریعہ سے اشوریا۔ بابل اور فارس کی اگلی سلطنتون کا بہت معتد بہ حصہ جو تاریخون مین موجود نہ تھا دنیا کو معلوم ہوگیا۔ اسی قدر نہین تفتیش و جستجو کا جو سلسلہ جاری ہوگیا ہے اور جو نیا کتبہ زمین سے نکلا یا کسی کھنڈر مین مل جاتا ہے ایک نیے صفحۂ تاریخ کا کام دیے جاتا ہے۔

رقص

(اپریل ۱۹۱۹ء)

اگرچہ رقص اور سرود کا ساتھ ہے مگر ناچنا بذاتہ ایک نہایت ہی دلچسپ فن ہے۔ اُس کا اصل منشا یہ ہے کہ پاؤن ایک معینہ و مقررہ مقدار و ترتیب سے اُٹھائے جائین یا گانے مین اسکی گت کی مناسبت سے جسم کو حرکت دی جائے۔ ناچنا اُن فطری جذبات سے ہے جن کی تعلیم خود فطرت نے دی ہے۔ اسی وجہ سے اس بات کا پتہ لگانا غیر ممکن ہے کہ انسان مین ناچ کا آغاز کب سے ہوا۔ اس کا پہلا موجد کون شخص ہے۔ یا پہلے پہل اس کا رواج کس قوم اور ملک مین ہوا۔ نہایت ہی وحشی و غیر متمدن قومون مین بھی ناچنے کا رواج قدیم سے قدیم زمانے مین پایا جاتا ہے۔

ہندوستان مین ناچ ایک بہت بڑا اہم فن ہے۔ اُسکے موجد اولین مہادیوجی سمجھے جاتے ہین۔ اور اُس کی ابتدا مہادیوجی کی پرستش و عبادت سے بتائی گئی ہے۔ اس سے بھی یہی نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ ناچنا فطری جذبات انسانی کے تقاضے سے ہے۔ ناچ کو عبادت سے وابستہ کرنا ہندوستان کے لیے مخصوص نہ تھا بلکہ دیگر اقوام نے بھی عبادت الٰہی مین اُس سے کام لیا ہے۔ یہودیون مین بھی جو بت پرستی سے بالکل گریزان و متنفر تھے بعض موقعون پر ناچنا داخل عبادت تھا۔ توراۃ کے الفاظ ہین کہ "انھین ناچ کر خدا کی حمد کرنے دو"۔ اسی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ "حضرت داؤد خدا کے سامنے ناچے"۔ مسلمانون کو ان باتون سے وحشت ت

کھانا چاہیے۔ اس لیے کہ در اصل ناچ جس چیز سے عبارت ہے اُس مین آپکا نماز مین بہ ترتیب اُٹھنا بیٹھنا۔ رکوع و سجود کرنا کلام الٰہی سے متاثر ہوکر آپ سے کسی بیتابی کی حرکت کا ظاہر ہو جانا۔ شعر خوانی مین الفاظ کے مطابق ہاتھ پاؤن اور چشم و ابرو کو حرکت دینا۔ یا مشائخ صوفیہ کا صحبتِ سماع مین بیتابی سے اُٹھ کھڑا ہونا اور ہاتھ پاؤن مارنے لگنا۔ یہ سب چیزین رقص مین داخل ہین۔

قدیم یونانیون نے رقص کو علمی شان سے منضبط کر دیا تھا۔ اور غرض تھی کہ اُس کے ذریعے سے مختلف قسم کے جذبات نہایت ہی خوبی کے ساتھ نمایان کیے جا سکتے۔ ہومر کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ یونانیون مین اکثر تقریبون کے موقعون پر ناچ ہوا کرتا تھا۔ ارسطاطالیس رقص کو بھی فنون شعر و نظم کے زمرے مین شامل کرتا تھا۔ اسپارٹا والے جو یونانیون مین نہایت ہی بانکے جان باز سپاہی تھے بچون کو پانچ ہی سال کی عمر سے ناچنے کی جبریہ تعلیم دینا شروع کر دیتے تھے۔ وہان بڑے بوڑھے سکھاتے اور قوم کے سارے بچے سیکھتے۔ اہل اسپارٹا ناچ کے ساتھ بھجن اور مختلف قسم کے گیت بھی گایا کرتے۔ اسپارٹا کے نوجوانون مین ایک خاص قسم کا ناچ "رقص فیرک" کا رواج تھا۔ یہ ایک جنگی ناچ تھا۔ جس کو ایک نمائشی لڑائی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

قدیم الایام کے لوگون مین تین طرح کے رقصون کا پتہ لگتا ہے (ایک) جنگی ناچ جو درحقیقت ایک قسم کی ورزش تھی۔ اور اُس کا مقصود یہ تھا کہ جسم تیار کیا جائے اور خوبصورت بنایا جائے۔ (دوسرا) تفریحی ناچ یہ صرف دل بہلانے اور صحبت مین زندہ دلی و برانگیختگی پیدا کرنے کے لیے ہوتا۔ (تیسرا) دینی ناچ یہ عبادت کے ساتھ مخصوص تھا اور توبہ کرانے یا چڑھاوون کے موقعون پر جوش و خروش کے ساتھ عمل مین آتا۔

مصریون مین ناچ فراعنہ کے زمانے سے ثابت ہوتا ہے۔ فرعونون کے دربار مین اُنکے سامنے ناچنے والی عورتین کھڑی ہوکر ناچا کرتی تھین۔ اسی طرح آج بھی مصر کے بازارون اور وہان کی صحبت ہاے عیش مین وہ پیشہ ور عورتین ناچا کرتی

ہیں جو اپنے آپ کو خاندان برامکہ کی یادگار بتاتی ہیں۔

اشوریا و بابل میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ فتحمند فوجوں کے آگے آگے نازنین و حسین عورتیں ناچتی اور کھیلتی ہوئی چلتی تھیں۔

ہندوستان میں بھی ناچنے والی عورتوں کا رواج نامعلوم زمانے سے چلا آتا ہے اُن میں سے اکثر مندروں میں روز دیوتاؤں کی مورتوں کے سامنے ناچا کرتی تھیں ایک ہزار سال پیشتر کا ایک عرب سیاح کہتا ہے "بعض راجاؤں کی سواری کے ساتھ بہت سی عورتیں ناچتی ہوئی چلتی ہیں" - عبادت کے لیے عورتوں کے ناچنے کا رواج دکن کے بڑے مندروں میں آج بھی موجود ہے۔

ساسانیوں کے عہد میں ایران میں بھی رقاصہ عورتیں موجود تھیں۔ اور یہود میں تو معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادیوں اور امیرزادیوں تک کے لیے کسی صحبت میں کھڑے ہو کر ناچنا معیوب نہ تھا۔ ہیروڈیہ جس نے بادشاہ کو اپنے رقص سے از خود رفتہ کر کے حضرت مسیح کو بپتسمہ دینے والے یحییٰ کا سر کٹوایا شاہزادی تھی۔

ابتدائی زمانے کے مسیحی بھی اپنے مذہبی جلسوں میں ناچا کرتے تھے۔ گو کہ انجیل میں اس کا ذکر نہیں ہے مگر اُنھوں نے اپنے طرزِ عمل سے رقص کو عبادت بنا لیا تھا۔

اسلام میں البتہ بجز صوفیہ کی مجالس حال و قال کے قرآن و حدیث یا فقہ سے کہیں اور کسی زمانے میں نہیں ثابت ہوتا کہ رقص سے عبادت و خدا پرستی میں کام لیا گیا ہو۔ بلکہ علما علی العموم اُسکے حرام ہونے کا فتوے دے رہے ہیں۔ مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس فتوے کی بنیاد کیا ہے۔ قرآن و حدیث سے اسکی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ اہل حبشہ کا رقص خود حضرت سرورِ عالم نے ملاحظہ فرمایا اور خاتونِ محترم ام المومنین عائشہ صدیقہ کو اپنے پیچھے کھڑا کر کے دکھایا تھا۔

یورپ میں ناچنا اعلیٰ درجے کی شریفانہ صحبتوں میں مہذب ترین دلچسپی تصور کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ و ادنیٰ ہر طبقے کے زن و مرد بے تکلف ناچتے ہیں۔ اور رقص کی تعلیم بچپن سے لازم ہو گئی ہے۔ خصوصاً لڑکیاں اگر ناچنا نہ جانتی ہوں تو بالکل پھوہڑ خیال کی جاتی ہیں۔

یورپ والوں کا عام خیال ہے کہ رقص سے صحت اور اخلاق دونوں پر نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے۔ مگر ہندوستان میں رقص چونکہ بدکار و عصمت فروش عورتوں کا پیشہ ہے اس لیے اُس میں دلچسپی چاہے جس قدر زیادہ ہو مگر صحت و اخلاق پر ہرگز اچھا اثر نہیں پڑ سکتا۔

ہمارے شعرا میں رقص بسمل بہت مشہور ہے۔ اس سے علی العموم کاری زخم کھانے یا ذبح ہونے کے بعد نیم جان لاش کا تڑپنا مراد لیا جاتا ہے۔ مگر بعض ظالم و بہائم صفت وحشی قوموں میں رقص بسمل کا خوفناک تماشا حیرت ناک بیرحمی و سنگدلی کی مسرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اس طرح کہ رقص بسمل کے شائق کسی جنگل میں مسافروں کی رہگذر پر جا کے جمع ہوتے ہیں۔ اور آگ جلا کے اُس پر ایک لوہے کا توا رکھ دیتے ہیں جو خوب گرم ہو کر سرخ ہو جاتا ہے۔ اُس وقت جو مسافر یا اجنبی شخص مل جاتا ہے اُسکو پکڑ لیتے ہیں اور فوراً تلوار سے اُس کا سر کاٹ کر وہ جلتا توا گردن پر رکھ دیتے ہیں۔ توا جم کے بیٹھ جاتا ہے۔ خون جو جوش مار کے نکلا چاہتا ہے مختبس ہو کر بند ہو جاتا ہے اور بے سر کی لاش جس کی گردن پر سر کے عوض توا ہوتا ہے گھنٹوں دوڑتی کودتی ناچتی اور گرتی پڑتی ہے۔ جسکو دیکھ کر وہ لوگ قہقہے لگاتے اور بہت ہی خوش ہوتے ہیں۔

افسوس انسان میں اگر رحم اور خدا کا خوف نہ ہو تو اُس سے زیادہ وحشی و خونخوار کوئی نہیں ہو سکتا۔ درندہ پیٹ بھرنے کے لیے ذی روح مخلوق کی جان لیتا ہے اور وہ بے ضرورت محض تفنن طبع۔ اور دل بہلانے کے لیے۔ جانور بھوک کے تقاضے سے کسی جاندار کو مارتا ہے تو وہ سیر و تفریح اور دلچسپی کے لیے جس کا نام شکار رکھ دیا گیا ہے۔

گلستان

شیخ سعدی کی کتاب گلستان کو پڑھتے تو سب ہیں مگر شاید یہ کسی کو نہ معلوم ہو گا کہ اُس کے نام کا ماخذ و مخرج کیا ہے۔ اور لوگ یہ سُن کر تعجب کریں گے کہ اس نام کا اصلی ماخذ یونانی زبان اور اُس کا ادب ہے۔

ولادت حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوا چھ سو برس پیشتر یا یون کہیے کہ حضرت مسیح سے پہلی صدی کے وسط مین ارض شام کے شہر غدارہ مین ملیاغر نام زبان یونانی کا ایک شاعر و معلم رہتا تھا۔ اس نے اپنے زمانے تک کے یونانی شاعرون اور ادیبون کے نظم و نثر کلام کا ایک منتخب مجموعہ مرتب کیا جس مین ہر شاعر کی بہترین نظمین اور ہر ادیب کی فصیح و موثر و مختصر نثرین جمع کی تھین۔ ملیاغر نے اس مجموعہ مین یونانی شاعر سافو سے لے کر اپنے عہد تک کے تمام شعرا و ادبا کا منتخب کلام جمع کیا تھا۔ اور آخر مین اپنا بھی بہت سا کلام درج کر دیا تھا۔ اسکے شروع مین اپنی ایک تمہیدی نظم درج کی جس مین ہر شاعر کو اپنے خیال و مذاق کے مطابق کسی خاص پھول سے تشبیہ دے کر اسی پھول سے تعبیر کیا۔ اور اسی رعایت سے اس مجموعے کا نام "پھولون کا ہار" رکھ دیا۔

ملیاغر کے بعد تھسالونیکا کے فلپ نے اس "پھولون کے ہار" مین زمانہ مابعد کے "تیرہ" اور شاعرون اور انشا پردازون کے کلام کا انتخاب اضافہ کیا۔ اور اپنے اس نئے مجموعۂ سخن کا نام "انطالوغی" رکھدیا۔ یونانی زبان مین "انطوس" پھول کو کہتے ہین اور "لوغیہ" کے معنی خرمن کے ہین۔ لہذا "انطالوغی" کا لغوی ترجمہ "خرمن گل" یا "گلستان" و "گلزار" ہے۔

فلپ کے بعد شہر ہرقلہ کے دیوجناوس۔ شہر سارڈیس کے اسٹرٹو اور اغاتھیاس نام ایک اور یونانی سخن سنج نے جو اپنے دور کے بڑے نامور اساتذۂ سخن مین تھا بہت سے نئے منتخبات کے اضافے کر کے نئے نئے مجموعے شایع کیے۔ مگر ان سب مجموعون کا نام وہی "انطالوغی" یعنی گلستان یا خرمن گل رہا۔ جن مین ۳۵۰۰ یونانی شعرا اور ادیبون کی نظمین اور نثرین درج تھین۔ اور اب یونانی مین اس قسم کے مجموعون کا عام نام "انطالوغی" ہو گیا۔ گویا یہ کسی کتاب کا نام نہین بلکہ ایک فن یا خاص قسم کی کتابون کا عام نام تھا۔ چند روز بعد یونانی زبان کے تمام مذکورہ مجموعہ ہاے سخن دست برد زمانہ کی نذر ہو گئے۔ فقط "انطالوغی" کا نام رہ گیا۔ جس پر یورپ کی زبانون نے اپنے لب و لہجہ کے لحاظ سے تصرفات کیے۔ چنانچہ انگریزی مین وہ "انتھالوجی" بن گیا۔ انگریزی مین آج بھی اس قسم کے

انتخابات سخن کو "انتھالوجی" کہتے ہین جسکے معنی وہی خرمن گل یا گلستان کے ہین۔

مگر ولادت سرور عالم کے تقریباً چار سو برس بعد یعنی دسوین صدی عیسوی مین قسطنطین قفالاس کی جستجو سے پھر بعد ازان نوین صدی ولادت محمدی یا چودھوین صدی ولادت عیسوی مین مقسیموس فلانودیس کی جستجو سے فنا شدہ یونانی "انتھالوجی" یعنی قدیم گلستان یونان کے چند اجزا دستیاب ہو گئے جو بعد والون کی کوشش سے دنیا مین محفوظ رہ گئے۔

مقسیموس کا ترتیب دیا ہوا مجموعہ بسلسلۂ لسکریس ایڈیشن ۹۳۴ھ محمدی (۱۴۰۶ء) مین شہر فلارنس مین طبع ہوا۔ اسکے بعد اسکے اور کئی ایک عمدہ ایڈیشن ترجمے اور توضیحات کے ساتھ شایع ہوے۔ لوگ اسی مقسیموس کے نسخے کے دلدادہ ہو رہے تھے کہ یکایک سلماسیوس نام ایک شخص نے ۱۰۳۵ھ محمدی (۱۶۰۶ء) مین قسطنطین قفالاس کے گم شدہ مجموعے کو ہیڈل برگ کے کتب خانے سے برآمد کر کے دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ مجموعہ زیادہ مکمل تھا اور اس مین بمقابل مقسیموس کے مجموعے کے زیادہ استیعاب تھا۔ یہ نسخہ سی سالہ جنگ کے زمانے مین رومۃ الکبرے مین لایا گیا۔ وہان سے پیرس مین گیا۔ اور آخر ۱۲۳۵ھ محمدی (۱۸۱۶ء) مین پھر ہیڈل برگ مین بھیج دیا گیا۔

اس یونانی گلستان (انتھالوجی) کی دیکھا دیکھی رومیون نے اپنی لاطینی زبان مین بھی شعر و سخن کے کئی مجموعے منتخب کر کے مدون کیے۔ جن کے مولف کلاے روم سقالیغر۔ پتھوس۔ بورمان۔ اور چند اور سخن سنجان لاطینی تھے بورمان کا مجموعہ زیادہ ضخیم تھا جو ۱۱۵۹ھ محمدی اور ۱۲۰۴ھ محمدی (۱۷۵۹ء) و (۱۷۷۳ء) مین ایمسٹرڈم سے شایع ہوا۔ پھر اسکو کسی قدر ترقی دے کے زیادہ خوبی کے ساتھ میر نام ایک یورپین فاضل نے ۱۲۴۴ھ محمدی (۱۸۳۵ء) مین اور اسکے بعد اس سے بھی زیادہ خوبی و خوش اسلوبی سے اسکندروس نام ایک عالم لاطینی نے ۱۲۹۵ھ محمدی (۱۸۶۹ء) مین شایع کیا۔

عربی زبان اس قسم کے گلستانون سے بمقابل یونانی و لاطینی کے زیادہ مالا مال ہے۔ اس مین سب سے پہلے ابو تمام

حبیب بن اوس المتوفی ؁۲۳۱ محمدی (؁۸۴۵ء) نے پھر بعد ازان
عہ یہ دونون ادیب اسلام کی پہلی صدیون کے نامور ادیب اور تاریخی روایات عرب کے
عالم بے بدل تھے - ابو تمام کا نام حبیب بن اوس تھا وہ بنی طے مین سے تھا - ادب و شاعری
مین اُستاد زمانہ تھا - اسکی کتاب "حماسہ" نہایت مشہور و مقبول ہے اور آج تک ادب عربی کے
نصاب میں داخل ہے - اُس نے اپنے ایک مجموعۂ اشعار کا نام "فحول الشعرا" رکھا - جسکے
معنی شعرائے نامور کے سمجھنے چاہیے - اس مین جاہلین (جاہلیت کے شعرا) مخضرمین (وہ شاعر
جنھون نے جاہلیت و اسلام دونون زمانون کو دیکھا) اور اسلامیین (شعرائے عہد اولین
اسلام) کا نہایت ہی عمدہ انتخاب کیا ہے - اُسکی ایک اور کتاب "کتاب الاختیارات" ہے اس مین
محض شعرائے سلف کے مقبول و پسندیدہ اشعار جمع کیے ہین - اُسکو اتنے اشعار زبانی یاد تھے
کہ اور کسی کی نسبت نہین سنے گئے - کہتے ہین کہ قصیدون - غزلون - اور متفرق اشعار کے سوا
اُسکو صرف چودہ ہزار عربی مثنویان برزبان یاد تھین - اُس عہد کے ایک رئیس اور والی ملک
ابو دلف عجلی کی مدح مین اُس نے قصیدہ پڑھا - ابو دلف نے پچاس ہزار درہم صلہ مین
دیے - اور کہا "خدا کی قسم یہ ادنی رقم اس قصیدہ کے سامنے حقیر و ہیچ ہے - اس لیے کہ آپ
کی اس نظم کو بجز اُس مرثیے کے جو آپ نے محمد بن حمید طوسی کے غم مین کہا ہے اور کوئی نظم نہین
پہونچ سکتی" ابو تمام نے کہا "اُس کے غم مین تو مین نے کئی مرثیے کہے ہین اُن مین سے کس
مرثیے کو آپ نے پسند فرمایا؟" ابو دلف نے اُس مرثیے کا مطلع پڑھا اور کہا "کاش مین
مرگیا ہوتا اور یہ مرثیہ آپ نے میرے مرنے پر کہا ہوتا - اس لیے کہ جس شخص کے غم مین یہ مرثیہ
ہو وہ مر نہین سکتا - وہ ابد الآباد تک زندہ رہے گا"

لوگ کہتے ہین کہ بنی طے مین تین شخص ایسے پیدا ہوے کہ ساری دنیا مین اُنکا جواب نہین ہوا
حاتم طائی سخاوت مین - داود طائی زہد و تقوی مین اور ابو تمام طائی شعر و سخن مین -

آخر عمر مین وہ شہر موصل کی ڈاک کا مہتمم مقرر ہوگیا تھا - ؁۱۹۰ محمدی (؁۸۰۶ء) مین مضافات
دمشق کے قریۂ جاسم مین پیدا ہوا تھا - گندم گون، کشیدہ قامت، فصیح البیان اور شیرین زبان
تھا - مگر بات اس قدر جلدی کرتا تھا کہ بعض اوقات سمجھنا دشوار ہو جاتا - ؁۲۳۱ محمدی (؁۸۴۵ء)
مین چالیس ہی سال کی عمر تھی کہ دنیا سے رخصت ہوگیا - ابو نہشل بن حمید طوسی نے اُسکی قبر پر ایک
مقبرہ بنوادیا جو مدت تک تمام مشاہیر کا مقبرہ کہلاتا تھا -

ابو الفرج عہ اصفہانی المتوفی ؁۳۵۶ محمدی (؁۹۶۶ء) نے اُن تمام عربی نغمون اور
گیتون کے منتخب مجموعے مرتب کیے جو جاہلیت عرب مین یعنی حضرت سرور عالم سے
پہلے مروج تھے - انکی مجموعی ضخامت دس جلدون کو پہونچ گئی - ابو الفرج اصفہانی
نے .... اسکے علاوہ اپنی مشہور کتاب اغانی مین ان تمام گیتون اور نغمون
کو بھی مرتب کرکے شایع کردیا جو علی العموم عربون مین مروج و متداول تھے - اس ضخیم
عربی کتاب کو یورپ مین کوسے گارٹن نے ؁۱۲۵۶ محمدی (؁۱۸۴۰ء) مین نہایت خوبی
و تحقیق سے چھاپ کے شایع کردیا ہے - پھر اُس کی نقل دوبارہ مصر مین چھپی اور
اب دنیا کے تمام مشہور کتب خانون مین موجود ہے -

ان کتابون کے علاوہ عربی مین اور بہت سے اسی قسم کے مجموعے یعنی گلستان مین

عہ ابو الفرج علی بن حسین اُموی اصفہانی - یہ ادیب خاص خلفائے بنی اُمیہ دمشق کی نسل
سے اور اُنکے آخری خلیفہ مروان بن محمد کا پرپوتا تھا - مگر باوجود بنی اُمیہ مین ہونے کے اسکا شمار
شیعیان علی مین کیا گیا ہے - اُسکی کتاب اغانی جو اکیس جلدون مین ہے ادب و حالات عرب
کی ایک ایسی عدیم المثال کتاب ہے کہ باتفاق علمائے سلف اپنا جواب نہین رکھتی - صاحب
علم فرمان روائے اسپین صاحب بن عباد کے ہمراہ سفر اور دورے مین تین سو اونٹون پر
اُس کا کتب خانہ رہا کرتا تھا - اغانی تصنیف ہو کے اُسکے پاس پہونچی تو کہنے لگا
"بس اب اتنے اونٹون کے رکھنے کی ضرورت نہین - اکیلی یہی کتاب اغانی کافی ہے"
اسپین کے خلیفۂ اُموی حکم نے جو علم کا بڑا مربی تھا اس کتاب اور مصنف کی بڑی
قدر کی - ہزارون دینار اُس کے پاس مشرق مین بھیجے - اور اُس کے کہنے سے اس
مصنف نے بنی امیہ کی تاریخ اُن کے خاندانون - نسبون - اور ہر قسم کے حالات کو - اور
انکی شان مین نظمون اور قصیدون کو جمع کیا تھا - انکے علاوہ اور بہت سی کتابین تھین
جو آج موجود ہوتین تو حالات عرب اور اُس عہد کی ترقیون کا کوئی ادنی کرشمہ بھی
ہماری نظر سے مخفی نہ رہ جاتا -
مگر وہ زندگی بھر وزیر مہلبی کی ذات سے وابستہ رہا - اُس کی شان مین قصیدے
کہتا اور اُسی کی قدردانی و فیاضی پر بسر کرتا تھا - ؁۲۸۴ محمدی (؁۸۹۷ء) مین پیدا
ہوا تھا اور ؁۳۵۶ محمدی (؁۹۶۶ء) مین خاص بغداد مین وفات پائی -

ہین جو عموماً پسند کی جاتی ہین گر اُن مین سب سے بہتر اور نہایت مکمل وہ مجموعۂ انتخاب ہے جس کو ثعالبی نے مرتب کر کے "یتیمۃ الدہر" کے نام سے شایع کیا ہو ثعالبی کی وفات کے بعد اور لوگون نے اُس کو اور بڑھایا - اور زیادہ مکمل کیا - جو آج تک موجود اور مقبول و مشہور ہے -

لیکن عربون نے انتھالوجی (فن گلستان) مین کتابین تو لکھین مگر اُسکے یونانی نام کو نہین لیا، بلکہ ہر مولف نے اپنی کتاب کا ایک جداگانہ نام رکھ دیا -

---

عہ ثعالبی کا پورا نام ابو منصور عبد الملک بن محمد بن اسمٰعیل ثعالبی تھا - اپنے عہد مین علم و ادب کے اُستاد بے ہمتا اور نظم و نثر مین مرجع عالم تھے - ان کے سیرت نگار اُنھین اپنے زمانے کے تمام مصنفون کا سردار اور سارے مولفین کا امام بتاتے ہین - زندگی ہی مین اُن کا نام ہر جگہ ادب و شعر مین ضرب المثل ہو گیا تھا - اور اُن کی زیارت کے شوق مین دُور دُور سے اونٹون کے قافلے برابر آتے رہتے تھے - اُن کے دیوان یکا یک دنیا مین شایع ہوے تو تمام لوگون کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے افق شرق سے ماہتاب اور تارون نے طلوع کیا ہے -

ان کی کتابون مین سب سے زیادہ مشہور و مقبول "یتیمۃ الدہر فی محاسن اہل العصر" ہے - جس مین تمام شعرائے عرب کا منتخب کلام جمع کر دیا ہے - یہ اس فن یعنی فن گلستان کی تمام کتابون سے بڑی - اچھی - اور بہت حاوی ہے اسکی تعریف مین ابو الفتوح نصر اللہ اسکندری نے جو ایک نازک خیال شاعر عرب تھا اور بہت مشہور تھا یہ دو شعر کہے ہین -

ابیات اشعار الیتیمہ   ابکار افکار قدیمہ

یتیمہ کے اشعار قدما کے ابکار افکار یعنی اُنکی طبعزاد دوشیزائین ہین

ماتو و عاشت بعدہم   فلذاک سمیت الیتیمہ

قدماے سلف مرگئے اور وہ اُنکے بعد زندہ رہین اس سبب سے اُن کا نام یتیمہ پڑ گیا -

ثعالبی کی اور بھی کتابین ہین جن سے اُن کی وسعت نظر کا پتہ لگتا ہے - سنہ ۳۹۰ھ (سنہ ۹۲۱ء) پیدا ہوے اور سنہ ۴۲۶ ہجری (سنہ ۱۰۳۶ء) مین سفر آخرت کیا - اُنکو ثعالبی اس لیے کہتے ہین کہ ثعلب لومڑی کو کہتے ہین اور اُن کا اصلی پیشہ یہ تھا کہ لومڑیون کی کھالون کو بناتے اور درست کرتے اور پھر اُنکو سیتے تھے -

عربون کے اثر اور اُنکی علمی تعلیم سے فارسی - ترکی - ہندوستانی اور دیگر السنۂ مشرق مین بھی اس قسم کی صدہا کتابین تصنیف ہو گئین - فارسی مین جتنے شعرا کے تذکرے ہین اُن مین زیادہ تر مقصود شاعرون کے حالات نہین بلکہ اُنکے کلام کا انتخاب ہوتا ہے - اور سچ پوچھیے تو انتھالوجی یعنی فن گلستان کی کتابین ہین - سعدی نے اگرچہ دوسرون کے کلام یا دیگر شعرا کی نظمون کو نہین جمع کیا - مگر درحقیقت اُنکی کتابین مختلف واقعات عالم - تجربون - نصیحتون - اور اگلے کارنامون کا انتخاب ہین جو ہو اخلاقی اصول پر مرتب کیے گئے ہین - لہذا صحیح معنون مین اُنکی دونون کتابون گلستان اور بوستان پر "انتھالوجی" "خرمن گل" یا "گلستان" کے الفاظ صادق آتے ہین - اور یقیناً اسی خیال سے اور اس فن کی حقیقت و تاریخ کو معلوم کر کے اُنھون نے یہ دونون نام اختیار کیے ہین جو اُنکو براہ راست تو نہین تو بواسطہ یونانی سے ملے ہین - فارسی مین کلام شعرا کو پھول سے تعبیر کرنے کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ اُردو مین مجموعۂ اشعار کا عام نام "گلکدہ" یا "گلدستہ" مشہور ہو گیا ہے - فارسی مین "گلستان مسرت" کے نام سے اس فن کی ایک اعلیٰ درجے کی مکمل کتاب مصطفائی مطبع نے لکھنؤ سے شایع کی تھی جو اب دستیاب نہین ہوتی -

اُردو مین بھی اس فن نے بہت ترقی کی - جتنے گلدستے نکل رہے تھے یا اب نکلتے ہین سب اسی فن کی کتابین "خرمن گل" یا "گلستان" ہین مگر اُن کے علاوہ اور بھی بہت سے مجموعہ ہاے اشعار مختلف حیثیتون سے منتخب کیے گئے ہین - بعض مین عوام کے مذاق کی غزلین جمع کی گئی ہین بعض مین گانے کی غزلین اکٹھا کر دی گئی ہین - دو چار ایسے بھی ہین جن مین اچھا اور مقبول کلام چھانٹ لیا گیا ہے - مگر سچ یہ ہے کہ ابھی تک اُردو مین کوئی ایسا مستند و مقبول عام انتخاب نہین شایع ہوا جو یونانی و عربی گلستانون کا جواب ہو سکے -

مگر چینی زبان مین نظمون کی کتاب" کے نام سے کنفیوشیس کی مرتب کی ہوئی ایک گلستان موجود ہے - جو ادب مشرق کا ایک قدیم ترین اور سب سے مجموعۂ انتخاب ہے - اس لیے کہ کنفیوشیس حضور سرور عالم سے تقریباً بارہ سو برس پیشتر تھا - لہذا اُس کی گلستان کی نسبت سمجھنا چاہیے کہ آج سے ڈھائی ہزار

سال پیشتر کی لکھی ہوئی ہے جبکہ بخت نصر ارض فلسطین اور بیت المقدس کو پامال اور بنی اسرائیل کو جلا وطن کرنے کے لیے اسیر کر رہا تھا۔ اہل چین اپنی اس قدیم گلستان کو ایک الہامی و آسمانی کتاب خیال کرتے ہیں اور اس کا بڑا ادب کرتے ہیں۔

افسوس کہ سنسکرت میں سب علم ہیں مگر تاریخ کی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں کسی قدیم انتھا لوجی (گلستان) کا بھی پتہ نہیں لگا۔

تاج

تاج کو بعض لوگ سر کا ایک زیور بتاتے ہیں۔ مگر اصل میں یہ زیور نہیں بلکہ ایک زیور نما مرصع و مکلل ٹوپی کا نام ہے جو امتیاز کے لیے پہنی جاتی تھی۔ ابتداءً فقط بادشاہوں کے ساتھ مخصوص تھی اور انکے سوا کوئی بھی اسکو نہ پہن سکتا تھا لیکن بعد کے زمانے میں بادشاہوں نے اپنی فیاضیوں سے شاہزادوں۔ امیروں اور معزز و ممتاز لوگوں کو بھی حسب حیثیت تاج عطا کرنا شروع کر دیے۔ اس کا پتہ لگانا غیر ممکن ہے کہ تاج کا پہلا موجد کون تھا یا پہلے پہل کس قوم سے اس کا آغاز ہوا۔ ہر قوم اپنی تاریخ میں اپنے کسی قدیم بادشاہ کو اس کا موجد بتاتی ہے۔ ہندوؤں میں ہم رامائن اور مہابھارت کے زمانوں میں بھی مکٹ (تاج) کا رواج پاتے ہیں۔ مگر توراۃ کی تاریخ سے چونکہ قدیم ترین تمدن اشوریا یعنی فرمان روایان نینوا کا ثابت ہوتا ہے اس وجہ سے مورخین نے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ تاج کی ایجاد سب سے پہلے وہاں کے بادشاہوں سے ہوئی۔

علامہ مسعودی مروج الذہب میں کہتے ہیں "دنیا میں سب سے پہلے جسنے تاج پہنا وہ سریانی (یعنی اشوریا کا) بادشاہ سوسان تھا۔ اس نے پہلے پہل تاج کو ایجاد کیا۔ پھر مسعودی ہی کے مطابق ایران والے تاج کا موجد اور پہلا تاجدار کیومرث کو بتاتے ہیں۔

انسان ابتداءً پتوں سے ستر پوشی کرتا تھا۔ اُس وقت اور اُسکے بعد بھی یعنی کپڑے اور چمڑے کے لباس کے مروج ہونے کے بعد بھی مدتوں تک جسمانی آرائش وزیبائی پتوں اور پھولوں ہی سے ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ تاج کا پہلا نمونہ بھی پتوں

کا ایک ہار تھا جو سر میں لپیٹ لیا جاتا۔ یہی اور اسی شکل کا تاج پہلے پہل دنیا کی تمام قوموں میں مروج ہوا۔ اسکے بعد جب جواہرات اور سونے چاندی سے زیب وزینت کا کام لیا جانے لگا تو تاج میں بھی ان چیزوں نے پھولوں اور پتوں کی جگہ لینا شروع کی۔ چنانچہ ہندوستان کے راجاؤں کے قدیم تاج انکی تصویریں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت ہی قیمتی۔ بھاری اور مرصع بہ جواہر تھے۔ یہی کیفیت ایرانی تاجداروں کے تاجوں کی بھی معلوم ہوتی ہے۔ مرصع تاجوں کی سب سے پہلی وضع یہ تھی کہ ایک پٹی میں ایک ہیرا نصب کیا جاتا۔ وہ پٹی سر میں لپیٹ کے پیچھے کی طرف باندھ لی جاتی۔ اور ہیرا پیشانی کے اوپر چمکتا رہتا۔ یونان کے سب سے بڑے دیوتا جیوپٹر۔ مصر کے یونانی فرمان روا بطلیموس اور شاہان شام کے بادشاہوں کی مورتوں کے سروں پر اسی وضع کا تاج نظر آتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان دنوں تاج کی خصوصیت بادشاہی کے لیے نہ تھی اور بہت سے معزز عہدہ دار و معتمدین دربار بھی تاج پہنا کرتے تھے۔ مگر بادشاہ کے تاج میں اور اُن لوگوں کے تاجوں میں نمایاں فرق ہوتا تھا۔ بادشاہوں کے تاج کی پٹی سنہری ہوتی اور دیگر عہدہ داروں کے تاجوں کی پٹی اور رنگ کی۔ جو جو زمانہ گزرتا گیا اس پٹی میں اور زیادہ کام ہونے لگا۔ اور دیگر اقسام کے بیش قیمت جواہرات بھی جڑے جانے لگے۔

ایرانیوں میں ساسانیوں کے آخر عہد تک ثابت ہوتا ہے کہ والیان ملک اور مخصوصین دربار کو خاص وضع اور خاص درجے کے تاج عطا ہوا کرتے جو نہایت ہی قیمتی ہوتے۔ عربوں سے اُن سے جب لڑائی ہوئی ہے تو عجمی سردار اپنے تاجوں سے پہچان لیے جاتے تھے کہ وہ کس رتبے اور درجے کے امیر ہیں۔ چنانچہ سب سے اعلیٰ رتبے کا سردار ایک لاکھ دینار کا تاج پہنا کرتا جو خاص دربار خسروی سے عطا ہوتا۔ ان سرداروں کو قتل کرنے کی بدولت کئی صحابیوں کو انکے تاج ہاتھ لگے۔ جنھوں نے انکو دولت سے مالا مال کر دیا۔ اسی قدر نہیں شاہان عجم نے تاج کی وضعوں اور اُسکے پہننے کے طریقوں میں طرح طرح کے اسرار و اشارات مقرر کر رکھے تھے۔ سب سے زیادہ قیمتی اور مرصع تاج ساسانی شاہ ایران کا تھا جسکی نسبت مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دربار کے مکان میں صدر مقام پر

تخت کے اوپر دو مرصع طلائی ستونون کے درمیان سونے کی زنجیرون مین لٹکا رہتا۔ وہ اس قدر بھاری اور وزنی تھا کہ کسی انسان کا سر اُسکے بوجھ کا متحمل نہ ہو سکتا۔ مگر وہ تخت سے اتنا بلند رہتا کہ بادشاہ جب سریر خسروی پر جلوہ فرما ہوتا تو وہ تاج جو اوپر آویزان ہوتا اُسکے سر مین پہن جاتا۔ اور اہل دربار کو نظر آتا کہ بادشاہ اُس کو پہنے ہوے ہے۔

ایرانیون ہی کو دیکھکر یونانیون مین یہ رواج ہوا کہ تاج عہدے کی علامت سمجھا جاتا۔ یونان مین یہ بھی رواج تھا کہ اُنکے قومی دنگلون مین جو لوگ شہسواری، شہزوری، شمشیرزنی، نیزہ بازی یا دوڑ مین سب سے بازی لے جاتے اُن کو انعام مین بجاے تمغے کے ایک تاج دیا جاتا۔ اسی طرح یہ تاج اُن لوگون کو بھی ملتا جنھون نے اپنے ملک کی کوئی نمایان خدمت انجام دی ہوتی۔ مگر یہ سب تاج پھولون اور پتون کے ہوتے۔ جن کی قیمت تو کچھ نہ ہوتی مگر عزت بڑی تھی۔

یونانیون سے تاج کو رومیون نے لیا۔ اور اُن مین اُس کا رواج زیادہ تعمیم کے ساتھ تھا۔ اُن مین سب سے زیادہ معزز و ممتاز تاج کورونا اوبسی ڈیونالیس کہلاتا۔ یہ تاج کسی محصور شہر یا فوج کی طرف سے اُس سپہ سالار کو عطا ہوتا جس نے اُن کو دشمن سے نجات دلا کر آزادی دی ہوتی۔ یہ تاج فقط جنگلی پتیون اور پھولون سے بنایا جاتا۔ اور اُس بہادر و جانباز سپاہی کو مرحمت ہوتا جس نے کسی میدان جنگ مین کسی رومی باشندے کی جان بچائی ہوتی۔ جس شخص کو یہ تاج ملتا اُسکو اُسکے ساتھ اور بہت سے حقوق بھی مل جاتے۔

رومیون مین ایک اور تاج تھا جو مورل کہلاتا۔ یہ سونے کا ہوتا اور اس پر قلعے کے برج اور دمدمے بنے ہوتے۔ یہ اُس سپاہی کو ملتا جو کسی محصور شہر کی فصیل پر لڑائی مین سب سے پہلے سیڑھی لگا کے چڑھ جاتا۔ اس کے علاوہ ایک اور تاج جو کرونہ والاریس کہلاتا اُس شخص کو دیا جاتا جو کسی دشمن کے پڑاؤ یا مورچے مین سب سے پہلے گھس پڑتا۔ اسی طرح کرونہ ناولیس اُس بہادر کو عطا ہوتا جو سب سے پہلے دشمن کے جہاز پر قدم رکھتا۔ ان مذکورہ تاجون مین سے مورل اور سوک تاج آج بھی وہان نقشون مین مستعمل ہین۔

رومیون مین تین طرح کے اعزازی تاج تھے جو "فتح کے تاج" کہلاتے۔ یہ حسب رتبہ اُن سپہ سالارون کو ملا کرتے جو کسی مہم کے سر کرنے اور فتح حاصل کرنے کے بعد جلوس اور فوج کے ساتھ شان و شوکت سے مدینۃ الکبریٰ مین داخل ہوا کرتے۔ انھین پر منحصر نہین اور دعوتون کے بھی مختلف تاج اہل روم مین مروج تھے جو مختلف درجون اور جداگانہ حیثیتون کے ناموَرون کو ملا کرتے۔ اُنھین مین چند مقدس تاج بھی تھے جو سونے کے ہوتے یا غلّے کی بالیون یا زیتون کی پتیون سے بنائے جاتے۔ ان تاجون کو مقتدایان دین اور دیگر حاضرین چڑھاوے اور قربانی کے موقع پر پہن لیا کرتے۔ اور غالباً اُنھین سے پاپاؤن نے اپنے تہرے تاج اور اسقفون اور شپون نے خاص خاص وضعون کے تاج حاصل کیے ہین جو کیتھولک مسیحیون مین آج تک مروج ہین۔

اہل روم مین ایک قسم کے ماتمی تاج بھی تھے جو مُردون کو پہنائے جاتے۔ اس تاج کا آغاز یونانیون سے ہو چکا تھا۔ چنانچہ اُنکے وہان یہ لاشون کو پہنانے کے تاج ایک قسم کی ہری خوش رنگ گھانس سے بنائے جاتے۔

رومی اپنی دلچسپی کی محفلون اور عیدون مین بھی ایک قسم کا تاج پہنا کرتے جو پھولون کے ہارون سے بنتا۔ اور اسی وضع کا تاج رومی دولھنین بھی پہنا کرتین۔ جسکے لیے وہ خود اپنے ہاتھون سے توڑ کر پھول جمع کرتین اور اُنکو گوندھ کے شادی و زفاف کے موقع پر پہن لیا کرتین۔ اسی قبیل کا ایک تاج زچگی کے لیے مخصوص تھا۔ یہ ہار کی وضع مین گوندھ کر اُس کمرے یا کوٹھری کے دروازہ پر لٹکا دیا جاتا۔ جس مین بچہ پیدا ہوتا۔ لیکن یہ شادی و زچگی کے تاج ہندوستانیون کے مذاق کے مطابق تاج نہین کہے جا سکتے۔ شادی والا تو ہمارے نزدیک سہرا تھا اور زچگی والے تاج کو بجاے تاج کے بندھنوار کہا جائے تو شاید زیادہ موزون ہوگا۔

عرب مین عہد جاہلیت تاج کا ہونا یقینی ہے۔ اس لیے کہ قدیم شاہان یمن نے اشوریا اور عجمیون کے تعلقات سے جدا زان والی حیرہ وکندہ کی ریاستون نے ساسانیون سے اور بنی غسان کی سلطنت نے رومیون سے مزید دیگر اوضاع و اطوار

شہر یاری کے ساتھ تاج بھی حاصل کر لیے تھے۔ اس لیے کہ شاہان فرنگ وعجم مین
اُن دونون علی العموم تاجون کا رواج تھا۔ جاہلیت کا نامور شاعر عمرو بن کلثوم تغلبی
اپنے قصیدۂ معلقہ مین پہلے اس پر فخر کرتا ہے کہ ہم نے کبھی بادشاہ کی اطاعت
نہین کی۔ اور پھر کہتا ہے "وسید معشر قد توجوہ" (اور سردار جماعت جسے لوگون
نے تاج پہنایا) اور اسکے بعد کہتا ہے کہ اُس تاج پوش کو ہم نے قتل کر کے ڈال
دیا۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ بادیہ نشین عربون کی آزادی اس سے
نفرت کرتی تھی کہ تاج کی اطاعت کرین مگر اُن مین بادشاہ کہلانے والے تاجدار
موجود تھے۔ لیکن یہ طلوع نیر اسلام سے پہلے کی باتین ہین۔

ظہور اسلام کے بعد چونکہ حکمرانی کا پہلا نمونہ اُس معصوم ناموس الٰہی نے دکھایا
جو انوار قدس کا سرچشمہ تھا اس لیے شاہی وشہر یاری انسانی آزادی پہ قربان
کردی گئی۔ اور حکمرانی وامارت محض چوپانی اور قوم کی خدمتگذاری کا نام رہ گیا
اسی وجہ سے مسلمانون مین مدت ہاے دراز تک فرمان رواؤن کے لیے سوا
خلیفہ ونائب رسول کے اور کوئی لفظ نہین تھا۔ خدا مراتب اعلیٰ کرے حضرت
عمر فاروقؓ کے کہ انھون نے "امیر المومنین" کا ایک سادہ سا لقب بنا دیا جو آخر
تک خلفا کا سرمایۂ ناز رہا۔ اس لیے کہ مسلمانون کا بادشاہ اور شہنشاہ صرف
خداوند کریم تھا۔ کئی صدیون تک یہی حالت رہی کہ "بادشاہ" کے لقب سے
مسند آرایان خلافت باوجود ہر طرح کے کروفر کے بُرا مانتے اور عوام اسلام ان
ان الفاظ کو خدا کے سوا کسی بندے کی طرف منسوب کرنا شرک اور ناجائز [illegible]
کرتے۔ یہان تک کہ خلافت کمزور پڑی۔ عربی معاشرت نسیاً منسیاً ہو گئی۔ اور
وصفدریان اکاسرہ وقیاصرہ کی سنتین اختیار کر لینے کے باعث بالکل [illegible]
دیلمیون۔ آل بویہ۔ اور سلجوقیون کا زور ہوا جو خلیفہ تو نہ مانے جا سکتے تھے [illegible]
سطوت وجبروت مین خلفا سے بڑھے ہوے تھے۔ امیر المومنین اور خلیفہ [illegible]
القاب مسند خلافت ہی مین لپٹ کے رہ گئے اور اُنکے لیے نئے معزز القاب [illegible]
تلاش ہوئی۔ اس جستجو نے چند روز مین اُنکو سلطان وبادشاہ بنا دیا۔ [illegible]
بادشاہ۔ سلطان۔ اور شہنشاہ کے لقب مسلمانون کو ایسے مانوس ہو گئے [illegible]

اُن کے استعمال کرنے مین نہ شرع کا پاس تھا اور نہ شرک کا اندیشہ۔ چنانچہ حکمرانان
غزنوی۔ سلجوقی۔ زنگی وایوبی سب سلطان کہے جانے لگے۔ اسپین وافریقہ
مین تو البتہ جہان عربی معاشرت پر بیرونی اثر کم پڑا بادشاہ اور سلطان کے الفاظ
کم استعمال ہوے باقی مشرق کے تمام مسلمان حکمران چھوٹے ہون یا بڑے سب کے سب
سلطان۔ بادشاہ اور شہنشاہ کہے جانے لگے۔

ہندوستان مین اس شرک کی بے احتیاطی کو یہان تک ترقی ہوئی کہ ضعیف
الاعتقاد اکبر نے اپنے سامنے رکوع وسجود کرانا شروع کر دیا۔ اور القاب مین تو ایسی
ترقی ہوئی کہ خدا کے لیے کوئی نام اور لقب نہین باقی رہا۔ اور حضرت رب العزت
کی شان مین جتنے القاب وصفات مستعمل ہوتے تھے سب سریر آرایان سلطنت
کی شان مین استعمال ہونے لگے۔

خیر سلطان یا دوسرے الفاظ مین یون کہا جائے کہ فرعون بے سامان تو
حکمرانان اسلام بن گئے مگر اس بات کو آج مسلمان حیرت سے دیکھین گے کہ قدیم
تاج کو بہت کم لوگون نے اختیار کیا۔ وہی عربی عمامہ جو بادیہ نشینان عرب مین
مروج تھا تھوڑی ترمیم وترقی کے ساتھ خلفا مین اور اُنکے بعد سلاطین وشاہان
اسلام مین تاج کا کام دیتا رہا۔ تاج کا جو خیالی خاکہ ہندوستانیون کے ذہن
مین ہے یہ انگریزون اور مسیحیون سے ہوا ہے۔ خصوصاً جب انگریزون نے یہ تاج
نواب مسند آرایان لکھنؤ کو دیا تو سارے ہندوستان مین یہ خیال پھیل گیا کہ تاج
ایسا اور اس وضع کا ہوتا ہے۔ ورنہ مسلمانون مین کہین اور کسی جگہ سوا مقطع اور
طرحدار عمامون کے اس قطع کے تاجون کا رواج نہین رہا تھا۔ چند روز بعد اُن
عمامون مین بڑے بڑے قیمتی موتی اور جواہرات لگائے جانے لگے۔ پھر اُس پہ یہ
ترقی ہوئی کہ ایک یا کئی کلغیان قائم کر دی گئین۔ کلغیون کا رواج خلفاے بنی
[illegible] وبنی عباس کے عہد تک ثابت نہین ہوتا۔

لیکن خلفا کے بعد جب مسلمانون مین سلاطین اور بادشاہون کی حکومت
قائم ہوئی تو تاج کے عوض تاج کی کلغیان لے کے مرصع جیغون کے ساتھ شاہی
عمامون مین لگائی جانے لگین۔ سلاطین آل عثمان۔ شاہان ہند۔ اور فرمان روایان

عجم و عرب کے تاج یہی کلغی دار عمامے تھے۔ ایران کے بادشاہون مین خصوصاً آخری
زمانے مین ایک لمبی اونچی اور کنگرہ دار ٹوپی کا رواج معلوم ہوتا ہے جو انکی تصویرون
کے سرون پر نظر آتی ہے۔ مگر یہ کلاہ پاپاخ تھی جس نے تھوڑی تبدیلی کے ساتھ موجودہ
ایرانی ٹوپی کو پیدا کیا ہے۔ اس ٹوپی کو اس لیے تو تاج کہہ سکتے ہین کہ شاہان ایران
کے سرون سے اس نے زینت و عزت پائی تھی مگر فی نفسہ اُسکو تاج سے کوئی تعلق
نہ تھا۔

دنیا و آخرت

تہذیب و مذہب کا تقاضہ ہے کہ انجام کا خیال کرو اور دو روزہ عیش کی ہوس
مین نہ پڑو۔ مگر دل کہتا ہے کہ لطف کی جو گھڑی نصیب ہو جائے اُسے بے مزہ ہاتھ سے
نہ جانے دو۔ رندون نے اس آخری مسلک کو اختیار کیا اور عیش پرستی کے پیچھے
دنیا و عقبیٰ دونون کو بھول بیٹھے۔ مگر صوفی ضرورت سے زیادہ عاقبت اندیش
تھے۔ دنیا کی تمام لذتون کو چھوڑا۔ عیش و عشرت سے دست بردار ہو گئے۔ اور بعد
والے عالم سرمدی کی مسرتون کے شوق مین دنیا سے متنفر رہے۔ دونون کے مختلف
مذاقون کا ماحصل یہ ہے کہ ایک دنیا مین پھنسا ہے اور دوسرا آخرت کے شوق مین
دنیا کو بھولا ہوا ہے۔ ایک آج کی مقدوری پر کل کی اُمیدون کو اور دوسرا کل کی
مسرتون پر آج کی کامیابی کو قربان کر رہا ہے۔ دونون اپنے مقام پر خوش اور مطمئن
ہین اور دوسرے کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہین۔

لیکن غور سے دیکھو تو بنی نوع انسان کو دونون نقصان پہونچا رہے ہین
ایک اگر دنیا کے مزے لوٹ رہا ہے تو آخرت سے دست بردار ہو کر۔ دوسرا اگر
فلاح آخرت کا شائق ہے تو دنیا کو ہاتھ سے کھو کر۔ یہ دونون غلطی پر ہین۔ دونون
گھاٹے مین پڑے ہوے ہین۔ اور دونون اسی غلطی مین مبتلا ہین جس نے ہزارون
سال تک دھوکے مین رکھا۔ اس لیے کہ اگلے تمام سلاطین و اہل مذاہب اس
مذاق مین ڈوب کر مسلسل نقصان اُٹھاتے رہے۔ بادشاہون نے رندانہ مشرب
اختیار کی تو زہاد اور دین نے صوفی گری۔ پہلون کو دنیا سے غرض تھی تو دین

خارج تھے اور دوسرون نے عقبیٰ سے سروکار رکھا تو دنیا سے بے پروا ہو کر۔
اسلام کا دنیا مین آنا دراصل اسی غلطی کے مٹانے اور اسی نقصان کے
دُور کرنے کے لیے تھا۔ اسلام نہ یہ کہتا ہے کہ عیش دوروزہ دنیا کو چھوڑ دو اور نہ یہ
کہتا ہے کہ فلاح آخرت کی طرف سے بے پروا ہو جاؤ۔ اس کے اصول سے نہ
دنیا آخرت کی ضد ہے اور نہ آخرت دنیا کے خلاف۔ اس کا دعویٰ ہے کہ
"الدنیا مزرعۃ الآخرۃ" جس کے معنی اور کوئی چاہے کچھ سمجھے ہم تو یہ سمجھتے ہین
کہ اگر تم نے دنیا کی کھیتی درست کر لی تو آخرت مین بھی اچھے رہو گے۔ یا دوسرے
الفاظ مین یون کہا جائے کہ "دنیا اچھی ہے تو عقبیٰ بھی اچھی ہو گی"۔ خلاصہ یہ
کہ اسلام دنیا اور آخرت دونون کے سدھارنے اور سنوارنے کو آیا ہے۔ اس
کے فیصلے کے مطابق دنیا ہی کی اصلاح سے عقبیٰ کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور عقبیٰ
ہی کی غرض سے دنیا درست ہوتی ہے۔ اس بات کو لوگ مدت تک نہین سمجھے۔
مگر یہ کوئی عقل کی بات نہ تھی کہ خدا نے بھیجا تو دنیا مین ہے اور مقصد یہ ہے کہ
اسکو چھوڑ دو۔ چھوڑنا تھا تو پھر بھیجا کیون؟

مگر اگلے بزرگون اور آجکل کے بھی بہت سے مقطع و فرشتہ صورت صالحین
کی سمجھ مین نہین آتا کہ دنیا و عقبیٰ کی اصلاح ایک ساتھ کیسے ہو سکتی ہے۔ ظلمت
و نور کا ساتھ کیسا؟ اور عالم ظلمت مین منہمک ہونے سے انسان عالم نور مین
کیسے اچھا رہ سکتا ہے؟ یہ ظلمت و نور کے استعارے خود تم نے اپنے قدیم مذاق
روحانی سے ایجاد کر لیے ہین ورنہ حقیقت و واقعیت کی نظر سے دیکھو تو وہی
ٹھیک نظر آتا ہے جو ہم نے کہا اور جو اسلام کی اصلی تعلیم ہے۔

اسلام کیا کہتا ہے؟ اسلام کہتا ہے کہ دنیا مین جس طرح بنے اوج و عروج
پیدا کرو۔ ہر طرح کی مسرتین حاصل کرو۔ ہر قسم کا لطف اُٹھاؤ۔ اور دو روزہ
عیش کے مزے ہاتھ سے نہ جانے دو۔ دولت جمع کرو۔ سامان عیش فراہم کرو۔ سلطنت
و حکومت حاصل کرو۔ ملکون اور قومون پر جہاد اور فرمان روائی کرو۔ حسین سے
حسین اور مہ جبین سے مہ جبین پری رخون کو اپنی معشوقہ و محبوبہ بناؤ۔ جادو نگاہ
کنیزون اور حرمون سے اپنے کاشانہ عیش کو رونق دو۔ لذیذ سے لذیذ غذا کو

قوت جان بناؤ۔ اور لطیف سے لطیف خوشبو سے دماغ کو تر و تازہ کرو۔ اور اگرچہ زندگی تھوڑی ہے مگر دو روزہ عیش کے سامانوں میں سے کوئی رہ نہ جانے۔ لیکن ان سب لذتوں اور عیش کے سامانوں کو خدا کی دی ہوئی نعمتیں تصور کر کے شکر اور خدا ترسی کے ساتھ برتو۔

شکر و خدا ترسی کیا ہے؟ یہ کہ شارع میں ہر روز تھوڑا مقررہ وقت خدا کی یاد میں صرف کرو۔ اور خدا کے خوف سے ہر لذت کے حاصل کرنے اور برتنے میں تمھارا قدم حد اعتدال سے باہر نہ ہونے پائے۔ تم سے کسی کو آزار نہ پہونچے۔ نعمتوں کو ناجائز یا ظالمانہ و غاصبانہ طریقوں سے نہ حاصل کرو۔ اور ان سے لطف اٹھاتے وقت شکستہ حال محتاجوں اور مصیبت زدہ ستم کشیوں کو نہ بھولو۔ آپے سے باہر نہ ہو کہ برے بھلے اور عدل و ظلم کا امتیاز نہ باقی رہے۔ اگر خدا ان نعمتوں سے محروم کر دے تو صبر و شکر سے کام لو اور حرف شکایت زبان پر نہ آنے۔ یہی صبر و شکر۔ یہی اعتدال و انصاف۔ اور یہی صبر و قناعت جنت کے دروازے کی کنجی ہے۔ اور ان احتیاطوں کے ساتھ تمھاری زندگی دنیوی کا عیش دو روزہ ہی آخرت کے ابدی عیش کا ذریعہ بن جائے گا۔

سچ یہ ہے کہ جو شعرا تصوف کے دعوے ترک دنیا سے دھوکا اٹھا کر لوگوں کو لذت ہائے دنیوی سے روکنے لگے انھوں نے نجات کا سچا راستہ نہیں دکھایا بلکہ اور بھٹکا دیا۔ مگر ہاں جن فطرت پرستوں نے رندوں کی طرح یہ کیا کہ کوئی گھڑی بے عیش کے نہ گذرنے پائے۔ خوشیاں مناؤ اور مزے اڑاؤ۔ وہی کچھ سیدھے راستہ پر تھے۔ مگر افسوس ہم نے انکی قدر نہ کی۔ یونانیوں کے فلسفیوں کا جو گروہ دنیا پرستی سکھاتا تھا وہ ان لوگوں سے اچھا تھا جو دنیا چھڑاتے تھے۔ اور آج بھی ہم میں جو لوگ رند مشربوں کی طرح عیش دنیا سے بہرہ یاب ہونے کی تلقین کرتے ہیں ان سے اچھے ہیں جو دنیا چھوڑنے کو کہتے ہیں۔

اس صحیح نتیجے تک نوع انسان کو سب سے پہلے اسلام نے پہونچایا تھا۔ مگر افسوس کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں عیسائیوں۔ ہندوؤں اور پارسیوں کے فلسفۂ الٰہی نے انکی دینی تعلیم پر غالب آکر مسلمانوں کو اپنے اصلی دین

سے غافل کر دیا۔ اور مسیحیوں نے جو ترک دنیا کے تاریک سمندر میں غوطے کھا رہے تھے ہماری ان تعلیموں کو اختیار کر کے ترقی دنیا کی طرف توجہ کی تو وہ حیرت انگیز کمالات دکھا دیے کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ یہ کلیں، یہ ریلیں، یہ ہوائی جہاز اور یہ سائنس کے معجزانہ انکشافات سب اسی تعلیم کی برکت میں جس کا سبق تو قرآن کے مکتب نے دیا تھا مگر عمل کرنے والے انجیل کے پیرو تھے۔

مگر اس "وضع الشئی علیٰ غیر محلہ" سے دنیا والوں کو ایک بہت بڑا نقصان پہونچ گیا جو نہایت خطرناک ہے اور اب اس کا دور ہونا بہت دشوار بلکہ غیر ممکن نظر آتا ہے۔ تعلیم چونکہ دراصل اسلام سے حاصل ہوئی تھی اس لیے اسکو اصول و عقائد اسلام سے فطری مناسبت تھی۔ اگر اصلاح عالم کی غرض پیروان اسلام کے ہاتھ سے پوری ہوتی تو لوگ پورے پورے دیندار اور خدا پرست رہ کر اس کام کو پورا کرتے۔ اور سائنس چاہے کیسی ہی کرامات و خوارق عادات دکھاتا خدا پرستی کا نقش دلوں پر سے نہ مٹتا۔ برخلاف اسکے مسیحیت چونکہ اصولاً روحانیت اور بت پرستوں کے فلسفۂ روحانی کے جال میں پھنسی ہوئی تھی اس لیے اسکو ان دنیاوی و دنیاداریانہ نفس پرستی کی باتوں سے کوئی ذاتی علاقہ نہ تھا۔ اسکے عقائد و اصول کا جوڑ ان چیزوں سے نہیں بیٹھتا۔ اور اس کا انجام یہ ہے کہ دنیا جس قدر ترقی کرتی جاتی ہے اور سائنس جو جو جدید انکشافات کرتا جاتا ہے اسی قدر مذہب کمزور پڑتا جاتا ہے۔ مسیحیوں نے اصول اسلام سے سیکھ کر دنیا تو بیشک اچھی طرح سیکھ لی مگر انکا مذہب انکے دلوں پر اپنی گرفت نہ باقی رکھ سکا۔ چنانچہ تمام باکمالان یورپ اور ان کے پیرو لامذہب اور خدا کو بھولے ہیں۔

یہی کام اگر امت اسلام کے ہاتھ سے انجام پاتا تو یہ لامذہبی کا نتیجہ نہ پیدا ہوتا۔ اور جس معتدل خدا پرستی و تہذیب کی تعلیم اسلام نے دی ہے وہ سائنس کے مقابلہ میں ہرگز کمزور نہیں پڑ سکتی تھی۔

ہم کو مسیحیوں پر حسد نہیں۔ ان کی ترقیاں دیکھ کر خوش ہوتے بلکہ انکی پیروی کرنے کو تیار ہیں مگر یہ صدمہ ہمارے دل سے دور نہیں ہو سکتا کہ ان کے ہاتھ سے دنیا کو جو ترقی حاصل ہو رہی ہے وہ مذہب کو مٹائے دیتی ہے اور وہ

سچی الٰہی تہذیب جس کی گرفت دلون پر تمام دنیوی تہذیبون سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے صفحۂ زمین پر سے فنا ہونے کے قریب پہونچ گئی - لیکن اگر ہم گمراہی مین پڑکے اپنے فرض کو نہ بھولتے اور حضرت مخبر صادق صلعم کی ہدایت کے مطابق سرگرمی سے اس کام کو شروع کر دیتے تو دنیا بھی ترقی کرتی اور عقبیٰ بھی نہ خراب ہونے پاتی -

علاماتِ اوقاف

ہمارے فاضل دوست مولانا نظام الدین حسن صاحب بی - اے - بی - ال - جج ہائی کورٹ دولت آصفیۂ نظام نے کمال ذکاوت و ذہانت اور نہایت ہی جستجو و دقیقہ سنجی کے ساتھ ایک بالکل نئی اور اچھوتی تحقیقات کی ہے جس کی طرف جہان تک ہم جانتے ہین اس سے پیشتر کسی کا خیال نہین کیا گیا تھا - اُنھون نے ایک مختصر رسالہ انگریزی مین ایک چھوٹے پمفلٹ کی شان مین شایع کیا ہے جو فلسکیپ کے تین صفحون سے کم پر ختم ہو گیا ہے - لیکن ان گنتی کے تین صفحون کی قدر و قیمت سچ یہ ہے کہ بڑی بڑی ضخیم کتابون سے بھی زیادہ ہے - ہمارے فاضل مولانا ثابت کرتے ہین کہ انگریزی خط مین جو مختلف علامتین طرز ادا ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہین نہ پُرانی انگریزی مین تھین ، نہ یونانی مین ، نہ لاطینی مین - اسکے ثبوت مین وہ انسائیکلو پیڈیا برٹانکا جلد ۱۸ - صفحہ ۱۶۳ کی یہ عبارت پیش کرتے ہین کہ " جو علامات یورپ کی تحریرون مین مستعمل ہین اِن کی اصلیت نہ یونانی الفاظ سے ہاتھ آسکتی ہے اور نہ رومی الفاظ سے " اسکے بعد اُنھون نے یہ بھی بوضاحت اور مستند طریقون سے بتا دیا ہے کہ جو چند علامات یونانی اور رومی تحریرون مین استعمال کیے جاتے تھے وہ موجودہ خط یورپ کی علامات سے بالکل جدا تھے اور اُن کا ان مروجہ علامات سے کوئی تعلق نہین ثابت کیا جا سکتا -

اور جب صاف ہو گیا کہ ان علامات کو یورپ کی قدیم زبانون سے کسی قسم کا تعلق نہین تو وہ دعویٰ کرتے ہین کہ یہ علامتین اُن علامتون سے لی گئی ہین جو سنہ ۷۱۱ء سے سنہ ۱۴۹۱ء تک مملکت ہسپانیہ مین عربی زبان کے طلبہ اور اہل علم مین

مروج تھین - وہ یہ بھی کہتے ہین کہ قاہرہ اور مصر کے عربی اہل علم مین بھی بعض علامتین مروج تھین مگر وہ ان سے جدا تھین مگر وہ ان سے جدا تھین اور اور قسم کی تھین

اب اسکے بعد مولوی نظام الدین حسن صاحب ان علامات اور انکے منشأ اختراع کی تصریح فرماتے ہین - اور ہر ایک علامت کو جُدا جُدا یون بیان کرتے ہین -

کاما comma جو انگریزی خط مین اس وضع مین (،) لکھا جاتا ہے - لکھا جاتا ہے عربی کے لفظ " وقف " سے نکلا ہے - جس کے معنی ٹھہرنے کے ہین لہذا وہ عربی مین اُس محل پر بھی استعمال کیا جاتا تھا جہان انگریزی مین اُلٹے کاما استعمال کیے جاتے ہین - انگریزی مین نہ اس حرف کے معنی " اور " کے ہین اور نہ کسی لفظ کا جز بنایا جا سکتا ہے - اور نہ اس کی کوئی ضرورت ثابت ہوتی ہے کہ یہ حرف کیون اُلٹ کے لکھا گیا - عربی مین ان علامات کے محل پر یہ کاما یعنی (و) ہمیشہ اُلٹا اور اس طرح (') لکھا جاتا تھا اور یہ بھی مروج تھا کہ جب کسی اور کی یا اور جگہ کی عبارت نقل کی جاتی تو اُسکے دونون طرف دو دو اُلٹے واؤ (انورٹڈ کاما) لکھے جاتے - اور یہی طریقہ یورپ کے اہل علم کے عمل درآمد مین ہے - اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ (و) خواہ وقف کے محل پر استعمال کیا جائے یا عبارت نقل کرنے کے محل پر ، دونون موقعون کے لیے عربی ہی سے لیا گیا ہے -

سمی کولن

جو انگریزی مین یون (؛) لکھا جاتا ہے یہ بھی عربی کے الفاظ " نصف وقف " سے لیا گیا ہے - نقطہ لفظ " نصف " کے نون کا قائم مقام ہے - اور " و " لفظ وقف کا پہلا حرف ہے - اور جن معنون اور جس محل پر عربی مین مستعمل تھا اُسی طرح انگریزی مین بھی نصف وقف کے محل پر استعمال کیا جاتا ہے -

کولن

(:) البتہ ایک ایسی علامت ہے جس کا عربی مین پتہ نہین لگتا - اور یورپ کے موجودہ خط مین نیچے اوپر دو نقطے بنا کے قائم کی گئی ہے لیکن صاف نظر آتا ہے کہ عربی ہی کی علامات دیکھ کے مستنبط کی گئی ہے -